اردو

جلد ۱۱ جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع حصہ ۴۱

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

اردو لغات اور لغت نویسی

از

(ایڈیٹر)

اردو میں سب سے پہلے لغت پر اہل یورپ اور خاص کر انگریزوں نے کتابیں لکھیں - اور یہ خصوصیت کچھ اردو هی کے ساتھ نہیں ، هندوستان کی تقریباً تمام جدید زبانوں کی لغات غیروں هی نے لکھی هیں - البتہ اردو پر ان کی چشم التفات زیادہ رهی هے - اس کی وجہ یہ هے کہ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے ، تجارت کے لئے آئے تھے اور تاجر کو ایسی زبان سیکھنی لازم هے جو عام طور پر ملک میں سمجھی جائے - جب تجارت کے ساتھ ملک گیری کا بھی قدم آیا تو اس کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی اور اسی ضرورت سے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم هوا جہاں جدید اردو نثر نے فروغ پایا اور هندی نثر کا آغاز هوا - تاجروں اور سیاسی مصلحت شناسوں کے علاوہ ایک فرقہ اور بھی هے جو ان دونوں سے کسی طرح کم نہیں یعنی مشنریوں کی ضرورتیں اگرچہ روحانی هیں مگر وہ روح اور مادے پر یکساں چھائے هوئے هیں - تبلیغ کے لئے زبان کا جاننا ناگزیر هے - اس لئے مشنریوں نے همارے دیسی زبانوں کی جو خدمت کی هے (خواہ وہ کسی نیت سے هو) قابل قدر هے - چنانچہ

اردو کی پہلی لغات Lexicon Linguae Indostanicae ایک Capuchin مشنری مسمی Franciscus M. Turonesis فرانسس کس ایم تیورونی سس نے سنہ ۱۷۰۴ ع میں تالیف کی۔ یہ کتاب سنہ ۱۷۷۱ ع تک روم کی پراپیگنڈا لائبریری میں موجود تھی۔

اس کے بعد جے فرگسن (Fergusson) کی هندوستانی زبان کی لغات، انگریزی هندوستانی اور هندوستانی انگریزی سنہ ۱۷۷۳ ع میں شایع هوی۔ پھر اردو کے محسن ڈاکٹر گلکرسٹ کا نام آتا هے جو فورٹ ولیم کالج میں اردو کے استاد اعلی تھے ان کی انگریزی هندوستانی ڈکشنری کلکتہ میں اول اول سنہ ۱۷۸۷ تا ۹۰ میں شائع هوی جسے انهوں نے سنہ ۱۸۰۰ ع میں مکمل کرکے لندن میں طبع کرایا۔ هیرس کی انگریزی هندوستانی ڈکشنری سنہ ۱۷۹۰ ع میں مدراس میں شائع هوی۔ کپتان ٹیلر اور هنٹر کی لغات هندوستانی انگریزی ۱۸۰۵ ع میں طبع هوی اس کے بعد جان شیکسپیر کا نمبر هے ان کی هندوستانی انگریزی لغات سنہ ۱۸۱۷ ع میں لندن میں چھپی۔ ٹامسن کی انگریزی اردو اسکول ڈکشنری ۱۸۲۶ تا ۱۸۴۲ ع اور اس کے بعد ۳۸،۱۸۴۱ ع میں شائع هوی۔ ٹی اور زاریو کی لغات انگریزی، بنگالی، اور هندوستانی کی سنہ ۱۸۲۷ ع میں کلکتہ میں طبع هوی۔ ولیم ییٹس کی هندوستانی انگریزی لغت سنہ ۱۸۴۷ ع میں لندن و کلکتہ میں چھپی۔ فاربس کی هندوستانی انگریزی لغات کا پہلا اڈیشن لندن میں سنہ ۱۸۴۸ ع میں طبع هوا۔ ڈاکٹر فالن کی مشہور هندوستانی انگریزی ڈکشنری سنہ ۱۸۷۹ ع میں اور انگریزی هندوستانی سنہ ۱۸۸۳ ع میں شائع هوی۔ پلیٹ کی اردو هندی اور انگریزی کی ڈکشنری سنہ ۱۸۸۴ ع میں طبع هوئی۔ ایک فرانسیسی برترالله نامی نے بھی سنہ ۱۸۵۸ ع میں

ایک اردو لغات لکھی جو پیرس میں شائع ہوئی تھی - ایک دوسرے فرانسیسی فرانکوا ڈینو کل نے بھی اردو زبان کے نامور مورخ اور محسن گارساں دی تاسی کی زیر ہدایت سنہ ۱۸۷۵ء میں پیرس میں شائع کرنی شروع کی تھی لیکن صرف ۳۲ صفحے ہی چھاپ کر رہ گئے -

ان تمام کتابوں میں اپنے زمانے کے لحاظ سے شکسپیر اور فوربس کی لغاتیں بہت اچھی تھیں - لیکن فالن اور جانس کر پلوٹ کی کتابیں ان سب پر سبقت لے گئیں - فالن نے یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ الفاظ و محاورات کی سند میں گیت اور زبان زد ضرب الامثال اور فقرے اور اشعار بھی دئے ہیں - ان دونوں فاضل لغت نویسوں کی کاوش اور محنت قابل تحسین ہے -

اب ہم لغت کی ان کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں جو اہل ہند نے لکھی ہیں - سب سے قدیم مولانا فضل الدین محمود بن قوام کی کتاب بحر الفضائل فی منافع الافاضل ہے جو آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے - اس کے آخر میں ایک باب ہے جس میں انہوں نے ہندی کے وہ الفاظ دئے ہیں جو ہندی شاعری میں استعمال ہوتے ہیں - لیکن اسے اردو زبان کی لغات سے کچھ تعلق نہیں اسی طرح امیر خسرو کی خالق باری کو بھی لغت کی کتاب کہنا صحیح نہیں - قاضی خاں ملا نذر محمد دہلوی کی ادات الفضلا اور قوام الدین ابراہیم فاروقی کا شرف نامہ جو نویں صدی کی کتابیں ہیں، ان میں صرف اتنا کیا ہے کہ بعض مقامات پر عربی فارسی الفاظ کے معنی بیان کرتے ہوئے ہندی مفردات بھی لکھ دئے ہیں - یہی حال موید الفضلا کا ہے - بہر حال ان میں کوئی بھی ایسی نہیں جسے اردو لغات سے کچھ تعلق ہو - ان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضلا ہندی سے بھی واقف تھے اور ان کے زمانے میں وہ الفاظ رائج تھے جو انہوں نے اپنی کتاب میں

درج کئے ہیں —

انشاءاللہ خاں پہلے ہندی شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان اس کی لغت اور محاورے اور اس کی صرف و نحو وغیرہ پر غور کیا - اس کی دریائے لطافت بے مثل کتاب ہے جو اُن کی لسانی قابلیت، وسعت نظر اور ذوق صحیح پر شاہد ہے - اگرچہ اس کتاب کو لغات کی ذیل میں کسی طرح شریک نہیں کرسکتے لیکن اس میں زبان کی لغات کا بہت کچھ سامان ہے اور اردو کی کوئی لغات اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی یہ کتاب سنہ ۱۲۲۲ ہجری میں تالیف ہوی اور پہلی بار مرشدآباد میں سنہ ۱۲۶۱ ھ (سنہ ۱۸۴۱ ع) میں طبع ہوی —

لیکن پہلی کتاب جسے ہم اردو کی ابتدائی لغات کہہ سکتے ہیں وہ ملا عبدالواسع ہانسوی کی کتاب غرائب اللغات ہے اس کا مقصد انہوں نے خود اپنی تالیف میں بیان کیا ہے —

"اسمائے غیر مشہورہ اشیائے موفورہ و الفاظ غیر مانوسہ معانی بین الاانام مذکورہ را بعبارت واضح واشارت بیان نماید تا فائدہ آں عام و نفع آں تمام باشد"

اس بات کا عذر کیا ہے کہ فرصت کم تھی اور کتب لغات میسر نہ تھیں، شرحوں اور فرہنگوں پر غور کرنے کا موقع نہ ملا، لہذا:

"اسامئی اشیا و معانئی الفاظ را شطرے از نسخۂ معتبرہ و برخے از افواہ و السنۂ ثقات اخذ کردہ درین اوراق معدودہ یکجا نمودہ آمد" —

یہ بات قابل غور ہے اور فاضل مؤلف کے صحیح ذوق پر دلالت کرتی ہے اُنہوں نے صرف وہی لفظ نہیں لکھے جو لغت کی کتابوں میں ملتے ہیں بلکہ اُن الفاظ کو بھی داخل کیا ہے جو زبانوں پر جاری ہیں اور بول چال میں آتے ہیں - چنانچہ کتاب کے مطالعہ سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور

یہی نہیں بلکہ جو لفظ جس طرح بولا جاتا تھا اُسے اُسی طرح لکھا ہے گو وہ اصل کے رو سے غلط ہی کیوں نہو۔ مثلاً وہ " افتاوہ " لکھتے ہیں " آفتابہ " نہیں لکھتے، کیونکہ اُن کے زمانے میں یہ لفظ یونہیں بولا جاتا تھا اور اب بھی بعض مقامات میں بول چال میں یونہیں بولا جاتا ہے —

اُس زمانے میں علم اور تہذیب کی زبان فارسی تھی اس لئے اُس عہد کے مصنفوں کے پیش نظر فارسی رہتی تھی اور اسی کو وہ مقدم سمجھتے تھے۔ یہ اگرچہ اُردو کی لغات ہے لیکن فاضل مولف کے پیش نظر فارسی ہے۔ ان کا مقصد اس لغات کے لکھنے سے یہ تھا کہ وہ غیر مانوس یا بول چال کے اردو الفاظ جو فارسی ادب یا شعرا کے کلام میں عموماً نہیں ملتے ان کے معانی اور تشریح لکھ کر ان کے مقابلے میں فارسی الفاظ درج کردئے جائیں تاکہ طلبہ اور شایقین کو ان الفاظ کی تلاش میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ وہ اپنا مقصد اس طرح ادا کرتے ہیں —

> " ازیں جا کہ مقصود از تسوید این اوراق بہم رساندن
> الفاظ برائے معانی نہ فہمیدن معنی الفاظ، برخلاف
> عامۂ کتب لغات رعایت ترتیب در معانی کردہ شد
> تا پیدا کردن لفظ برائے معنی در ہر کس آسان باشد "

اگرچہ اپنے زمانے کے لحاظ سے فاضل مولف کا مقصد کچھ ہی ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان کی تصنیف غرائب اللغات اردو کی پہلی لغات ہے۔ ملا موصوف کی متعدد تالیفات ایک زمانے سے داخل نصاب ہیں اور بوجہ شہرت و فضیلت ان کا شمار ان علما میں ہے جن کا نام زبان زد خاص و عام ہے اور خصوصاً طلبہ اور اساتذہ کی جماعت میں احترام سے لیا جاتا ہے، لیکن ان کی اس تصنیف کا ذکر بھولے سے بھی

نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں پر فارسی شعر و سخن و ادب چھایا ہوا تھا، اور علمی حلقوں میں عربی علوم کا چرچا تھا، اس لئے یہ تصنیف ان کے علم فضل کے مقابلے میں طفلانہ سمجھی گئی اور اہل علم نے اس کی طرف اعتنا نہ کیا لیکن اب اردو جو عربی فارسی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، ابھرتی آتی ہے اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک نئی شان پیدا کر رہی ہے یہ کتاب قدر و منزلت کے ساتھ دیکھی جائے گی اور علامہ ہانسوی کے اس کام کی داد دی جائے گی۔

اردو لغات کی دوسری کتاب ہندوستان کے مشہور فارسی ادیب سراج الدین علی خان آرزو کی ہے۔ اس کا نام نوادر الالفاظ ہے۔ خان آرزو کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی مشہور ہے۔ ان کی نظر تنقید سے بڑے بڑے اہل زبان بھی نہیں بچے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی غرائب اللغات کی تصحیح اور تتمہ ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:—

"چوں اکثر در بیان معانیے الفاظ تسہلے و سقمے بنظر آمد لہذا نسخۂ دریں باب بقلم آوردہ جائے کہ سہو و خطائے معلوم کرد اشارت بداں نمودہ و ہر انچہ بہ طبع ناقص ایں دہال درست در آمد بران افزود"

خان آرزو نے صرف غرائب اللغات کی تصحیح ہی نہیں کی بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کتاب غرائب اللغات سے حجم میں بھی زیادہ ہے۔ غرائب اللغات میں لفظ کے معنے اختصار کے ساتھ دئے ہیں مگر خان آرزو نے معانی کے ساتھ اکثر الفاظ کی تحقیق بھی کی اور جگہ جگہ فارسی اور ہندی الفاظ کے اشتراک و توافق کی طرف بھی اشارہ

کیا ہے، غرائب اللغات کے الفاظ کی تصحیح میں کاوش کی ہے اور داد تحقیق دی ہے۔ اگرچہ نوادرالالفاظ باعتبار صحت و تحقیق غرائب اللغات سے کہیں بڑھی ہوئی ہے لیکن تقدم کی فضیلت ملا عبدالواسع ہی کو حاصل ہے۔ خان آرزو علاوہ فارسی کے اردو کے بھی شاعر تھے اور ان کی یہ تصنیف جو اب تک گمنامی میں پڑی ہوئی ہے، علم لغات میں بڑا پایہ رکھتی ہے —

مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے بہت بڑے استاد تھے ان کی ساری عمر فارسی کی تحصیل و تعلیم اور تالیف میں گذری۔ یہ مرزا غالب، ذوق اور مومن کے ہم عصر تھے۔ زمانے کا رنگ بدل چلا تھا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ مولانا نے اردو کی صرف و نحو پر ایک مبسوط کتاب لکھی، اس زمانے کے دستور کے موافق فارسی زبان میں نہیں بلکہ اردو میں۔ اس کے آخری باب میں مولانا نے اردو کے محاورات درج کئے ہیں۔ یہ اگرچہ لغات کی حیثیت نہیں رکھتے مگر اردو لغات کے ممد ضرور ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۴۹ ء میں طبع ہوئی —

گزشتہ پچاس سال میں اردو کی متعدد لغات لکھی گئی ہیں۔ سید ضامن علی جلال مرحوم لکھنؤ کے مشہور شاعر نے گلشن فیض نام سے ایک لغات لکھی۔ مختصر کتاب ہے کوئی خاص خصوصیت نہیں۔ الفاظ کی تشریح فارسی میں کی ہے۔ (۱۲۹۷ ھ) سنہ ۱۸۸۰ ء میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد سرمایۂ زبان اردو کے نام سے ایک دوسری لغات لکھی۔ اس میں الفاظ کے معانی اردو میں ہیں۔ یہ زمانے کا اثر ہے —

مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ تخلص عاشق لکھنؤی نے ایک لغات بہار ہند کے نام سے تالیف کی۔ صرف 'الف' کی ردیف چھپی ہے۔ اس میں

عام محاورات کے معانی سلیقے اور خوبی سے دئے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوا سند بھی لکھی ہے - افسوس ہے کہ باقی حصے طبع نہیں ہوے -

میر اوسط رشک لکھنوی نے جو مشہور شاعر گذرے ہیں نفس اللغه کے نام سے أردو لغات لکھی ہے - یہ صرف الفاظ کا مجموعه ہے معانی فارسی میں لکھے ہیں - صرف ایک جلد طبع ہوئی - دوسری جلد کا مسودہ موجود ہے طبع نه ہو سکی -

ان لغاتوں میں تحقیق سے کچھه سرو کار نہیں رکھا گیا ہے - تحقیق سے صرف یہ مراد لی جاتی تھی اور اب تک بھی یہی حال ہے کہ فارسی عربی لفظ جو أردو میں مستعمل ہیں أن کے متعلق یہ بتادینا کہ اصل زبان میں اس لفظ کی کیا صورت ہے اور اس کا صحیح تلفظ کیا ہے - یہاں اس قدر بڑھی کہ أردو میں جن لفظوں نے داخل ہو کر اپنی ہئیت بدل لی ہے یا أن کے تلفظ میں فرق آگیا ہے انہیں غلط قرار دیا اور اصلی تلفظ کو رواج دینے کی کوشش کی - مثلاً رِھا کہنا غلط ہے رَھا صحیح ہے - یا الایچی کہنا صحیح نہیں الاچی کہنا چاہئے - بِشارت صحیح بشارت غلط - صحیح لفظ بَہتات ہے بُہتات کہنا جہالت ہے - دیوانه پن صحیح نہیں کیوں کہ پن ہندی لفظ فارسی کے ساتھه ترکیب نہیں پا سکتا - تابعداری غلط ہے اس لئے کہ تابع خود اسم فاعل ہے لیکن یہ نہیں دیکھا کہ أردو میں ان دونوں کے معنوں میں فرق ہے - جو لوگ اس قسم کی ہندی کی چندی نکالتے ہیں وہ یا تو زبانوں کے أتار چڑھاو سے واقف نہیں یا أردو کو زبان ہی نہیں سمجھتے یا وہ اپنی عربی فارسی دانی جتانا چاہتے ہیں -

اُردو لغت پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ھیں ان سب میں جامع اور مکمل اور سب سے کار آمد مولوی سید احمد مرحوم دھلوی کی فرھنگ آصفیہ ھے۔ اس کا کچھہ حصہ پہلے ارمغان دھلی کے نام سے اجزا میں شایع ھوا، اس کے بعد ھندوستانی اُردو لغت کے نام سے پہلی جلد سنہ ۱۸۸۷ع میں شایع ھوئی بعد ازاں نظام گورنمنٹ کی سرپرستی اور ھنر پروری کی بدولت فرھنگ آصفیہ سے موسوم ھوئی اور چار ضخیم جلدوں میں شایع ھوی۔ اگرچہ قابل مولف کے سامنے ڈاکٹر فیلن کی لغات کا نمونہ موجود تھا اور وہ خود بھی اس کی ترتیب میں شریک تھے لیکن تاھم اُن کی لغات بالکل الگ چیز ھے۔ ایک تنہا شخص جس قدر محنت، کاوش اور تحقیق کر سکتا ھے وہ انھوں نے کی اور ایسا بڑا کام کیا کہ اُردو زبان ھمیشہ اس کی زیر بار منت رھے گی۔ گو اس کی تحقیق میں غلطیاں بھی ھیں؛ بہت سے لفظ اور محاورات بھی چھوٹ گئے ھیں؛ زمانۂ حال کے رو سے بہت کچھہ اضافے کی ضرورت ھے؛ بعض جگہ بیجا طول نویسی سے کام لیا ھے؛ تاھم یہ کتاب ایسی ھے کہ مولف کی داد نہ دینا ظلم ھوگا۔ اب بھی وقت پڑے پر یہی کام آتی ھے۔ اس کتاب کے دیکھتے وقت کبھی تو بے تحاشا ھنسی آتی ھے اور کبھی غصہ آتا ھے۔ مولف نے فحش الفاظ کے جمع کرنے میں خاص اھتمام کیا ھے اور کوئی فحش لفظ یا محاورہ ایسا نہیں جو ان کی نظر سے بچا ھو۔ یہ ڈکٹر فیلن کا فیض اثر معلوم ھوتا ھے، ڈاکٹر موصوف نے اس میں بڑی کد و کاوش کی ھے اور دیباچے میں اپنے اس فعل کی حمایت میں بہت کچھہ فصاحت و منطق سے کام لیا ھے۔ مولف فرھنگ آصفیہ بھی اُن کے قدم بقدم چلے ھیں۔ علاوہ اس کے اس میں بعض بڑی عجیب عجیب چیزیں ملتی ھیں۔ مثلاً لفظ کشمیری کے

معنوں کے ضمن میں لکھتے ھیں "باشندۂ کشمیر جیسے کشمیری بے پیری جس میں الفت نہ شیرینی"۔ آگے چل کے فرماتے ھیں "یہ لوگ مکر، دغا فریب اور بے وفائی وغیرہ اکثر اوصاف میں مشہور ھیں۔ چنانچہ مولف کو بھی سنہ ۱۲ ء میں ایک کشمیری بدذات نے دو ہزار کا نقصان پہنچایا جس سے فرہنگ آصفیہ کی اشاعت میں بہت دیر ہوئی اور جلد سوم کی صحت میں ابتری ہوئی ..." یا مثلاً جہاں مجروح کا لفظ آیا ہے وہاں اس لفظ کے معنی لکھنے کے بعد میر مہدی حسین مجروح دہلی کے مشہور شاعر کا حال درج کردیا ہے اور ان کی انتیس اشعار کی ایک غزل نقل کردی ہے۔ یا مجذوب کا لفظ آیا تو مجذوبوں کے حالات میں سات آٹھ کالم سیاہ کردئے ھیں۔ لفظ درب کے بعد ایک لفظ 'درب سرائے' کا اضافہ کیا ہے اور اس کے سامنے اسم مونث لکھ کر تحریر فرماتے ھیں کہ "چونکہ یہ مقام مولف لغت کی ننھیال ہے اس وجہ سے اس کا مختصر حال لکھنا اپنے اوپر واجب بلکہ فرض سمجھتا ہوں"۔ اب اس کے حالات لکھنے اور روایات لکھنے شروع کئے تو باریک خط میں پورا سوا کالم لکھ ڈالا۔ 'اولیا' کا جو لفظ آیا تو اولیائے ہند کے تحت میں پورے تیس کالم لکھ ڈالے ھیں۔ بہت محنت کی ہے لیکن اسے لغات سے کیا تعلق۔ غرض اس قسم کی بے ربطیاں اور لغزشیں بہت سی پائی جاتی ھیں مگر باوجود اس کے مولف کی محنت بہت قابل تعریف ہے۔ اس نے بہت سے لفظ جو بول چال میں استعمال ہوتے تھے یا خاص خاص محاورے تھے یا ہندی کے لفظ جو اب تک اردو لغت نویسوں نے نہیں لکھے تھے درج کردئے ھیں —

اس کے بعد امیر اللغات لکھی گئی۔ اس کے مولف منشی امیر احمد صاحب مینائی مشہور شاعر اور صاحب علم تھے۔ اس لغات کا صرف پہلا جزو شایع ہوسکا

جو دو جلدوں میں سمایا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کی پہلی جلد اس سے قبل شایع ہو چکی تھی۔ مفتی صاحب لغت نویسی کے اصول سے واقف نہیں اس لئے بہت سی ایسی چیزیں داخل کرلی ہیں جن کا لغات سے کوئی تعلق نہیں۔ محاورے اور روز مرہ میں فرق نہیں کرتے اور اس لئے روز مرہ کے بہت سے فقرے بھی محاورے کے تحت میں لکھے جاتے ہیں۔ یہ نسبت ہندی الفاظ کے فارسی الفاظ کے اضافے کی بہت کوشش کی ہے۔ تحقیق کے اعتبار سے بھی کتاب بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں مثلاً آلو بخارا کے معنی میں لکھتے ہیں ".. آلو جو بخارا میں پیدا ہوتاہے" شہودہ ساگر میں بھی بعینہ یہی معنے لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ امیراللغات سے نقل کرلئے ہیں —

اس کے بعد چند چھوٹی سوٹی کتابیں الفاظ و محاورات کی لغات پر نکلیں مگر وہ زیادہ قابل التفات نہیں مثلاً چرنجی لال کی ہندوستانی مخزن المحاورات (دہلی سنہ ۱۹۰۰ ع) یا ساجدان بخش کی محاورات ہند یا سید اشرف علی کی مصطلحات اُردو (لکھنو ۱۸۹۰)

میرا مقصد اس بیان سے ان بزرگوں کے کام کی تنقیص کرنی نہیں بلکہ میں اُن کی محنت اور سعی کا دل سے معترف ہوں - انہوں نے اپنی زبان کی ترقی اور اصلاح کے لیے جو کام کیا ہے وہ ہر طرح قابل تعریف ہے اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے ایک بیش بہا سامان ہے - آئندہ جو کوئی اس شاہراہ پر گام زن ہوگا وہ اُن کے کارناموں سے فیض یاب ہوگا اور ان کا احسان مانے گا - انہوں نے اپنے خیال اور مروجہ روش کے مطابق جو کچھ کیا ہے سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے - لیکن زندہ زبان ایک حالت پر قائم نہیں رہتی - اس میں کمی، اضافہ، تغیر و تبدل سب کچھ ہوتا رہتا ہے - علاوہ اس کے گزشتہ پچاس سال میں علم اللسان نے بہت کچھ ترقی کی ہے -

اس لئے یہ ضرور ہے کہ ہم پچھلی کتابوں کی کمی پوری کریں اور جدید تحقیقات اور اصولوں سے فائدہ اٹھائیں

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری موجودہ لغاتوں میں کیا کمی ہے اور جدید لغات ہمیں کس نہج پر لکھنی چاہئیے - لغات میں سب سے ضروری چیز لفظ کے اصل کی تحقیق ہے یعنی یہ لفظ کس زبان کا ہے - اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے' اصل زبان میں اس کے کیا معنے تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوے تو وہ کیا تھے - لفظ کی تاریخی حالت معلوم کرنے کے لئے اصل یعنی اشتقاق کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے - علاوہ اس کے یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مماثل اور ہم دلالت الفاظ کے صحیح تعلقات اور ہم شکل مگر مختلف الاصل الفاظ کی تحقیق اور امتیاز ہوسکتا ہے —

ہماری لغاتوں میں اس کا اہتمام بہت ہی ناقص اور نا مکمل ہے - زبانوں کے باہمی رشتے اور تعلقات میں اب بہت کچھ نئی نئی باتیں دریافت ہوئی ہیں' ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اس حصے کو مکمل کرنا چاہئے —

ہماری کتابوں میں عموماً لفظ (اسما) کی تعریف نہیں دی جاتی بلکہ اکثر ہر لفظ کے سامنے اس کے مترادف لکھ دیے جاتے ہیں - یہ صحیح طریقہ نہیں - جو شخص مترادف کو نہیں سمجھتا وہ اس لفظ کے مفہوم کو بھی نہیں سمجھے گا - دوسرے مترادف سے لفظ کا صحیح مفہوم ادا نہیں ہوسکتا - اس کی تشریح اور توضیح ضروری ہے -

ہمارے لغات نویس اور ادیب اس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ لغات میں جو لفظ ہو مستند اور فصیح ہو اور کوئی لفظ ٹکسال باہر نہ ہو - اس کے یہ معنے ہوے کہ لغات نویس الفاظ کا جامع اور مورخ ہی

نہیں بلکہ نقاد بھی ہے - لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں - دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ صرف اپنے زمانے کے وہی الفاظ درج کرے جو ادبی لحاظ سے مسلم ہوں اور ان کے معانی اور استعمال بتائے اور جہاں تک ممکن ہو لغات کو اپنے زمانے کے ادبی ذوق کے مطابق بنائے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ حق نہیں ہے کہ لفظوں کا انتخاب کرے اور نہ اسے اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ فلاں لفظ اچھا ہے اور فلاں برا - اس کا کام اچھے برے سب لفظوں کا لینا ہے خواہ اس کی رائے میں ذوق کے خلاف ہوں یا موافق - لغات میں سب لفظ ہونے چاہئیں خواہ وہ رائج ہوں یا متروک اور ان کے تمام معانی اور استعمال درج کرنے ضروری ہیں -

اب الفاظ کی کئی قسمیں ہیں - ایک تو عام لفظ ہیں جس میں ادبی اور بول چال کے لفظ آجاتے ہیں - پھر عامیانہ اور سوقیانہ لفظ ہیں - ان کے علاوہ عورتوں کے الفاظ اور محاورے ہیں - ان کے ماسوا پیشہ وروں اور علوم و فنون کے الفاظ اور اصطلاحات ہیں - بعض اوقات ان کی تقسیم میں مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ فلاں لفظ کو کس قسم کے تحت میں رکھا جائے کیوں کہ بعض قسمیں ایسی ملتی جلتی ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا آسان نہیں ہوتا - بہت سے لفظ ایسے ہیں جو ایک زمانے میں عورتوں سے مخصوص تھے اور اب ادب میں داخل ہو گئے ہیں اور یہی عامیانہ اور پیشہ وروں کے الفاظ اور محاوروں کا حال ہے - ہماری زبان میں بہت سے لفظ ایسے پائے جاتے ہیں جو ایک وقت میں صرف بعض پیشوں سے مختص تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ عام الفاظ میں شریک ہو کر ادب کی زینت کا باعث ہوئے - ایسے الفاظ، خواہ وہ عورتوں کے تھے یا پیشہ وروں

کے ' اداے مطلب میں خاص حسن پیدا کر دیتے ھیں - ان کے سوا اجنبی زبانوں کے الفاظ ھیں جو اردو زبان میں داخل ھو چکے ھیں یا اب داخل ھو رھے ھیں ' ان کا شمار بھی عام الفاظ میں ھونا چاھئے - پھر اعلام ھیں جن کا اگرچہ ایک عام لغات سے کوئی خاص تعلق نہیں لیکن ادب میں ان سے جگہہ جگہہ سے بحث ھوتی ھے لہذا لغت نویس کو ان کا بھی خیال رکھنا پڑتا ھے - لیکن اسے اس کا فیصلہ کرنا بھی ضروری ھو گا کہ کون سے لئے جائیں اور کون سے ترک کئے جائیں - بعض اعلام ایسے ھیں کہ وہ ادب میں ایسے گھل مل گئے ھیں کہ ان کا جدا کرنا ممکن نہیں یہاں تک کہ ان سے دوسرے اجزاے کلام مثلاً صفات وغیرہ بن گئے جیسے دقیانوسی ' عباسی ' افلاطون وغیرہ - ان کا لکھنا لازم ھے - ان کے علاوہ بہت سے ایسے ھیں جن کا جاننا ادیب کو ضروری ھے - ان کو لغات میں داخل کرنا ھوگا لیکن ان کے متعلق صرف ایسے ھی معلومات درج کئے جائیں جو بہت ضروری ھیں ' مستقل مضامین نہ ھوں —

متروک الفاظ کا معاملہ اور بھی ٹیڑھا ھے - زندہ زبان ھمیشہ گھٹتی بڑھتی رھتی ھے آج جو زبان بولی جاتی ھے سو برس پہلے ایسی نہ تھی - اس کے اجزاے ترکیبی میں مسلسل مگر آھستہ آھستہ تحلیل و تجدید کا سلسلہ جاری رھتا ھے - پرانے لفظ متروک ھوتے جاتے اور مرتے جاتے ھیں ' نئے لفظ گھستے چلے آتے ھیں - لفظ کو موت اچانک نہیں آتی ؛ یہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتا ھے اور کوئی شخص کسی لفظ کے موت کی صحیح تاریخ اور وقت نہیں بتا سکتا - ھمارے لفظ یعنے جو ھم بولتے ھیں کبھی متروک نہیں ھوتے - یہ ھمارے بزرگوں کے لفظ ھیں جو نشانۂ اجل ھوتے ھیں ھم ایک لفظ کا استعمال ترک کردیتے ھیں لیکن وہ مر نہیں جاتا - اس کی

یاد باقی رہتی ہے اور اس کے استعمال کا امکان بھی باقی رہتا ہے۔ مردہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کا کوئی بولنے والا نہیں رہتا۔ اس لئے لغت نویس کو یہاں مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ اسے بہت سے ایسے لفظ ملیں گے جو مشتبہ ہیں اور جن کی نسبت یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ آیا وہ اب بھی زبان کا جز ہیں یا نہیں - بعض کے نزدیک وہ زندہ ہیں اور بعض کے نزدیک مردہ ۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے ہیں کہ لغت میں داخل ہونے کے مدعی ہیں، گو وہ بعض کی زبان یا قلم پر جاری ہیں، تاہم وہ صحیح نہیں سمجھے جاتے اور بعض ثقہ حضرات تو انہیں سرے سے اردو کے لفظ ہی نہیں سمجھتے —

اب اگر ہم الفاظ کو متروک اور رائج میں تقسم کرتے ہیں تو ہمیں وہ تمام الفاظ لینے چاہئیں جو زبان کی پیدایش سے اب تک ہر زمانے میں رائج رہے ہیں۔ تو ایسی حالت میں ہمارا کام صریحاً ناقص اور پریشان ہو جائے گا۔ دنیا کی کسی زبان کی کوئی لغات ایسی نہیں کہ جس میں زبان کے پیدا ہونے کے وقت سے دم تحریر تک کے تمام لفظ ہوں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اول تو ہماری قدیم زبان جس میں گجراتی یا گجری اور دکنی بھی شامل ہے، ہمیں صرف کتابوں کے قلمی نسخوں میں ملتی ہے۔ یہ قلمی نسخے جس حالت میں ہیں وہ معلوم ہے اور کاتبوں کی عنایت سے وہ جیسے کچھ مسخ ہوے ہیں وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ پھر اس زبان سے اور اس زبان کے الفاظ کے صحیح تلفظ سے کامل واقفیت مفقود۔ پھر کثرت سے ایسے لفظ ہیں جن کی اشکال صرفی نحوی یا صرفی اختلات کی وجہ سے ہے اور اس لئے ان کا داخل کرنا بے سود۔ * لہذا ان مجبوریوں سے لغات

---

* قدیم اردو اور دکنی زبان کی لغات الگ تیار کی جا رہی ہے جو تقریباً مکمل ہوچکی ہے۔

کو مکمل اور جامع بنانے کے لئے یہ ضرور ہوگا کہ کسی خاص زمانے سے اس کی ابتدا قرار دی جائے اور اس وقت سے لے کر اب تک کے تمام لفظ داخل کئے جائیں - اس کے یہ معنے نہیں کہ لفظ کی تحقیق کی ضرورت ہو تو اس کے ما قبل زمانے میں اس کا سراغ نہ لگایا جائے —

اب رہے علوم و فنون' سو ان کے الفاظ اسی حد تک داخل کرنے چاہئیں جن کی عام ادب میں ضرورت پڑتی ہے یا جو اردو میں استعمال ہوسکتے ہیں یا وہ جدید علمی الفاظ جو اب اردو میں داخل ہو گئے ہیں - ایسے الفاظ کا داخل کرنا مناسب نہ ہوگا جو تشریح کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئیں اور جنہیں صرف اس علم کے ماہر ہی سمجھ سکیں - کیونکہ عام زبان کی لغات کسی خاص علم یا فن کی لغات نہیں ہے —

ہماری اردو لغاتوں میں علوم و فنون تو ایک طرف عام پیشوں اور صنعت و دستکاری تک کے لفظ نہیں ملتے' غالباً یہ ٹکسال باہر سمجھے جاتے ہیں - دوسرے شعرا جو ہماری زبان کے ٹکسالی اور ادب کی سند خیال کئے جاتے ہیں' ان کے دیوانوں میں ان کا گذر نہیں' تو پھر ہمارے لغات میں کہاں سے آئیں - حالانکہ ہماری زبان میں ان کا بہت اچھا ذخیرہ ہے اور بڑے اچھے اچھے اور معقول لفظ اور اصطلاحیں موجود ہیں' مگر افسوس کہ یہ لفظ روز بروز مٹتے جاتے ہیں - ایک تو ملوں کے رواج نے پیشہ وروں اور صناعوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں' ملکی صنعتیں مٹتی جاتی ہیں اور صناع اپنے شریف پیشے چھوڑ چھوڑ کر گھٹیا مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں - دوسرے جو لوگ کاریگروں اور مزدوروں سے کام لینے والے ہیں ان کی تعلیم انگریزی زبان میں ہوئی ہے' ہندستان میں ہوئی ہو یا انگلستان میں وہ اپنے ہاں کے لفظ تو جانتے نہیں اس لئے "اپنے" لفظ (جو کتابوں

میں پڑھے ہیں) بولتے اور لکھتے ہیں اور کاریگر اور مزدور بھی "صاحب" کے سمجھانے یا اس کی تقلید میں اور اکثر از راہ فخر انگریزی لفظ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح دیسی لفظ پسپا ہوتے جاتے اور انگریزی دخیل ہوتے جاتے ہیں۔ ان از یاد رفتہ لفظوں میں جو کسی مہرس کے عالم میں ہیں ایسی اچھی اچھی اصطلاحیں اور محاورے موجود ہیں کہ غیر زبان کے اُن لفظوں سے جو ان کی جگہ لے رہے ہیں بدرجہا بہتر، سلیس اور شیریں ہیں اور اگر ان کا رواج قائم رکھا جائے تو یقین ہے کہ اپنے دوسرے بھائی بندوں کی طرح ادب اردو کی رونق بڑھائیں گے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی نے تمدن عرب کے بے مثل ترجمے میں Horse-shoe arch کا ترجمہ نعل اسپ محراب کیا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ ہے۔ دہلی کے پرانے استاد معمار سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اسے 'کُھرڈال' کہتے ہیں۔ بات وہی ہے مگر دیکھئے کتنا فرق ہے۔ میں نے پیشہ وروں اور صناعوں کے اصطلاحات کی لغات تیار کرائی ہے جس میں ایک سو سے زیادہ پیشوں کے الفاظ درج کئے گئے ہیں جو عنقریب چھپنے کو دیدی جائے گی—

ایک پیشہ وروں اور صناعوں کے الفاظ اور اصطلاحیں نہیں بلکہ ایسی موٹی موٹی چیزیں جیسے ہندوستان کی بولیوں، معروف پھولوں، درختوں اور اقوام اور قبیلوں کے نام تک ہماری اردو لغاتوں میں نہیں ملتے۔ جدید اردو لغت نویس کا فرض ہے کہ وہ ان تمام کمیوں کو پورا کرے—

ایک بحث آکسفورڈ ڈکشنری والوں نے یہ پیش کی ہے کہ ڈکشنری انسائیکلوپیڈیا نہیں ہونی چاہئے۔ انسائیکلوپیڈیا میں اشیا کا بیان ہوتا ہے، ڈکشنری الفاظ کی تشریح کرتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا میں اشیا کا نام

اور ان کا بیان ہوتا ہے لیکن اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ الفاظ کس زبان کے ہیں، ان کی اصل کیا ہے اور اس کے مختلف استعمال کیا ہیں۔ ڈکشنری میں لفظ کی اصل، اس کے مفہوم، مختلف استعمال اور اس کے تمام اجزا سے بحث ہوتی ہے۔ مثلاً انسائیکلوپیڈیا کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ یہ بتائے کہ وہ ایسے الفاظ جیسے فوج، کیاک، الہتہ، میں وغیرہ کا ذکر کرے یا اس کی تاریخ و تشریح بیان کرے۔ اسی طرح لغات میں جلد سازی کی معلومات یا ہوائی جہاز کی ساخت و تاریخ وغیرہ کا ذکر بے محل ہوگا۔ آکسفورڈ ڈکشنری انگریزوں کی محنت، تقسیم کار اور ہمت کا عجیب کار نامہ ہے، اس کے مرتب کرنے والوں نے اس اصول کی نہایت سختی سے پابندی کی ہے یہاں تک کہ اتنی ضخیم ڈکشنری میں ایک علم بھی نہیں آیا ہے، انھوں نے تمام اعلام کو خواہ تاریخی ہوں خواہ جغرافی بالکل نظرانداز کردیا ہے ہاں اگر کسی علم سے کوئی صفت یا کوئی اور جزو کلام بن گیا ہے تو صرف اسے لکھ دیا ہے۔ ان لوگوں نے اس اصول کو انتہا تک پہنچا دیا ہے، ان کے خیال میں ایسی لغات جس میں ان دونوں امور کا خیال رکھا گیا ہے ایک دو غلی یا مخلوط قسم کی کتاب ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ بعض باتیں ایسی پیش آجاتی ہیں کہ اس اصول کی پابندی لغات کے حق میں مضر ہوتی ہے۔ ڈکشنری اور لغات میں حدود کا قائم کرنا بہت دشوار ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تشریح کامل طور پر اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ان اشیا کا جن کا وہ مفہوم ادا کرتے ہیں، کچھ نہ کچھ ذکر نہ کیا جائے۔ علاوہ اس کے اشیا کا بیان اسما کی تعریف میں مضمر ہوتا ہے۔ اس لئے ڈکشنری کے صحیح طور پر مرتب کرنے کے لئے ان دونوں طریقوں کا امتزاج ضروری ہے خاص کر اردو لغات میں اس کا التزام لازم ہے۔

کیونکہ ہماری زبان میں نہ تو انسائیکلوپیڈیا ہیں نہ خاص قسم کی لغات۔ اگر اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دیا جائے تو ڈکشنری ڈکشنری ہی رہے گی، انسائیکلوپیڈیا نہیں ہوسکتی۔ البتہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ اشیا کے بیان میں صرف وہیں تک کام لیا جائے جہاں تک اس سے لفظ کے استعمال اور مفہوم کے متعین کرنے میں مدد ملے اور معروف اور ادبی اعلام کا، تاریخی ہوں یا جغرافی، وہیں تک ذکر کیا جائے جو عام معلومات کی حد تک ہوں، ان کے کارناموں اور ان کی سیرت وغیرہ کے بیان کرنے میں کوشش نہ کی جائے اور یہی صورت دوسرے الفاظ کے متعلق بھی ہونی چاہئے —

اردو لغات میں جدید الفاظ کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ ایک ایسی ادبی زبان میں جیسی کہ اردو ہے، جس میں روایات ایک گونہ مستقل اور مسلم ہیں اور جس میں ہر موقع پر نظیر اور سند کا سوال پیش ہوتا ہے اور ہر لفظ اور محاورے کے لئے سند میں کسی مستند شاعر کا شعر طلب کیا جاتا ہے، جہاں ایسے استفسارات معمولی باتیں ہیں کہ تم نے یہ لفظ کہاں دیکھا؟ کیا تم کسی مسلم الثبوت استاد کی سند پیش کرسکتے ہو؟ کیا کسی لغت میں ہے؟ وہاں کسی نئے لفظ کا بنانا محال ہے وہاں ہر نئے لفظ کو پیدا ہوتے ہی فنا کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہ خود اپنی ہستی سے کھسیانا اور شرمندہ معلوم ہوتا ہے اور قوسین یا واوین یا نیچے اوپر کے خط یا جلی خط جو اس کے نئے ہونے کی علامات ہیں خود اس کے وجود کی معذرت کرتی ہیں۔ لیکن ایک بڑھتی ہوئی زبان میں نئے خیالات کے لئے نئے الفاظ کا بنانا ناگزیر ہے۔ حال کے زمانے میں بہت سے نئے

[redacted]

الفاظ بنے اور بنتے جاتے ہیں اور آئندہ بنیں گے - وقتی ضرورت کے لئے فطری اصول پر یا نقالی کے طور پر یا پہلے سے موجود الفاظ یا اجزائے الفاظ کے تتبع میں نئے لفظ پیدا ہو جاتے ہیں - ان میں سے بعض دیر سویر گفتگو میں اور گفتگو سے اخبارات میں آپہنچتے ہیں اور اخبارات سے انشا اور ادب میں داخل ہوجاتے ہیں اُردو کا لغات نویس ان الفاظ کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور جو لفظ عام طور پر استعمال میں آگئے ہیں اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اُس مفہوم کے لئے جو وہ ادا کرتے ہیں دوسرے لفظ نہیں ہیں، ان کا لغات میں داخل کرنا لازم ہے —

ایک اور ضروری چیز جو لغات نویس کو پیش نظر رکھنی چاہئے یہ ہے کہ ہر لفظ اور محاورے کے لئے سند پیش کرے - محض لغات نویس کی تعریف و تشریح کافی نہیں اور نہ وہ مستند ہو سکتی ہے - اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ لغات نویس لفظ کی تعریف اور مفہوم کے سمجھانے میں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، لفظ کا صحیح مفہوم مثال اور استعمال ہی سے معلوم ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ لفظ کے مختلف استعمالوں میں نازک فرق ہوں، لیکن سند مستند مصنف کی ہونی چاہئے - اکثر لغات نویس لفظ کے خاص مفہوم کو پیش نظر رکھ کر بلا امتیاز اسناد پیش کردیتے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی جملہ یا شعر ایسا دستیاب ہو جس سے کسی لفظ کے تاریخی یا خاص مفہوم کا سراغ لگتا ہے تو بغیر اس خیال کے کہ وہ کسی مسلم الثبوت اُستاد کا کلام ہے یا نہیں، سند میں پیش کردینا چاہئے، ورنہ ہر صورت میں جہاں تک ممکن ہو سند میں مستند مصنف یا اُستاد ہی کا کلام پیش کرنا چاہئے - اسناد کے درج کرنے میں حتی الامکان اختصار سے کام لینا چاہئے، بلا وجہ بہت سی مثالیں نہ لکھی جائیں ورنہ کتاب کی ضخامت بہت بڑھ جائے گی - سند ایسی ہونی چاہئے

جس سے لفظ کا مفہوم اور استعمال صحیح صحیح اور واضح طور پر معلوم ہو جائے کوئی مثال ایسی نہ لکھی جائے جو مشتبہ ہو یعنی اس سے مفہوم یا استعمال قطعی طور پر معلوم نہ ہوتا ہو —

ایک اور امر جس کی طرف ہمارے لغات نویسوں نے توجہ نہیں کی وہ صلات ہیں - یعنی کس لفظ کے ساتھ کونسا صلہ آتا ہے - جن لوگوں کی مادری زبان اُردو نہیں انھیں اس میں بڑی دشواری ہوتی ہے اور بعض اوقات خود اہل زبان کو بعض الفاظ کے صلوں میں شبہ ہو جاتا ہے - اُردو لغات میں تمام ضروری صلوں کا بھی درج کرنا ضروری ہے - مثلاً اس سے کہا یا اس کو کہا' اس سے متعلق یا اس کے متعلق' اس میں کون فصیح ہے یا دونوں فصیح ہیں - کسی چیز کا انکار کرنا' کسی چیز سے انکار کرنا میں کیا فرق ہے - وہ اس سے خفا ہے' وہ اس پر خفا ہوا - غرض جہاں جہاں ضرورت ہو الفاظ کے صلات کا بتانا ضروری ہے - بعض اوقات مختلف صلوں کے آنے سے معانی میں بھی فرق آجاتا ہے' اُسے بھی ظاہر کردیا جائے —

اُردو میں اب تک جو لغت کی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں اکثر یہ ہوا ہے کہ ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے نقل کرلی ہے اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کردیا ہے - یہی وجہ ہے کہ مثنوی میر حسن اور باغ و بہار (قصۂ چہار درویش) جیسی مقبول و معروف کتابوں کے بھی پورے لفظ کسی لغات میں نہیں ملتے - جدید لغت کے لئے تلاش اور جستجو کی بے حد ضرورت ہے - مثلاً ہمیں وہ تمام مسالا جمع کرنا چاہئے جس پر الفاظ اور ان کی تعریف اور تاریخ اور اُن کے مختلف استعمال اور اُن کے نازک فروق کی بنیاد ہے اور یہ سامان زبان کے تحریری ادب کے مطالعہ سے حاصل ہوسکتا ہے - اس غرض کے لئے ہمیں سارے اُردو ادب کو چھاننا

اور کھنگالنا پڑے گا۔ ورنہ محض دوسری لغاتوں سے الفاظ جمع کر کے نئی لغات ترتیب دیدینا کچھ زیادہ مفید نہیں۔ جدید لغات کے مقاصد اور وسعت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ تحقیق کا کام زیادہ وسیع، با قاعدہ اور زیادہ صحیح ہو۔ مختصراً یہ کہ جہاں تک ممکن ہو ہر عہد کی زبان اور ہر قسم کی زبان کا با قاعدہ اور باریکی سے مطالعہ کیا جائے تاکہ زبان کے ہر لفظ اور ہر معنی اور الفاظ کے تمام مفہوم اور شکلیں جو ہر زمانے میں رائج تھیں، معلوم ہوسکیں۔ اور اُن کی سند کے لئے کافی اقتباسات احتیاط اور صحت اور تصدیق کے ساتھ اس طرح دئے جائیں کہ وہ تمام امور پر حاوی ہوں۔ کتابوں کے علاوہ رسالے، پمفلٹ نیز اخبارات کا مطالعہ بھی ضروری ہوگا۔ یہ کام نہایت دشوار اور کٹھن ہے اور کسی ایک شخص کے بس کا نہیں۔ اس قسم کے کام کے لئے متعدد اڈیٹروں اور سب اڈیٹروں اور بہت سے معاونوں اور مطالعہ کرنے والوں کی ضرورت داعی ہوگی۔ اب کسی ایک شخص کے لئے اس کام کا انجام دینا ممکن نہیں نہ اس لئے کہ جدید مقاصد کے رو سے اشتقاقی تحقیق کی بے اندازہ محنت ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے بلکہ نئے نئے علوم اور سائنس ایسے پیدا ہوتے جاتے ہیں کہ اُن علوں الفاظ کی تعریف و تشریح کے لئے اُن علوم کے ماہروں کی ضرورت ہے۔ لہذا ایک جامع ڈکشنری کے لئے مختلف قسم کے بے شمار اشخاص کی امداد و اعانت لازم ہے۔ میں مثال کے طور پر آکسفورڈ ڈکشنری کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ دنیا کی بے نظیر ڈکشنریوں میں سے ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دنیا کی کسی زبان میں ایسی جامع ڈکشنری اب تک نہیں لکھی گئی۔ اس کی تالیف میں پچاس سال سے زیادہ صرف ہوئے اور لکھوکھا روپیہ خرچ ہوا کتابوں کے

مطالعہ کرنے والے ۱۳۰۰ اشخاص تھے اور انہوں نے پانچ ہزار کتابوں میں سے ۳۵۰۰۰۰۰ اقتباسات انتخاب کئے - علاوہ تنخواہ یاب کارکنوں کے ۲۰ سب اڈیٹروں اور ہزاروں مطالعہ کرنے والوں نے بلا معاوضہ کام کیا - جن میں سے اکثر نے اس تندہی سے اپنا فرض ادا کیا کہ کوئی تنخواہ یاب کیا کرے گا - ہمیں یہ توفیق کہاں - میں یہ نہیں کہتا کہ ہم میں بلا معاوضہ کام کرنے والے نہیں مل سکتے کوشش کی جائے تو ڈھونڈنے سے دو چار مل ہی جائیں گے ' چنانچہ میرے ساتھ بھی دو ایک صاحب بلا خیال معاوضہ اپنے شوق سے کام کر رہے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں ڈھونڈنے پر بھی دو چار ہی ملیں گے اور وہاں سیکڑوں اپنے شوق سے منتیں کرکے شریک ہوتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ زبان کی خدمت ملک اور قوم کی خدمت ہے -

خطبات گارساں دتاسی

آٹھواں خطبہ - ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ ء

(مترجمۂ جناب محمد عبدالباسط صاحب بی اے)

[انگریزی سے اردو میں مولوی فضل امین صاحب نے ترجمہ کیا]

اس سال ہندوستان میں افسوس ناک حوادث رونما ہوئے ہیں خاص کر صوبجات شمال و مغربی جو اردو کا مرکز ہیں اور جہاں اردو زبان نے سب سے زیادہ فروغ پایا ہے، بہت پامال ہوا - ان ہنگاموں نے ادبی اور علمی مشاغل کو ملیا میٹ کر دیا - اور اسی سبب سے میں اپنے اس خطبے میں حسب معمول زبان اردو اور ہندی کے اخبارات اور جدید مطبوعات کی فہرست اور اعداد و شمار پیش کرنے سے قاصر ہوں - حضرات! آپ سے مخفی نہیں کہ انگریزوں کے خلاف اس شورش کا آغاز ایک ایسے ہیبت ناک قتل و غارت سے ہوا، جس کی مثال فرانس میں - یوم سینٹ بارتھیلو میو اور صقلیہ میں واقعات ویپرس میں حکومت انگریزی کے طرز عمل کے متعلق اتنی بات تو مسلم ہے کہ اہل ہند اس حکومت کی قدر کرتے تھے - اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس کا رویہ پدرانہ شفقت کے اصول پر مبنی نہ تھا تاہم یہ ضرور ہے کہ حکومت انگریزی قاعدے کی پابند ہے اور قوانین نافذہ کا احترام اس کا شعار رہا ہے - درآں حالیکہ خود ملکی حکومتیں متلون اور

ظالمانہ توہین - اور امر حقیقت کا اعتراف خود ان ہندوستانیوں نے کیا ھے جن سے میں ملا ھوں اور ان کی تصانیف بھی اس کی تائید کرتی ھیں جو میرے مطالعہ سے گذریں —

بہر کیف انگریزوں کی یہ پر تجمل مملکت جس کی ۱۳۱۹۸۶۹۰۰ آبادی اور ۸۳۷۴۱۲ مربع میل رقبے کو دیکھ کر دیگر اقوام فرنگ کو رشک اور حسد پیدا ھوتا تھا' اس بغاوت نے اس میں ایک تہلکۂ عظیم برپا کردیا۔ اس سانحہ کو دیکھ کر 'سر ٹامس مور' کا یہ شعر یاد آجاتا ھے جو اس نے مشرقی طرز میں لکھا ھے —

" جو پھول حسن و دل فریبی میں سب سے بہتر ھوتا
ھے وہ جلدی سے مرجھا جاتا ھے' اور چمکدار (رنگ)
جلد اُڑ جاتا ھے " —

انگریزی حکومت پر یہ الزام عاید کیا جاتا ھے کہ یہ بغاوت اس نے باشندگان ھند کو نصرانی بنانے کی کوشش کی بدولت خود مول لی۔ مگر یہ الزام بالکل غلط ھے۔ خود مذھبی حرارت رکھنے والے انگریزوں کو حکومت ھند سے ھمیشہ یہ گلہ رھا ھے کہ حکومت نے تبلیغی مساعی سے نہ صرف سرد مہری برتی بلکہ اشاعت مذھب کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ چنانچہ اخباروں میں یہ شکوے برابر نظر سے گذرے کہ جو ھندوستانی سپاھی عیسائی مذھب اختیار کر لیتے ھیں حکومت ان کو ملازمت سے علحدہ کر دیتی ھے تاکہ ھندوستانیوں کو یہ اندیشہ پیدا نہ ھونے پائے کہ حکومت تبدیل مذھب کی محرک اور تبلیغ نصرانیت میں معین اور مددگار ھے۔ مزید بران پرجوش عیسائی تو خود کمپنی پر الزام دھرتے ھیں کہ کمپنی امور دینی میں مداھنت کی مرتکب ھے' شرمناک رسوم کفر کا رکھ رکھاؤ

کرتی ہے اور خالص موحد مسلمانوں اور مشرک ہندوں میں ذرا فرق نہیں کرتی - پراٹسٹنٹ مبلغین اور رومن کتھلک مبلغین کے درمیان بھی کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا ' دونوں سے یکساں برتاو کیا جاتا ہے - پہلے انگریزی حکومت نے رومن کیتھلک کو پوری آزادی دے رکھی تھی - فوجی چھاونیوں میں روسی فرقے کے مذہبی پیشواؤں کو رہنے کے لئے کرایے دے رکھے تھے اور خود آگرہ شہر میں جو مقبوضات انگریزی کے بیچوں بیچ واقع ہے ایک خانقاہ عورتوں کے لئے بھی بنانے کی اجازت دے دی تھی - علاوہ ازیں رومن کیتھلک تعداد میں پروتسٹنٹوں سے زیادہ تھے - اول الذکر فرقے کے دو اسقف ' احاطہ بنگالہ ' میں تھے ' دو بمبئی کے لئے ' پھر ' مدراس ' حیدرآباد ' ' وزیگا پٹم ' ' میسور ' کوامبیتور ' سردھنا ' آگرہ ' پٹنہ ویروپلی اور منگلور کویلن اور میڈورا میں بھی الگ الگ اسقف تھے - مجموعی تعداد ان رومن اساقف کی ۱۹ تھی - بر خلاف اس کے خود انگریزی چرچ یعنی انگلیکی مت کے سارے ہندوستان میں بڑے پادری رہتے تھے - ایک کلکتہ ایک مدراس ایک بمبئی میں —

بلا شبہ دہلی میں عہدۂ بشپ قائم کرنے کا سوال در پیش ہے اور یہ بھی تجویز ہے کہ شاہ جہانی مسجد جامع کو گرجا میں تبدیل کر دیا جائے ' بشرطیکہ موجودہ شدید حملے سے محفوظ رہ گئی - علاوہ ازیں کنٹربری کالات پادری مطالبہ کر رہا ہے کہ تین بڑے پادریوں کا جدید تقرر عمل میں لایا جائے - ایک لاہور میں دوسرا آگرے میں ممالک مغربی و شمالی کے لئے اور تیسرا ٹناولی میں کرناٹک کے لئے - رومن کیتھلک اور پروتسٹنٹ اس وقت ایک دوسرے سے تبلیغ کے باب میں سبقت لے جانے کی کوششوں میں سرگرم نظر آتے ہیں - رومن کیتھلک ہندوؤں کو عیسائی بناتے ہیں اور پروتسٹنٹوں

کی نظر مسلمانوں پر ہے کیونکہ مسلمانوں کو بت پرستی سے بہت بعد اور نفرت ہے —

بغاوت کے اسباب بعید کچھہ ھی ھوں مگر ظاهری قریب و قرینی سبب چربی کے کارتوسوں کا سپاهیوں کو دیا جانا اور الحاق سلطنت اودھ ہے - ہر چند کہ ہند کے نظام سیاسی کے رو سے بادشاہ اودھ کی منزلت نواب وزیر اور صوبیدار کی تھی اور اُس کے اِدعاے خسروی کو 'تیمور' و 'اکبر' کے وارث نے جو برائے نام تخت 'دهلی' پر متمکن تھا تسلیم بھی نہیں کیا تھا - ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر هندوستانی اخبارات نے' جو بد دلی پھیلانے میں پہلے ھی سے مستعدی دکھا رہے تھے' اخبارات کی غیر محدود آزادی سے فائدہ اُٹھایا اور اهل هند کو کارتوسوں کو هاتھہ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کردیا اور یہ باور کرایا کہ اس حیلے سے انگریز هندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاهتے هیں' یہ حیلہ تھا یا اصل واقعہ' هم سمجھہ نہیں سکتے - ان لوگوں کی حماقت ضرور قابل افسوس ہے جنھوں نے یہ سمجھہ لیا تھا کہ وہ قومی تعصبات کو بے کھٹکے کچل سکتے هیں اور یہ نہ جانا کہ یہی تعصبات تو اهل هند کے مذهب کی جان هیں —

بہر کیف بغاوت کے شعلے اس سال هندوستان کے طول و عرض میں مشتعل هوگئے هیں - جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے مئی کے مہینے کی ابتدا میں میرٹھہ میں اول اول تلنگا پلٹن نے بغاوت کا علم بلند کیا - میرٹھہ سے یہ سیدھے دهلی کی طرف بڑھے اور شہر پر قابض هوگئے - جنگی کارروائی کی باگ مسلمانوں کے هاتھہ میں رہی جو هندوستان کے فاتح اور مالک تھے- علاوہ ازیں ان میں ایسا دم خم تھا کہ وہ خود بخود اس بغاوت کے سرغنہ بن گئے - اب انھوں نے نئے سرے سے شاهنشاہ مغلیہ کا تخت جمایا

اُنہوں نے اسی بادشاہ کو جسے کمپنی بہادر نے بادشاہی القاب و خطاب سے محروم نہ کیا تھا اور ۱۵ ہزار سالانہ وظیفہ جاری رکھنا گوارا کرلیا تھا، پشت و پناہ خلافت بنایا اور ہندؤں کے سامنے نو راجا کر دکھایا۔ اس بادشاہ کا نام سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی ہے۔ بادشاہ نے اب پھر سراج الدین حیدر شاہ غازی کا لقب اختیار کیا اور اپنی عارضی بادشاہت کے دوران میں مشرقی دستور کے مطابق جو سکہ رائج کیا تھا اُس پر بھی یہی لقب کندہ کرایا "بزرد سکۂ نصرت طرازی ۔ سراج الدین حیدر شاہ غازی" بادشاہ کی چار ماہ کی بادشاہی کا کیا حشر ہوا، اور دھلی کی لوٹ اور تاراج کے بعد کس طرح اُنہیں اور بیگم نواب زینت محل کو قید کیا گیا اور پانچوں شہزادے ایک ایک کرکے کس طرح طعمۂ اجل ہوے (تین تو فوراً گولیوں کا نشانہ بنائے گئے دو دار پر لٹکائے گئے) یہ سب واقعات مشہور اور معلوم ہیں لیکن اب تک بادشاہ اور ملکہ کی جان محفوظ ہے —

اُمید ہے دھلی میں سپاہ کا قتل عام اور مفرور سپاہیوں کی گرفتاری جو کرشن کے پوتر مولد متھرا کی طرف بھاگے اور وہیں گرفتار ہوے اور دیگر انگریزی فتوحات غالباً ضرور بغاوت کے بڑھتے ہوے سیلاب کو روکنے میں کامیاب ثابت ہوں گی اور بتدریج امن قائم ہو جاے گا ۔ یہی آرزو ایسے شخص کی ہے جو بنی نوع بشر کا درد دل میں رکھتا ہے اور جو انگریزوں سے تو اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ نصرانیت کے نمائندے اور تہذیب مغرب کے علم بردار ہیں۔ اور اہل ہند سے اس لئے ہمدردی کرتا ہے کہ باوجود اُن سخت بے رحمانہ بداعمالیوں اور خوفناک مظالم کے جس کے وہ اس بغاوت میں مرتکب ہوے ہیں، پھر بھی دل کش لوگ ہیں۔ ہندو تو اس

لئے کہ اُن کا تمدن بہت قدیم ہے اور مسلمانوں سے اس لئے کہ ایک طرح سے وہ بھی نصرانیت کے خاندان میں شمار ہوسکتے ہیں کیوں کہ وہ عیسیٰ ع کو کلمۃ اللہ کہتے ہیں اور توریت و انجیل کو کتب آسمانی مانتے ہوں —

دہلی کے بادشاہ کا سن انگریزی اخبارات میں ۹۲ سال بتایا جاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں' ان کا سن اس وقت ۸۴ سال ہے - کیوں کہ سنہ ۱۸۳۷ ع میں ان کی عمر ۶۳ سال تھی (ملاحظہ ہو خطبہ نمبر ۱) اور اس کے چند ہی سال بعد (ملاحظہ ہو خطبہ نمبر ۲) بیان کیا گیا کہ ان کا چہرہ مہرہ خوش نما' اخلاق و اطوار پسندیدہ اور دل کش ہیں اور جو کوئی اُن سے ملتا ہے اُن کا گرویدہ ہوجاتا ہے - یہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے ہیں جن کو مرہٹوں نے سنہ ۱۸۰۶ ع میں سریر حکومت پر بٹھایا تھا - اُن کی وفات کے بعد یہ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۳۷ ع کو تخت نشین ہوے —

ولی عہدی کے زمانے میں جب کہ ان کے والد زندہ تھے مرزا ابو ظفرخاں بہادر کہلاتے تھے - اسی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص ' ظفر ' کیا تھا اور شعر شاعری ان کا ایسا مشغلہ تھا جو عنفوان شباب سے لے کر مسند آرائی اور غدر کے ہنگامے تک برابر جاری رہا —

' ظفر ' شاہ عالم کے پوتے تھے جو ' آفتاب ' تخلص کرتے تھے اور ان کے چچا کا نام سلیمان شکوہ اور تخلص شکوہ تھا - حضرت ظفر نے شعر گوئی میں اپنے دادا اور چچا کی تقلید بڑی خوبی سے کی اور ان کے نقش قدم پر کمال پیدا کیا - فن شاعری میں اُن کے استاد شیخ ابراہیم ذوق تھے جو بڑے پایے کے شاعر ہوے ہیں - انہوں نے ' ظفر ' کی شاعری میں بڑی اصلاح کی - ' شیفتہ' اور ' کریم' نے جو باکمال شاعر تھے اپنے تذکروں میں ' ظفر ' کی جودت طبع اور اوصاف حمیدہ کی بڑی ستائش کی ہے - یہ دونوں مصنف ' ظفر '

کو اپنے عصر کے شعرا کی صف اول میں جگہ دیتے ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ ظفر کی شاعری میں خاص جدت پائی جاتی ہے اور ان کا کلام بہت مرصع ہے۔ ظفر نے ہر صنف سخن پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان کی اکثر غزلیں گیت اور ٹھمریاں ہندوستانی گھروں میں پڑھی جاتی ہیں۔ دیگر تصانیف کے علاوہ ان کا ایک ضخیم دیوان ہے جس کے بہت سے اقتباسات شیفتہ اور کریم الدین نے اپنے تذکروں میں دئے ہیں۔ انہوں نے 'گلستاں' کی شرح موسوم بہ "شرح گلستاں" بھی یادگار چھوڑی ہے جو چھپ چکی ہے۔ 'ظفر' کو فن خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا اور مسجد جامع دہلی کی آرائش کے لئے انہوں نے اپنے ہاتھ سے قرآن شریف کی آیات لکھ کر بھیجی تھیں۔ ان کے صاحبزادے 'مرزا دارا بخت' بہادر کو بھی شعر گوئی کا شوق ہے اور انہوں نے بھی اپنے والد ماجد کی طرح اس طرف توجہ کی۔ ان کی اُردو غزلوں پر سے 'قاسم' 'سرور' اور 'کریم' نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ شعرائے معاصرین میں اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں۔ ہماری تمنا ہے کہ وہ قتل و ہلاکت سے محفوظ رہیں اور نہیں تو پر امن فقر و درویشی ہی اختیار کرکے علمی اور ادبی خدمت کرتے رہیں۔

نہ معلوم اس وقت بد بخت شہر دہلی پر کیا گذر رہا ہوگا! اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ آج اُس کی ایک یادگار بھی غارت گری سے محفوظ و مامون نہ رہی ہوگی۔ ہنگامۂ غدر سے پہلے ہی اس شہر شہرۂ آفاق کی بہت سی یادگاریں لڑائیوں اور ہنگاموں کی بدولت مٹ چکی ہیں یا کھنڈر ہوئی پڑی ہیں اس کے آبشار اور فوارے جو 'فرانس' کے محل 'وارساں' کے آبشاروں اور فواروں کی ٹکر کے تھے اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ یہی حال شہر کی اور بہت سی عمارات کا ہے۔ ان عمارات کی جگہ اُن کے حالات "آثار الصنادید" میں باقی رہ جائیں گے جو مولوی

سید احمد نے حال میں لکھی ہے - میں اس کتاب کا کامل ترجمہ عنقریب شائع کرنے والا ہوں - ضمناً میں اتنا بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ کتبوں کے نقشے جو لیتھو کے چھپے ہوے ہیں کتاب مذکور میں شامل کئے گئے ہیں اور یہ سب کے سب عربی اور فارسی ہیں اور یہی زبانیں مسلمانان ہند کے علمی حلقوں میں رائج ہیں - سنسکرت میں صرف اسوکا کی لات کے کتبے کا نقش ہے اور اردو میں صرف ان کتبوں کے چربے ہیں جو عالمگیر ثانی نے حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر سنہ ۱۷۵۵ ع میں کندہ کراے تھے - آپ ہندوستان کے سر آمد صوفیا میں سے ہیں —

انگریزی روز ناموں میں حال ہی میں دہلی کے دلچسپ حالات شایع ہوچکے ہیں اور میں نے خود اپنی تاریخ میں ان کی تفصیل اور وضاحت کردی ہے —

ذیل کی چند سطور ایک تحریر سے مقتبس ہیں جس سے اس بد نصیب و فلاکت زدہ شہرۂ آفاق دار الخلافہ کی موجودہ تباہ حالت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اگرچہ اس میں مبالغے کی جھلک بھی نظر آتی ہے جو اہل مشرق کی عادت ہے - یہ نقشہ اُس دہلی کا ہے جو کبھی آباد و بارونق تھی —

دہلی شہر کی سب عمارات پر تکلف اور نظر فریب ہیں - اس کے باغات اپنی حسن و شادابی میں دنیا میں نظیر نہیں رکھتے - گھر گھر نہریں اور فوارے جاری ہیں - جا بجا حوض ہیں جو پانی سے کٹورے کی طرح بھرے جھلکتے ہیں، اگر رضوان بھی ایک دفعہ اس کی جھلک دیکھ لے تو بہشت کی دربانی سے اس کا جی پھر جاے - اس شہر کا گوشہ گوشہ ایسا وسیع و معمور ہے کہ ہفت اقالیم میں سے ایک ایک اقلیم اس میں سما جاے، اس کی تنگ سے تنگ گلی بھی اتنی فراخ اور کشادہ ہے کہ پورا شہر اس

میں آجائے - ہر جگہ چہل پہل اور گہما گہمی ہے اور جدھر نظر جائے اُلجھ کر رہ جائے - بوانت بھانت کا انسان یہاں پایا جاتا ہے ' دور دور کے قصبات اور دیہات سے آفاقی یہاں آکر رہ پڑے ہیں - ضرورت کی کوئی چیز ایسی نہیں جو یہاں نہ ملے اور ہر طرح کا آرام و راحت یہاں میسر ہے - ہر ملک کی جنس اور ہر قلم رو کا آدمی یہاں موجود ہے - یوں تو ہر بازار لاثانی ہے مگر 'چاندنی چوک' جو شہر بھر میں سب سے بڑا بازار ہے اپنی خوبی میں اپنا آپ ہی جواب ہے - اس کی ہر دکان بھر پور ہے اور اپنا نظیر نہیں رکھتی وہ وہ مال و اسباب فراہم ہے کہ بادشاہوں کا دل دیکھ کر للچائے - خاص چوک ایسا کشادہ ہے کہ جس کے دیکھے سے دل کشادہ ہوجائے پھر وہ صفائی اور ستھرائی کہ خشکہ بکھیر کر دانہ دانہ اٹھا لو - ایک ایک تاجر یہاں کا وہ شان رکھتا ہے کہ اچھے اچھے امیر اُمرا اس سے ملنے میں عار نہیں کرتے - یہاں کے ادنیٰ کباڑی کے وہ دماغ ہیں کہ بڑے بڑے جوہریوں کو خاطر میں نہیں لاتا - بساطی کے پاس وہ مال کی کثرت ہے کہ استنبول کا سارا بساط خانہ ایک طرف اور اس کا اسباب ایک طرف - صرافے کی ایک ایک دکان ایسی ہے کہ اُس کے ایک صندوق میں سارے ایران کے صرافے کی دولت سما جائے —

الغرض جس دوکان کی طرف جاؤ برابر روپیے کی جھنکار سنائی دیتی ہے - اور ایسا ایسا ساھوکار پڑا ہے جو تنہا ایک پوری سلطنت کی سر براھی کرسکتا ہے - اگر ایک لشکر کے لئے کوئی بارود درکار ہوتو دو ہی دن میں پورا ساماں یہاں سے فراہم کر لو - اہل پیشہ اور ہنر مند کو کام کی کمی نہیں ' رات دن لوں دین بنج بیوھار ہوتا رہتا ہے - جوہری کی اعلیٰ

سی دوکان کو دیکھو تو ایک کان جواہر معلوم ہوتی ہے۔ اگر خطۂ ارض کی ساری دولت کسی مہم یہاں لے آئیں تو کھڑے کھڑے ایک اکیلا ساہوکار اُس کو اپنی تحویل میں امانت رکھنے کو تیار ہو جائے' ہر دوکان اپنی آرائش اور زیبائش میں رنگین اور ہم رنگ بہار ہے اور کسی شے کی کمی کا وہم بھی یہاں نہیں گذرتا۔ ہر جگہ خلقت کا ازدحام ہے اور ہر طرف میلے ٹھیلے کی سی چہل پہل ہے۔ اس شہر کا ہر حصہ خوش منظر اور آباد ہے۔ خانقاہیں' مدرسے اور عالی شان مکانات اس شہر میں بکثرت ہیں" —

اس غدر کے جگر خراش اور اندوہ گیں مناظر کے بڑے بانی مبانیوں میں نانا صاحب ایک تعصب کی آگ میں بجھا ہوا ہندو تھا۔ یہ شخص 'پیشوا باجی راؤ' کا لے پالک تھا۔ نانا صاحب نے اس لئے ویتھور میں اقامت اختیار کرلی تھی اور یہ مقام 'کان پور' کے پاس ہے۔ سنا ہے کہ یہ خون خوار انسان انگریزی تقریر و تحریر میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اور انگریزی کی واقفیت ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں میں عام ہو چلی ہے۔ اس شخص نے 'شیکسپیر' کے مشہور ڈراما' ہیملٹ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اگرچہ بہت سے ہندوستانی ایسے تھے جنھوں نے اس ہنگامے میں بڑے ظلم ڈھائے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ بہت سے ہندوستانیوں نے اپنے بدیسی آقاؤں کا ساتھ دیا اور اپنی جانوں پر کھیل کر ایسے فرنگیوں تک کو پناہ دی جن سے کبھی کی صاحب سلامت بھی نہ تھی۔ علاوہ اس کے خود لارڈ پامرسن نے لارڈ میور آف لندن کی دعوت کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :—

"اگر باغی اور مجرمین کا شمار ہزاروں کی تعداد میں

ہے تو یہ گلاہ بھی لاکھوں کی تعداد میں گلاے جا سکتے ہیں"۔

جرائد و اخبارات نے وفاداری کے عجیب و غریب واقعات بیان کئے ہیں۔ ہندوستانی راجہ نوابوں نے انگریزوں کا ساتھ اپنی اپنی حیثیت کے موافق پورا پورا دیا۔ انھوں نے انگریزوں کو فوجی کمک بھیجی اور روپے سے بڑی مدد دی۔ خود 'اودھ' میں راجاؤں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر انگریزوں کی جانیں بچائیں —

'گوالیار' کے مہاراجہ 'سیندھیا' فرنگی تہذیب و تمدن کی بہت قدر کرتے تھے چنانچہ اپنی ریاست میں غدر سے پہلے ۳۱ مدرسے جاری کئے تھے جن میں ۸۰ اُستاد تھے اور ۲۵۰۰ طالب علم۔ ان کو ایسی تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ انگریزوں سے ملنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ 'سندھیا' اپنی رعایا کے آدمی لے کر 'گوالیار' کی باغی فوج کے سر پر آموجود ہوا اور باغیوں کا محاصرہ کرکے ہتھیار رکھنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ ہتھیار رکھہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں اس مقام پر ایک دوسرے سرہٹہ سردار یعنی مہاراجہ 'ھولکر' کے ان شریفانہ الفاظ کا بھی تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں جو اُس نے اپنی باغی فوج کو مخاطب کرکے کہے جس کا مضمون یہ تھا کہ "عورتوں اور بچوں کا قتل کسی مذھب میں روا نہیں"۔ اور میں اس امر کا بھی اظہار کر دینا چاھتا ہوں کہ بہت سے انگریز جن کے متعلق یہ مشہور ہوگیا ہے کہ وہ مارے گئے (بقول Examiner کے) اُن میں سے بہت سے وفادار ہندوستانیوں کے گھروں میں پناہ گزیں ہیں۔ جب دوبارہ امن و امان قائم ہو جاے تو اپنی پناہ گاھوں سے نکل آئیں گے —

بعض ہندوستانی جو جان نثاری کرنے سے قاصر رہے انھوں نے کھلم کھلا مصیبت زدہ انگریزوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ ایسے ہی لوگوں

میں سے ایک شخص ' سید عبداللہ ' نامی ہے جو بیگم ملکہ اور شہزادگان اودھ کے ساتھیوں میں سے ہے۔ جب اُس کو جنرل ھنری لارنس کی مرگ کی خبر معلوم ہوئی جو اس غدر کے ایک معرکے میں ھلاک ہوا تو اُس نے ایک اردو مثنوی لکھکر شایع کی۔ ' عبداللہ ' ایک زمانے میں پنجاب کے کسی انگریزی دفتر میں مترجم رہ چکا تھا اور لارنس سے خاص طور سے واقف تھا۔ اس نے اسی نظم کا مختصر ترجمہ خود نظم انگریزی میں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس روانی کے ساتھ انگریزی زبان لکھنے پر قادر تھا۔ ذیل میں سید مذکور کی نظم کا لفظی ترجمہ نقل کیا جاتا ہے جو اصل نظم سے کیا گیا ہے :—

" لارنس ھندوستانیوں کا بڑا رفیق تھا اور وہ
ھمیشہ ان کی ترقی اور برتری کا خواھاں تھا اور وہ
ھر کس و ناکس کی مصیبت رفع کرنے میں کوشاں رھتا تھا۔
اور ھر چشم تر سے آنسو پونچھتا تھا۔ ھنگام رزم میں
اس کی آنکھیں انگارے کی طرح لال ھوجاتی تھیں ' اگرچہ
دل اس کا موم سے بھی زیادہ نرم تھا۔ وہ احکام ربانی
کا شیدائی اور دنیاوی مشاغل سے دور رھتا تھا۔
خدا کی خوشنودی اور بندوں کی خوشی اور ھر دل کو
خوش رکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ مگر گردش زمانہ پر
صد حیف کہ تیرہ بختی اور بد نصیبی نے اس کو نشانہ
اجل بنایا اور خون میں نہلایا۔ اگرچہ یہ شخص اس جہاں
سے رخصت ھوا مگر اُس کا نام اُس کے بعد شہرت کے
ساتھہ رھا۔ اُس کے قابل تعریف اوصاف کی یاد دلوں

"اسی طرح امٹ ہے جس طرح پتھر کی لکیر"—

اس نظم کے آخری شعر سے اس سورما کی تاریخ وفات ۹ فروری سنہ عیسوی و ہجری نکلتی ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ "شریف و نجیب سر ہنری لارنس مرگیا۔ اُس کا نام نامی اُس کی یادگار ہے"۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ کے حروف کے اعداد جوڑو تو = ۱۸۵۷ ع نکلتا ہے اور دوسرے مصرعہ سے ۱۲۷۴ ہجری —

اس ہنگامے میں نہ صرف بہادر اور جری انگریز فوجیوں کا ہی ماتم کرنا پڑتا ہے بلکہ دہلی میں تلنگوں کی لوٹ مار، کانپور کے قتل عام اور اس شورش کے دیگر خوف ناک حوادث میں ہر طبقے کے غیر مسلم اور غیر حربی ہی کثرت سے تہ تیغ ہوے۔ ان مقتولین کے انبوہ میں سے جو لوگ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ان میں میرا ایک دوست مسٹر 'فرانسس ٹیلر' ہے۔ میں نے اپنے گذشتہ سال کے خطبے میں اُس کا تذکرہ کرتے ہوے کہا تھا کہ اُنھوں نے میرے لئے جدید اُردو کی تازہ ترین مطبوعات کی فہرست فراہم کی ہے۔ مسٹر فرانسس ٹیلر دیسیوں کے کالج کا پرنسپل تھا جو اس بد نصیب دارالحکومت دہلی میں واقع تھا۔ اس کالج میں ۳۰۰ طلبا تھے۔ ان طلبا کو ریاضی، ہئیت یورپی اُصول پر پڑھائے جاتے تھے اور مشرقی علوم السنہ کی تعلیم ایشیائی اُصول پر دی جاتی تھی۔ اضلاع شمال و مغربی کی علمی و ادبی ترقی کی تمام اطلاعات مجھے مسٹر ٹیلر کی عنایت سے حاصل ہوئی تھیں۔ حقیقت میں یہ شخص بڑے لطف و کرم اور تندہی سے مجھ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھتا تھا اور چونکہ ہندوستانی زبان کا وہ بڑا ماہر تھا اور اہل علم ہندوستانیوں کے پاس اس کی آمد و رفت تھی کہ جس سے وہ اُردو میں

بلا تکلف بات چیت کر سکتا تھا، اس لئے اب تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ ہمارے لئے اُس کا وجود ہندوستان کی علمی اور ادبی ترقیات کے متعلق کس قدر کار آمد اور فائدہ رساں تھا۔

دیسیوں سے اُس کا میل جول کچھ کام نہ آیا اور دہلی کے قتل عام میں ۱۰ مئی کو لقمۂ اجل ہوگیا اور جوان جورو اور خورد سال بچہ چھوڑ مرا۔ اس کی موت ہندوستانی ادبیات کے حق میں ایک حادثہ ہے۔ ادب اُردو سے اُس کو عشق تھا اور اس نے اس کی بڑی خدمت انجام دی۔ اول تو یہی خدمت کچھ کم نہ تھی کہ 'دہلی کالج' کے صدر کی حیثیت سے 'بطروس' اور 'سپرینگر' جیسے لائق اساتذہ کے کام کو جاری اور برقرار رکھا اور ان کی جانشینی کے حق کو خوبی سے انجام دیا۔ اُدھر اور ہندی میں تصنیف و طباعت کے کاموں میں ہمت افزائی کر کے لوگوں کی مدد کی، اسی طرح عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت کتابوں کے ترجموں کی بھی سرپرستی کی۔

صرف غدر ہی نے مشرقی علوم کو نقصان نہیں پہنچایا۔ حال ہی میں طہران میں مرزا 'محمد ابراہیم' کا انتقال ہوا ہے جو ویست انڈیا ہلسبری کالج کے پرنسپل تھے، جہاں میری اُن سے سنہ ۱۸۳۷ ع تک ملاقات رہی پھر شاہ 'ایران' نے ان کو عہدۂ فرمان روا (گورنر) پر تقرر کر کے طلب کر لیا۔ وہ نہایت عمدہ انگریزی بولتے اور لکھتے تھے اور بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے لئے مشہور تھے۔ ہم ان کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے ایک عمدہ فارسی صرف و نحو لکھی اور بہت سے دلچسپ مضامین فارسی علم ادب کے متعلق یادگار چھوڑے۔ ۲۰ برس ہوے کہ یہ مضامین ایک رسالہ موسوم بہ ایشیاٹک جرنل میں شایع ہوے تھے۔

انہوں نے یشعیا لیبی کی کتاب کا اور تاریخ روما کا ترجمہ اپنے شاگرد یمانی شاہ ایران کے لئے کیا تھا۔ خرد یورپ میں عین عالم شباب میں مسٹر نیوٹن کا انتقال ہوگیا جو ممتاز مستشرق اور ہندوستانی زبان کا بڑا ماہر تھا۔ اور ہر فورت کے ممتاز ڈیٹر سٹفن آسٹن کا شریک ذوق ادب تھا۔ نیوٹن کا انتقال اپریل میں ہوا اور مئی میں کپتان آدم کوتن چل بسا۔ یہ شخص سالہا سال مشہور چل ٹن ہم کالج میں زبان ہندوستانی کا معلم رہا۔ اردو اس نے اپنی ہندوستان کے ایام قیام میں سیکھی تھی۔ اچانک موت نے اُس کو علم کی تعرض اور اپنے دامن سے چھین لیا —

آخرالامر پیرس کو بھی ۱۸ ستمبر کو کاترمیر کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ یہ اچھا بھلا تھا کہ صبح کے وقت اپنے بستر استراحت پر مردہ پایا گیا۔ وہ اپنے زمانے کا بڑا زبردست مستشرق تھا غالباً اپنی عصر کا بڑا جید عالم تھا۔ یہ فاضل محترم ۲۵ سال تک زبان فارسی کا درس دیتا رہا اور اپنی ساری زندگی اس نے زبان فارسی کے لئے وقف کردی تھی۔ وہ دنیا سے ہمیشہ کنارہ کش رہا اور آخر دم تک اُس نے قدیم سیدھے سادے اخلاق و آداب کو بحفاظت برقرار رکھا اور شرافت اور انسانیت کو کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ سنہ ۱۷۸۲ ع میں پیدا ہوا اور ۲۶ برس کی عمر میں مصری زبان اور مصری ادبیات پر اُس نے ایک اہم تصنیف کی جس کی وجہ سے وہ فوراً مشہور ہو گیا۔ ۳۳ سال کی عمر میں وہ شعبۂ کتبات Academy of Inscriptions کارکن بنایا گیا اور دس سال بعد کالج آف فرانس میں عبرانی کا معلم اول مقرر ہوا اور اسی وقت سے باقاعدہ سبق دینا اور شعبۂ مزکور کے علمی مذاکروں

اور جلسوں میں شریک ہوتا اس کے مشاغل میں داخل ہوگیا - نیز اکاڈمی مذکور میں وہ بیرن داسیر کی جگہ سکریٹری کی خدمات بھی انجام دیتا رہا - اپنے اوقات کا بقیہ حصہ وہ اپنی مخصوص کام (یعنی علوم مشرقیہ) پر صرف کرتا رہا اور چونکہ رہ تھوڑے کی زندگی بسر کرتا تھا اور عیال و اطفال کے فکر سے فارغ تھا اس کام کو وہ آخر دم تک جاری رکھ سکا - چنانچہ اس کی یادداشت مصریہ مشتمل بر تواریخ و جغرافیہ مصر اور یادداشت دربارہ نباتیین (Nabatheens) کی بڑی قدر ہوی - علامہ مقریزی کی تاریخ مملوک سلاطین مصر کا ترجمہ ' رشیدالدین کی اصل تاریخ مغول ایران مع فرانسیسی ترجمہ , مقدمہ علامہ ابن خلدون Academy of Inscriptions کے نوٹسز آن مینو سکرپٹ Notices of Manuscripts کی جلدوں میں شائع ہوتا رہا متعدد مضامین اخبار Journal of savants کے ذریعہ شائع ہوئے - دیگر تالیفات بھی اس کے قلم سے نکلیں - اور انھیں ایام میں وہ پانچ لغات کی کتابوں کی تصنیف اور تالیف پر برابر محنت کرتا رہا جس کا بہت سا مواد قلمی لکھا ہوا اُس نے چھوڑا ہے یہ لغات عربی , فارسی , ترکی , قبطی اور سریانی زبانوں کی تھیں - اس کی تفریح اور سیر صرف یہ تھی کہ پرانی کتابوں کی دکانوں میں جاتا , پرانی اور کم یاب کتابوں کی تلاش کرتا اور جہاں کتب خانے فروخت ہوتے وہاں پہنچ جاتا - نیز اپنے معزز خاندان کے لوگوں اور چیدہ چیدہ احباب سے ملاقات کرکے بھی اُسے بے حد خوشی ہوتی تھی - وہ اپنے مہمانوں کی تواضع اور آو بھگت بڑے تپاک سے کرتا تھا - ان کو اپنی میز کے گرد یا دھکتی ہوئی انگیٹھی کے پاس جمع کرکے اپنی تحقیقات کے سر بستہ رازوں سے آشنا اور خبردار کیا کرتا تھا - جو اُس سے ملاقات کے لئے آتے اُن سے بڑے لطف و اخلاق سے پیش آتا تھا - صرف مادہ لوگوں سے نہایت کا برتاؤ کرتا اور جو کچھ خیر خیرات کرتا تھا اُس کی

خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی - اس کی گفتگو ہر حال میں سبق آموز ہوتی مگر ساتھ کے ساتھ بے تکلفی اور زندہ دلی سے خالی نہیں ہوتی تھی ایک فہمیدہ اور ہوشیار عورت نے اُس کی گفتگو کا حال سچ سچ یوں بیان کیا ہے " جب باتیں کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکیم و فلسفی کی جگہ دنیادار آدمی بیٹھا بول رہا ہے اُس کی گفتگو ہمیشہ پر لطف ہوتی ہے اور اُس کے سلنے سے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے - اس کا مزاج مہذب ہے اس میں خواہ مخواہ عامی نخوت کی آمیزش نہیں پائی جاتی - دوسروں کی بات التفات سے سنتا ہے بلکہ لغو اعتراضات تک سے بھی بے اعتنائی نہیں کرتا - اور کلام میں لطائف و حکایات کا ایک ایسا شیریں سر چشمہ جاری ہوجاتا ہے جس سے عالم و جاہل دونوں لذت اندوز ہوتے ہیں " —

کہا جاتا ہے کہ مسٹر کاترمیر کے مذہبی عقائد عام رومن کیتھلک طریق سے جدا گانہ اور جانسینی تھے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان خدا کی مدد کے بغیر نجات نہیں حاصل کر سکتا - اگر اس سے یہ مطلب ہے کہ وہ ملحد تھا اور برکات خارجی کی ضرورت تسلیم کرتا تھا تو یہ حکیم قطعاً اس عقیدے سے کوئی سرو کار نہ رکھتا تھا - کیونکہ وہ دل سے کیتھلک عقائد کو تسلیم کرتا اور اُن کا قائل تھا - اور اگر یہ الحاد کا الزام ان لوگوں کے لئے تراشا گیا ہے جو مسیحی اخلاق کے شدت سے پابند اور گرجا کے اصول پر کار بند اور بدل وجاں فرانسیسی گرجا کی سنگت میں معتقدات کے مخالف ہیں تو اس معنی میں اسکے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ملحدانہ یا جانسینی عقیدہ رکھتا تھا —

کاترمیر میں دنیاوی شہرت کی ہوس نام کو نہ تھی - غیر ممالک کی چلند

هی ایسی عامی انجمنیں تهیں جن کی رکنیت اس کے تعول کی تهی ۔ اور نشانات امتیاز میں محض اس کے پاس ایک تهغه موسومه کیوالرات لزیان دی آنر کا تها اور یه اعزاز بهی اس کو اس طرح حاصل هوا که جب وه انجمن کتبات کا صدر منتخب هوا جس کا رکن وه چوده سال سے تها اور اس کی عمر اس وقت ۴۷ سال کی هو چکی تهی تو اس کے احباب نے بنابر اس کے علم کے اس کے لئے نشان امتیاز کا مطالبه کیا —

حضرات ! کاترمیر کے مرنے کے بعد همارے هاں مسند علم جو خالی هوگئی تهی اس کو پار اس ڈیفر نے سنبهالا هے جو کاترمیر کے خاص تلامذه میں سے هے اور جس پر اس کی نظر اور توجه خاص طور پر مبذول رهی هے ۔ ڈیفر کی نشو و نما بڑے شاندار علمی ماحول اور استوار ادبی اصولوں کے زیر اثر هوئی هے ۔ علاوه بریں اس کو اپنی تحقیقات علمی اور سیاحت کے سلسلے میں زبان فارسی میں تحریر و تقریر کی مشق بڑهانے اور اس میں شستگی پیدا کرنے کا بڑا موقع ملا اور خوش قسمتی سے وه زبان کے درس تدریس کے کام پر مقرر هوا هے لهذا جو حضرات مرے سامنے موجود هیں اور زبان اردو کے متعلق میرے خطبات میں شریک هیں ان سے میں پرزور تاکید اور سفارش کرتا هوں که وه ڈیفر کے خطبات میں جو زبان فارسی کے متعلق هوتے هیں ضرور شرکت کریں ۔ کیونکه فارسی کا اس اردو سے جو مسلمانوں میں رائج هے ایسا گہرا تعلق هے که اردو کی ته کو پهنچنا فارسی جاننے پر موقوف هے ۔ اس طرح یه بهی یقینی بات هے که فارسی سمجهنے کے لئے اردو کا جاننا ضروری هے کم از کم هندیوں کی فارسی کا علم ؛ کیونکه هندوستان کی ترکیبیں اسی سے ماخوذ هیں فارسی اگر اردو کی سر چشمه هے تو هندی کی ماتا سنسکرت هے گریا هندی هندوستانی کی هندو شاخ هے ۔ چنانچه

ہوں کو تو یہ مشورہ دونگا کہ اب اس قدیم زبان کی طرف بہی توجہ کریں جس کی تعلیم اسی ہال میں کسی ناموز ماہر لسانیات دو دیتی چاہئے۔ میں زبان اردو کے فوائد اور اس کی اہمیت پر بارہا زور دیتا رہا ہوں اس میں مجھے ذرا شبہہ نہیں کہ ہندوستانی زبانوں کے حاصل کرنے کی اہمیت کا احساس نہ صرف اُس زبان کا جس کی میں تعلیم دیتا ہوں روز بروز زیادہ بڑہتا جائیگا کیونکہ اس زبان کی ضرورت فوجی اور ملکی عہدوں کے لئے خاص طور پر پیش آتی ہے۔

کچھہ مہینے ہوتے ہیں کہ لیڈن ہالینڈ کے انگریز مستشرق مسٹر لیسن لیس (Nassau Lees) جو اپنی عربی فارسی تالیفات کی وجہ بہت کچھہ مشہور ہوئے ایک رسالہ ہندوستان کی تعلیم کے بارے میں تصنیف کیا۔ لارڈ میکالے نے جو اصلاحات نظام تعلیم کے متعلق پیش کی تھیں اور جن کی تائید ٹامس نے کرتے ہوئے اس پر زور دیا تہا کہ ہندوستان میں صرف لاطینی حروف استعمال کئے جائیں اور بیشتر ہے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا جائے، لیسن کے خیال میں یہہ تحریکات تحصیل علوم مشرقیہ کے حق میں مضر اور خطرناک ہیں۔ اس کے رسالہ کا عنوان یہہ ہے Instructions in the Oriental Languages Concidered اس رسالہ میں یہہ حقیقت از سرنو واضح کی گئی ہے کہ السنہ مشرقیہ کی تحصیل اور خاصکر ہندوستانی زبان کی ملکی اور فوجی خدمت کے لئے ازبس ضروری ہے اور یہہ ایک خیال خام ہے کہ انگریزی زبان ہندوستان میں ایسی مقبول ہو جائیگی کہ تہوڑے عرصے میں انگریز السنہ مشرقیہ سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ اس رسالہ کا مصنف شکایت کرتا ہے کہ اس مسئلے پر انگلستان اور ہندوستان کے اہل الرائے میں ابہی تک کوئی مفاہمت

کی صورت پیدا نہیں ہوئی - حالانکہ انقلاب میں وہ انگلستان کے سیاسی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جملہ السنۂ مشرقیہ کی تحصیل کی حمایت کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح روس و آسٹریا میں علوم و فنون مشرقیہ کی تحصیل کے لئے باقاعدہ مدارس ہیں اسی طرح اس قوم کا بھی فرض ہے جو اپنے آپ کو ملکۂ بحر کہتی ہے کہ السنہ مشرقیہ کی تعلیم کے لئے ایک ایسی درس گاہ قائم کرے —

اس خیال کی داد دینے پر ہر شخص مجبور ہوگا، خصوصاً بحالت موجودہ کہ انگریز غدر کے بعد از سر نو اپنی حکومت کو ہندوستانیوں سے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ محض فوجی قوت کے بل بوتے پر ان قوموں پر حکومت کرنا محال ہے جن کی زبان اور رسم و رواج میں اختلاف ہے۔ ایسی صورت میں محکوم قوم کی ہمدردی حاصل کرنی بھی ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مفتوح و محکوم قوم سے براہ راست تعلق پیدا ہو۔ اور اس حقیقت کا انکشاف لطف اللہ* کے واقعات سے ہوتا ہے کہ جوں ہی انگریزوں سے اُسے بات چیت کا موقع ملا وہ انگریزوں کے ساتھ ہوگیا —

اگر مشرقی علوم سے بے اعتنائی کا الزام انگریزی حکومت پر کسی حد تک درست بھی ہے تو یہ الزام قوم انگریزی پر ہرگز عاید نہیں ہوسکتا۔ علاوہ کثیر مشرقی تالیف کے جو انگلستان سے شایع ہوئی ہیں اور کون سا ملک ہے جہاں ایک انجمن مشرقی علوم کی کتابوں کی تدوین و اشاعت اور دوسری ترجمہ کے لئے باقاعدہ طور پر قائم ہے خود کلکتے میں ایک انجمن قائم ہے جہاں سے سنسکرت، عربی، فارسی کی غیر مطبوعہ کتابیں شایع ہوتی ہیں اور اب تک ۱۲۹ کتابیں مشرقی علوم کی چھپ چکی ہیں۔ خود ہندوستان والے بھی غدر کے زمانے تک برابر مختلف تصانیف و رسائل شایع کرتے رہے۔

دہلی پر باغیوں کے استیلا سے کچھ ہی پیشتر آنریبل کمپنی کے ارکان کی توجہ سے ہوا یہ کتاب نامور شہنشاہ اکبر کے حکم سے تحریر ہوئی تھی اور اس کتاب میں نہایت صحیح اور پر از معلومات اعداد شمار دولت مغلیہ کے متعلق موجود ہیں۔ اُردو ترجمے میں بہترین ہندوستانی مصوروں کے ہاتھ کی ایتھو کی چھپائی کے نقشے اور مختلف سکوں ، ہتھیاروں اور میووں کی تصویریں شامل ہیں —

اب بغاوت نے ہندوستان کی ساری زندگی تہ و بالا کر ڈالی - ہمیں اُمید بندھتی ہے کہ اب امن و امان قایم ہونے کے بعد اہل ہند از سر نو اپنی فرصت کے اوقات میں شعر و شاعری کے دلچسپ مشغلہ میں منہمک ہو جائینگے اور پھر سے اپنے جدید جلیل القدر شاعروں کی یاد کو زندہ کرینگے جو 'ولی' اور 'یاس' سے کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ 'سودا' اور ولی کے چرچے پھر ہر طرف سنائی دینے لگیں گے۔ 'ولی' تو ان ہجووں کو دل سے پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ 'ولی' ہی پہلا شاعر ہے جس نے انہیں اپنی شاعری کا چسکا لگایا اور اسے ہندوستان میں پہلی مرتبہ رائج کیا۔ 'ولی' نے حافظ کا اس طرح ہندوستان میں تعارف کرایا ہے جس طرح سے کہ Horace نے سب سے پہلے اہل روما سے Archiloque کا تعارف کرایا تھا —

ہمیں یہ اُمید ہے کہ بہت جلد اہل ہند اپنی قومی شاعری کی روایات کے مطابق شاعری ترقی دیں گے اور ایسی غزلیں کہیں گے جنہیں سن کر کبھی تو عشق مجازی کا مزہ آئیگا اور کبھی عشق حقیقی سے دل مسرور ہوگا اور کبھی ان دونوں کو ایک ہی کوزے میں بند کر کے پیش کیا جائے گا۔ جس طرح کہ Minnesinger یا ازمنہ وسطیٰ کے بھاٹوں کے گیتوں میں یا دانتے کی نظموں اور پٹرارک اور شیکسپیر کے Sonnets میں ہمیں لطف آتا ہے ویسا ہی ان غزلوں میں آئے گا۔ بقول والٹر اسکاٹ —

"عشق ہر جگہ کارفرما ہے - دربار ہو، میدان کار زار ہو، گوشۂ چمن ہو ہر جگہ اسی کا ڈنکا بجتا ہے - یہی ہے جو دنیا کے انسانوں اور ملاءاعلی پر حکمرانی کرتا ہے، اِسی کا دوسرا نام فردوس ہے اور فردوس اِس کے سوا کچھ نہیں" —

اُردو کے اَن پڑھ شاعر

از

[جناب مرزا فدا علی صاحب 'خنجر' لکھنوی]

——(*)——

ثبات

مہر علی نام ثبات تخلص۔ پرگنہ ضلع مظفر نگر نواح دہلی میں پیدا ہوئے۔ نہایت حسن پرست و شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ طبیعت میں کمال درجہ آزادی کا عنصر موجود تھا۔ پڑھانے بٹھائے گئے تو دل نہ لگا۔ ہر وقت کھیل کود کی فکر اور گُڈی گھومنے پھرنے کا دھیان' آخر علم سے کورے رہ گئے۔ جوان ہوئے تو وقت کا بیشتر حصہ دل فریب صحبتوں میں بسر کیا۔ یاران طریقت نے اس شوق کو اور بھی چمکایا اور ثبات اپنے سرپرستوں کا دباؤ بالائے طاق رکھ کر بالکل ہی مطلق العنان ہو گئے۔ جب نصیحتوں کا عمل کارگر نہ ہوا تو پند کرنے والوں نے بھی تدبیل ڈال دی اور انہیں اُن کی طبعی حالت پر چھوڑ دیا۔ یہ ڈھرا کب تک چلتا؟ آخر کار زمانے نے نا مساعدت کا جال بچھایا۔ فطرت کا انتقام شروع ہوا۔ ثبات پر دنیا تنگ اور خواب تعیش کی بے ثباتی ظاہر ہونے لگی۔ افکار و آلام سے دم گھٹا، نکبت و فلاکت نے زور پکڑا اور انہیں چار و ناچار وطن مالوف کو خیر باد کہنا پڑا—

گھر سے نکلے تو دہلی کا رخ کیا۔ کیونکہ وہیں قیام و بہبود کی امید ہو سکتی تھی۔ آئے اور روزگار کے سلسلے میں دہلی ہی کے ہو رہے۔ خوبرویوں کی صحبت اور اُس پر طبیعت بھی رنگین اور شوخ واقع ہوئی تھی جس نے جذبات کو برانگیختہ کرکے شاعری کی طرف متوجہ کر دیا۔ وقتاً فوقتاً جو تاثرات و کیفیات طاری ہوا کرتے اُنہیں نظم کے سانچے میں ڈھلا کرتے۔ حسن طبیعت اور جودت فکر نے سہارا دے کر آگے بڑھایا مزاج میں رنگینی و ظرافت کی کمی نہ تھی جو اُن کے کلام منظومہ میں بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ ان کی شاعری بالکل صاف اور مفہوم غزل کو لئے ہوئے ہے۔ معشوقوں کے چونچلے، رسم الفت، رمز و کنایہ اور راز و نیاز کے عنصر سے کوئی شعر خالی نہیں۔ مختصر یہ کہ اپنی بساط کے موافق بہت خوب کہتے تھے۔ حافظہ اتنا قوی پایا تھا کہ کبھی کوئی بات فراموش نہ ہوتی تھی۔ اساتذہ کے ہزارہا اشعار برزبان تھے۔ آخر عمر میں اکتساب علم کا شوق بھی پیدا ہوا تھا۔ کلام کا مختصر نمونہ یہ ہے:—

کہتے ہیں تیرے خواب میں آنا نہ چاہئے
سوتا ہوا نصیب جگانا نہ چاہئے

شب کو جو میں نے زلف کو چھیڑا تو یوں کہا
مار سیہ کو ہاتھ لگانا نہ چاہئے

دیکھا مجھے تو ہو کے خفا غیر سے کہا
اس بزم میں ہر ایک کو آنا نہ چاہئے

کھل جائے گا وہاں کس و ناکس پہ راز عشق
اے دل، اس اضطراب سے جانا نہ چاہئے

اگلی لگاوٹیں بھی ذرا یاد کیجئے
دل لے کے میرا آنکھ چرانا نہ چاہئے

کٹتی ہے واں 'ثبات' زبان بات بات پر
محفل میں اُن کی ہونٹ ہلانا نہ چاہئے

جراح

غلام ناصر نام ' جراح تخلص ' اسم با مسمیٰ اور کشمیری الاصل تھا۔ فن جراحی میں کامل اور اپنے ہم عصروں پر فوق رکھتا تھا ۔ دہلی میں اسی فن کی بدولت شہرت تام حاصل تھی۔ ذوق سخن بھی تھا ۔ سناجاتا ہے طبیعت اچھی پائی تھی ۔ کلام دلکش پر از جذبات ہوتا ۔ استعداد علمی حاصل نہ ہونے پر بھی صف شعرا میں منہ بیٹھنے کی اہلیت رکھتا تھا ۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے ذہن رسا اور فکر بلند کی تعریف کی ہے ۔ مقطع میں اکثر اپنے پیشہ کی جانب اشارہ کرنے کا عادی تھا ۔ شاید انسان کو جن کاموں میں شغف ہوتا ہے تخیلات نظم بھی اُنہیں سانچوں میں ڈھل کر نکلتے ہیں ۔ صاحب گلشن بیخار نے اسے اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ "کبھی کبھی میرے یہاں بھی آتا تھا"۔ تذکرۂ گلشن بیخار کی ترتیب سے چند سال پہلے فوت ہوا ۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

اک دم نہیں ہے اس بت خورشید رو کو چین
پھرنے نے میں جیسے کوکب سیار گرم ہے
جراح ٹانکے دینے میں مت کر درنگ تو
اس واسطے کہ زخم مرے یار گرم ہے

جوش

رحیم اللہ عرف رحمو ' جوش تخلص - دهلی میں پیدا هوئے اور اسی خطۂ پاک میں عہد طفلی بسر کرکے جواں ہوئے - طبیعت حریت پسند واقع هوی توی - جہاں اور قیود و پابندیوں سے آزاد تھے وہاں تحصیل علم کی زحمت سے بے نیاز رہے - رسماً تعلیم و تعلم کا سلسلہ تو ضرور چھڑا مگر حضرت جوش نے اپنا سبق ذهن نشین کرنے کی کوشش نہیں کی - مختصر یہ کہ علم سے بے بہرہ رہے شاعری سے فطرتاً لگاؤ تھا - طبع موزوں کی امداد سے زمین شعر و سخن میں فکر رسا اور طبع سلیم کے جوهر دکھاتے تھے - ابتدا میں مرزا ندوی کو کلام دکھایا کئے - جب اُن کا انتقال هوگیا تو شیخ مصحفی کی خدمت فیض درجت میں حاضر هوئے جو اُن دنوں دهلی میں مقیم تھے —

' جوش ' نہایت آزاد منش ' یار باش اور بے تکلف آدمی تھے - مزاج میں فام چار کو جھجک نہ توی - اجنبیوں سے بہت جلد بے تکلف هوجاتے اور اس طرح هل مل جاتے گویا برسوں کی صاحب سلامت اور یارانہ هے - یہی بے تکلفی و بیباکی تھی جس کی وجہ سے هندوانہ تہواروں میں اپنے هموطن بھائیوں کی مسرتوں میں انہیں کی وضع بناکر انہیں کے دستور اور رسم و رواج کے مطابق خوشیاں مناتے - علی الخصوص هولی کے موقعہ پر ان کا جوش خرمی اپنی حد سے گزر جاتا - اور دوسرے آزاد هیاروں کی طرح شہر کے کوچہ و بازار میں غزل خوانی کرتے پھرتے - منہ پر عبیر و گلال ملا هوتا ' کپڑے

مختلف رنگوں میں شرابور ہوتے - دستار ہے تو خیر ورنہ اس کی بھی پروا نہیں ، اس تہوار میں شرم و حیا بالائے طاق رکھ دی جاتی ، غیرت و حمیت سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی اور گویا وہ اپنی ہستی کو بھول کر کسی اور ہی عالم میں چلے جاتے -

یہ سنہ ۱۸۹۳ ع تک دہلی میں زندہ و سلامت موجود تھے - بعض مقامی مشاعروں میں اپنا کلام پڑھ کر سناتے اور سخن فہموں سے داد خوش بیانی حاصل کرتے - سنہ ۱۸۹۳ ع کے بعد معلوم نہیں کب وفات پائی - دہلی میں رہے یا آوارہ مزاجی کسی اور طرف کھینچ لے گئی - کلام کا نمونہ یہ ہے :

طرف پر اپنے نظر کر تو ابھی لڑکا ہے
منہ مرادی سے نہ او دلبر مئے خوار لگا

میں* نے جو کہا تجھ بن کیا کیا نہ الم گزرا
بولے کہ ابے تیرا روتے ہی جنم گزرا

دریا مری آنکھوں سے نت جاری لہو کا ہے
بے درد تو کیا جانے ، کیا حال کسو کا ہے

چمن

گل محمد نام چمن تخلص - کشمیری الاصل تھا - دہلی میں رفوگری کی دوکان

---

* بعض تذکرہ نویسوں نے اس شعر کو صاحب مہر ، الم بن خواجہ مہر درد کے نام سے لکھا ہے -

تھی اور اسی پیشے سے روزی پیدا کرتا تھا - بعضوں نے شبہہ کیا ہے کہ چوں حرف شناس تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں اور اگر درست بھی ہو تو اس کے علم کی کل کائنات اتنی ہوسکتی ہے کہ غلط سلط طریقے سے اپنے اشعار لکھہ پڑھ لے - الله الله خیر صلاح - باوجود اس بے مقداری کے شعر وسخن کا دلدادہ تھا - بڑی کوشش اور سخت محنت سے قوت نظم پیدا کی تھی - بد ذوقی کی مساعدت سے ان پڑھ شاعروں کی صف میں بھی سب سے پیچھے جگہہ پائی - کہنے کو تو بہت کچھہ کہا ہوگا لیکن وہ کلام اس قابل نہ ہوگا کہ تذکرہ نویس بھلائی کے ساتھہ اس کا ذکر کرتے - ایک قدیم تذکرے میں تین شعر دستیاب ہوے جو یہاں نقل کئے جاتے ہیں - ان سے چوں کی پھیکی اور بے نکہت گل پاشیوں کا اندازہ ہوسکتا ہے : —

ہمارے چاک جگر پر ہو کیا کسی کو خیال
پھٹے میں پاؤں کسی کے دیا نہیں جاتا

ہوھ جس مہ نے زلیخا کے اڑاے خواب میں
ہم بھی اے ہمدم اسی کے دیکھنے والوں میں ہیں
یوں بھی پر ہیں چمن کے داغ تیرے ہجر میں
پھول جیسے اے سمن بر ان تیرے شانوں میں ہیں

حجام

عنایت الله، عرف کلو، حجام تخلص - مولد تو سہارن پور تھا لیکن دهلی میں عمر بھر قیام رہا جہاں موتراشی کا پیشہ کر کے اوقات

بسر کرتا۔ شاعری کا کمال شوق تھا۔ طبیعت بہت پاکیزہ پائی تھی۔ زمین سخن میں کہائے مضامین کے ایسے ایسے نزہت بخش باغ لگائے جو سدا بہار ہیں۔ اصلاح سخن ملک الشعرا مرزا رفیع السودا کے سپرد تھی۔ مزاج میں فقیری بہت تھی۔ مولانا فخرالدین سے ارادت باطن رکھتا تھا منگل اور جمعہ کے دن مولانائے موصوف کی داڑھی میں خضاب لگانے جاتا۔ مولانا فخرالدین بھی اس کا خیال فرماتے۔ ایک مرتبہ حجام کے حسن عقیدت سے خوش ہو کر ایک دستار اور تہہ بند عنایت فرمائی اُس دن سے اس کا لباس فقیرانہ ہو گیا۔ جب مکان سے نکلتا تو اپنے مرشد کا عطا کیا ہوا جامہ پہن لیتا۔ اِس کے محلے والے اِس کی بڑی عزت کرتے اور "شاہ صاحب" کے معزز لقب سے خطاب کرتے جس سے حجام کو روحانی خوشی حاصل ہوتی۔ تمام تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق اِس کی ذہانت و طباعی نازک خیالی اور بلند پروازی کی داد دی ہے شیخ مصحفی اپنے تذکرے میں یوں ذکر کرتے ہیں ––

> "اچھا شعر کہتا تھا اُس کے خیالات بڑے زیادہ باریک ہوتے تھے اور تمام دلی کے شعرا اُسے پسند کرتے تھے۔ اکثر اُس کے اشعار پر شاباش ہوا کرتی تھی۔ مقطع میں وہ اپنے پیشہ کا فخر بطور ظرافت اِس طرح بیان کرتا تھا کہ سامعین کو فریفتگی پیدا ہوتی تھی۔ خاص و عام اُس کو پسند کرتے تھے مولانا فخرالدین کی داڑھی میں منگل اور جمعہ کو خضاب لگاتا تھا مولانا نے جو اُس کے پیرو مرشد تھے، اُس کو دستار اور پوشاک دی تھی، وہی پہنتا تھا۔ اِس واسطے اُس کے ہم محلہ اُس کو شاہ جی کہتے تھے"

مصحفی دیوان صاحب کے حوالے سے صاحب "خمخانۂ جاوید" لکھتے ہیں کہ حکیم عنایت اللہ کی عمر سنہ ۱۱۹۳ھ میں ۳۵ برس کی تھی اور اُن کے تذکرے کی ترتیب سے بہت پہلے اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے —

روز رخسار کے لیتا ہوں مزے خوبوں کے
بہتر اِس شغل سے 'حجام' ہنر کیا ہوگا

دینا نظر اپنا تو ستمگر نہیں آتا
پہ وصل ترے ' سو یہ میسر نہیں آتا

جاتا ہے اُس گلی میں بصد اضطراب دل
اپنی طرح تباہ نہ کرے گا خراب دل

خط آنے سے بھی اپنی رسائی نہیں ہے واں
حجام کس طرح سے ملیں ' کیا ہنر کریں

آج کل کے خوبرو دیکھے تو ہیں یہ سب بچے
اِن تلک حجام ہی پہنچے نہ یہ حجام تک

دیکھ عاشق کی ترے رسوائیاں
عشق کی لوگوں نے قسمیں کھائیاں

رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی
بلا حجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو

ہے جی میں کہ اک روز میں اُن آنکھوں سے پوچھوں
بچتے نہیں کس واسطے بیمار تمہارے
اِس کاوش مژگاں کا گلہ حجام سے عبث ہے
یہ آنکھوں پہ بوئے ہوئے ہیں خار تمہارے
اُس شوخ کے کوچہ میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک روز یہ اوزار تمہارے

آنکھوں کو اُس کی شاعر جس دم غزال باندھے
پھر ایسے وحشیوں کو کس کی مجال باندھے

کل یہاں، حجام، سب کا صدقہ اترتے تھے سر
آج اُس کوچے میں اُن کی بھی حجامت ہو گئی

حجام

نام معلوم نہ ہوسکا حجام تخلص تھا۔ دہلی میں مدرسۂ غازی الدین خاں سے ملی ہوئی موتراشی کی دوکان تھی۔ شاعری کا نہایت شائق و فریفتہ تھا۔ جب خالی بیٹھتا تو فکرسخن میں غرق ہوجاتا اگرچہ اس کی بے علمی کی نسبت خلاصہ تحریر نہیں ہوا ہے مگر بعض واقعات کی بنا پر اُسی محض تصور کرلیا

دور از قیاس نہیں - اولاً - اُس عہد میں پیشہور طبقہ جاہل اور ان پڑھ ہوا کرتا خصوصاً اپنی پیشہ اختیار کرنے والے جنہیں کسب معاش کی فکریں انتساب علوم کا موقع ہی نہ دیتیں ' اُن کے تربیت کرنے اور پالنے والے ابتدا سے آبائی پیشہ کی تعلیم پر لگاتے - اگر پڑھانے کی جانب توجہ بھی ہوئی تو کلام اللہ کا پڑھ لینا کافی خیال کیا جاتا اور معنی و مطالب سمجھنے کی چنداں ضرورت محسوس نہ ہوتی کیوں کہ اُن کے نزدیک ایصال ثواب کو اتنا ہی کافی تھا -
اس کے علاوہ حجام کے کلام سے بڑی بے شاعری نمایاں ہے - مولوی صاحب " بےنظیر و بدر منیر" نے اپنے تذکرے میں اس کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے اور مندرجۂ ذیل لفظوں میں اُس کے حالات پر روشنی ڈالی ہے —

" حجام تخلص است در شاہ جہاں آباد متصل مدرسۂ غازی الدین خاں دکان دماغ را گرم داشتہ مضمون تراشی می نماید لیکن ازایں شعر او معلوم شد کہ کلامش بے اصلاح است در موشگافی معنی قصر دارد " —

اور تذکرے اس کے حالات اور کلام سے خالی ہیں مجبوراً اسی ایک شعر پر کفایت کی :—

کم کیا زر یہ 'حجام' نے شیخ کی داڑھی کو قصر کرگیا

حسامی

ان کا نام مرزا حسام الدین حیدر تخلص حسامی تھا - ان کے والد مرزا خانی کے نام سے مشہور ہیں - دہلی مولد و مسکن ہے - ان کا خاندان کسی زمانے میں نہایت ذی ثروت اور صاحب اقتدار تھا - لیکن زمانے کی نا مساعدت سے عروج مبدل بہ زوال ہوا املاک کے برخلاف اخلاف طرح طرح

کے افکار اور پریشانیوں میں مبتلا ہونگے۔ خود 'حسامی' کی عمر کا آغاز مصائب و شدائد سے ہوا۔ بچپن ہی سے فکر معیشت نے سر اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ پورا شباب بھی نہ آنے پایا تھا کہ قوت بازو سے قوت لایموت حاصل کرنے پر مجبور ہوے اسی وجہ سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوتے ہی منقطع ہوگیا اور 'حسامی' علم کی جانب سے بے نصیب رہے۔ چارو نا چار جلا کاری اور داستان گوئی کو ذریعہ معاش بنایا۔ موزونئی طبع کے باعث سے کاہ گاہ شاعری بھی کرتے اور اس فن خاص میں خدا بخش خاں 'تنویر' کے شاگرد تھے جن سے 'تنویر' (آن پڑھ شاعر) نے ابتدا میں اصلاح لی تھی —

'حسامی' کی طبیعت شاعری میں بری نہ تھی صاف صاف شعر کہتے تھے۔ چونکہ فن موسیقی سے بھی شوق تھا اور گلا اچھا پایا تھا، اس لئے اکثر اپنی تصنیف کی ہوئی غزلیں گنگنایا کرتے۔ نتیجہ آواز کا درد، ٹھیٹھ زبان کی سادگی اور مفہوم کے سہل ہونے سے کلام کا رنگ دونا ہوجاتا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بہت سی غزلیں زبان زد خاص و عام ہوگئیں۔ اور خوش گلو چھوکرے دہلی کی گلیوں اور بازاروں میں گاتے پھرتے۔ 'حسامی' سنہ ۱۳۰۰ھ میں صحیح و سالم موجود تھے اور اُس وقت ان کی عمر ۵۲ سال کی تھی ان کے نتیجۂ فکر کا حاصل ملاحظہ ہو:—

یا رب! ہمارے کام تو سارے سنوار دے

تیرے سوا ہے کون جو دل کو قرار دے

ظالم نے ایسے تخت کو برباد کر دیا

یاں موسم خزاں ہے، تو جلدی بہار دے

لوٹی آئی ہے اس طرح مخلوق ہند کی
دھوکا کے تیغ سے کہا۔ سب تار تار دے

کیا تم سے کہوں لطف ہے جو عشق صنم میں
پر اتنی برائی ہے نہ آرام نہیں ہے
سر جاؤں گا گُرت گُپتکے پوائیں ہجر میں تیرے
رسواے جہاں کرنا مرا کام نہیں ہے
کر ذبح مجھے شوق سے اے کافر بد کیش
ترپوں تہہ خنجر یہ مرا کام نہیں ہے

اک لحظہ چین دل کو نہ اک دم قرار ہے
کیا جانے تیغ کس کی لگی، کس کا وار ہے

نکل جاے کہیں یہ جان تن سے چہٹوں فرقت کے میں رنج و محن سے

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں دل کو اپنے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، مرا غم سے سینہ نگار ہے
ولے شہر دھلی یہ تیا چمن کہ تہا سب طرح کا یہاں امن
وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا، فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے، کہا یہ تو قابل دار ہے
شب و روز پہولوں میں جو تلیں، وہ یوں خار غم سے نگار ہوں
ملے طوق قید میں جب اذیں، کہیں بدلے گل کے یہ ہار ہے

جو سلوک اوروں سے کرتے تھے، وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے
یہ زمانہ ہے وہ برا فلک! چلو بچ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں، نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے
کیا 'حسامی' ڈر تجھے حشر کا، جو خدا رہے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا، وہی تیرا حامی و یار ہے

حسین

سید صادق علی عرف چھنگا صاحب 'حسین' تخلص۔ سنہ ۱۲۹۰ھ کے قریب لکھنؤ سبزی منڈی میں پیدا ہوئے اُس زمانے میں اُن کے والد میر حسن مرحوم اپنی سسرال میں مقیم تھے۔ جناب 'حسین' سادات نقوی سے ہیں خدا کے افضال و کرم سے ددھیال و ننھیال میں نواب آصف الدولہ کے عہد سے اب تک ہر فرد عالم و مجتہد ہوتا آیا ہے چنانچہ مولوی سید دلدار علی صاحب مجتہد ملقب بہ غفران مآب دور آصفی کے نامور مجتہد اور عالم جید ہیں جن کی سعی و کوشش سے اکثر منہیات شرعی جو اُن دنوں جاری تھے موقوف و معدوم ہوئے اور صدہا اصلاحات ظہور میں آئیں۔ جناب مرحوم کی یادگار ایک امام باڑے کی صورت میں ہنوز موجود اور زیارت گاہ انام ہے —

اُن کے صاحبزادے حضرت سلطان العلماء السید مولوی سید صادق علی مرحوم ملقب بہ رضوان مآب امجد علی شاہ کے دور حکمرانی میں قاضی القضاۃ تھے۔ صرف انہیں حضرات پر موقوف نہیں خاندان کے اکثر افراد

اپنے اپنے عہد کے عالم جید ہوئے ہیں —

جناب حسین کے دادا سید سجاد حسین مغفور جائس کے رئیس اور ذی اثر بزرگ تھے جو خاندانی نزاعات کی قربان گاہ پر ذبح کردئے گئے۔ حسین صغر سنی میں اپنے والدین کے ہمراہ سفر عراق و زیارات عتبات عالیات سے بھی مشرف ہو چکے ہیں اور سنہ ۱۲۹۵ سے سنہ ۱۳۰۲ ھ تک کربلائے معلی میں قیام رہا ہے۔ اس مدت میں سفر میں ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ عربوں اور عجمیوں کے بچوں میں میل جول نے تھوڑی بہت فارسی سمجھنے اور بولنے کی قدرت پیدا کردی۔ آٹھ نو سال عراق میں رہنے کے بعد سنہ ۱۳۰۲ ھ میں جب لکھنؤ واپس آئے تو بجائے لکھنے پڑھنے کے مروجہ اشغال کنکوا، بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی وغیرہ وغیرہ کا شوق پیدا ہوا جو حقیقتاً حضرات لکھنؤ کی تباہی و بربادی کا راز ہے اور یہی ملعون چیزیں حسین کی اُمیت کا موجب ہوئیں۔ غضب یہ ہوا کہ والدین کے لاڈ پیار نے تھوڑی سخت گیری بھی گوارا نہ کی۔ انجام کار ایسے خاندان کا شخص جس کے گھرانے میں علم و فضل کا بے پایاں سمندر موجیں مارا کرتا تھا اُمی محض رہ گیا —

سنہ ۱۳۰۹ ھ میں حسین کے سر سے اُن کے والد کا سایہ اُٹھ گیا اور انہیں خانگی جھگڑوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ ایک برس تو کسی نہ کسی طرح بسر کی مگر طبیعت زچ تھی۔ سنہ ۱۳۱۰ ھ میں نواب میر مہدی حسین ماہر مرحوم کی صاحبزادی حبالۂ نکاح میں آئیں اور یہ اپنا ننھیالی مکان چھوڑ کے پاٹا نالہ اُٹھ گئے اور سنہ ۱۳۲۷ ھ میں سہری منڈی والا مکان فروخت کر دیا —

انہیں اول اول سنہ ۱۳۰۸ ھ میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس

وقت سن شریف اندازہ انیس برس کا تھا۔ چوں کہ مجتہدین کے خاندان سے ہیں، علما و فضلا کی عالمانہ مجلسوں سے فیض پایا ہے لہذا طبیعت پر مذہبی رنگ غالب ہے اور آغاز شاعری نوحہ سلام سے ہوا۔ پہلا شعر جو طبیعت نے نظم کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا یہ ہے —

ذبح کے ہنگام ایسی پیاس تھی شبیر کو
چلتے چلتے حلق پر بے آب خنجر ہو گیا

جوانی کی فصل، امنگوں کا زمانہ، جدھر طبیعت آئی دریا کی روانی کی طرح آئی — شاعری کا شوق پیدا ہوتے ہی نظم کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ اصلاح کے لئے کہیں دور جانا نہ تھا، برادر نسبتی سید معصوم کاظم صاحب جاوید مرحوم موجود ہی تھے، جن کی شاعری نے استادی کا درجہ حاصل کرلیا تھا، کچھ عرصہ تک نوحہ و سلام کی مشق ہوتی رہی، پھر رفتہ رفتہ غزل گوئی کی طرف میلان طبع ہوا۔ اسی زمانے میں مثنوی نظم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور ساتھ ہی دو مثنویوں کی طرح ڈالی جو طبیعت پھر جانے کی وجہ سے نا تمام رہ گئیں پھر بھی ہزاروں بیتیں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں —

زور طبیعت خدا داد ہے، اصناف شاعری میں جس طرف عنان توجہ پھرتی ہے زمین نظم میں مضامین دل نشین کے باغ کھلاتی چلی جاتی ہے۔ جدت طرازی کا پورا خیال رکھتا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اکثر موقعوں پر اپنے کلام کو دیگر شعرا سے بچا کر نکل جاتے ہیں۔ کلام کی پختگی پر بسا اوقات پڑھے لکھے شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ اجنبی ہرگز باور نہ کریگا کہ ایک اُمی شاعر ایسے اشعار نظم کرنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ اس سے بھی عجیب تر یہ کہ حسین محض ریختے ہی میں طبع آزمائی نہیں کرتے

فارسی زبان میں بھی درفشاں ہوتے ہیں - ان کے فارسی نوحے لکھنؤ کی بعض انجمنوں میں پڑھے جاتے ہیں - ایک نوحہ بہت مشہور ہے جس کا مطلع یہاں لکھا جاتا ہے - ایک امی شاعر کی ذہانت و ذکاوت قابل داد ہے : —

داد ہاتف این ندا باصد بکا در کربلا

آہ! کشتہ شد غریب کربلا در کربلا

انھیں مشاعروں میں شرکت کرنے کا شوق کبھی پیدا نہ ہوا اور جہاں تک دریافت ہوسکا ہے یہ شروع سے اب تک کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوے - کلام عاشقانہ کو اصل شاعری نہ سمجھا جو کچھ نظم کیا محض تراوش طبع کا نتیجہ ہے ورنہ دلی ذوق مرثیہ نگاری کی جانب مائل ہے اور یہ اسی وادی کے مرد ہیں - ۲۶ - ۲۷ سال سے مرثیہ کی مشق جاری ہے ' اب تک متعدد مرثیے نظم ہوچکے ہیں جن سے صرف دو مرثیے احباب اور اہل مطابع کے اصرار سے چھپوائے جو چھپتے ہی مقبول عام ہوے اور اکثر سوز خوانوں کی زبانوں پر ہیں - مطبوعہ مرثیوں کے پہلے مصرع یہ ہیں : —

آج مقتل میں عجب بے سرو ساماں ہیں حرم

یہ مرثیہ نہایت مقبول ہوا - سوز خوانوں میں کوئی فرد ایسا نہ ہوگا جس نے اس مرثیہ کو یاد کر کے مجلسوں میں نہ پڑھا ہو - دوسرا مرثیہ جو طبع ہوکر مطبوع خاص و عام ہوا اس کا مطلع یہ ہے

قتل جب ہو گئے سلطان مدینہ رن میں

ان دونوں مرثیوں کے سوا ایک مجموعہ مناجات " مقبول جہاں " کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں ان کے چھوٹے بھائی سید مجاور حسین تنہا کی بھی ایک مناجات شامل ہے -

یوں تو ان کے پڑھنے کی مجلسیں بہت ہیں لیکن ذکر کے قابل وہ سالانہ مجلس ہے جو ۲۹ ماہ رجب کو امام باڑہ میر باقر سوداگر مرحوم واقع جوہری محلہ دس بجے دن کو منعقد ہوتی ہے - اس مجلس میں عام شائقین کے علاوہ خاص خاص طبقے کے لوگ مثلاً علما فضلا اور شعرا بڑے ذوق و شوق سے شرکت فرما کر اِن کے نو تصنیف کلام سے لطف اندوزی حاصل کرتے ہیں -

سنہ ۱۳۲۳ ھ میں اِن سے اور حضرت جاوید مرحوم سے کسی بات پر چشمک ہوگئی اور یہ میر علی محمود صاحب عارف مرحوم کی خدمت میں بغرض اصلاح حاضر ہوے صرف دو مرثیے دکھانے پائے تھے کہ سنہ ۱۳۲۴ ھ میں عارف مرحوم کا انتقال ہوگیا اُس وقت سے ان کا کلام کسی استاد کے اصلاح کا ممنون نہیں - جو کچھہ کہتے ہیں طبع سلیم کی استعانت سے کہتے ہیں -

سید خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج اِن کے مخصوص مداحوں میں ہیں اور ان کے کلام کو پسندیدہ نظر سے ملاحظہ کرتے ہیں - بعضوں کا بیان ہے کہ ایک بھری مجلس اور عام مجمع میں کسی بند پر خوش و مسرور ہو کر فرمایا کہ " آپ تو فخر ہندوستان ہیں " ایک اُستاد زادے کی مبالغہ آمیز تعریف حسین کے واسطے یقیناً تمغہ امتیاز ہے اور یہ ہمیشہ اس جملے پر فخر کرتے رہیں گے - اس میں شبہہ نہیں کہ حسین کی بے علمی نے اس جملے کو بڑی حد تک صحیح ثابت کر دکھایا - ایک یہ امر بھی قابل تذکرہ ہے کہ حسین اور اُمیوں کی طرح صرف شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر گر بھی ہیں اکثر تلامذہ اِن کے فیضان سخن سے فیضیاب ہوتے ہیں - پر گوئی کا یہ عالم ہے کہ ہمہ وقت بحر فکر اُبلتا ہے بسا اوقات بیس بیس پچیس پچیس شعروں کی غزلیں آن واحد میں تصنیف کرکے شاگردوں کو بخش دیتے ہیں جو مقامی مشاعروں میں پڑھی جاتی ہیں اور اہل ذوق بے اختیار ہو ہو کر داد دیتے ہیں

سنہ ۱۲۳۷ ھجری میں ان کی انیس زندگی [زوجہ] نے قضا کی جس سے انہیں نہایت قلق ہوا اور آغاز پیری میں اکثر امور کی تکلیف ہوگئی۔ اگرچہ ان کی ایک صاحب زادی نے خانگی کاموں کا ذمہ لے کر بہت کچھہ سبک بار کردیا ہے پھر بھی یہ اکثر پریشان نظر آتے ہیں۔ مجھہ سے میرے ایک مہربان نے اِس موقع کے واسطے ایک لطیفہ بیان کیا تھا جو دل چسپی سے خالی نہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ بعض موقعوں پر جناب 'حسین' نے نہایت بے تکلفی اور سادگی سے فرمایا ہے کہ " بھئی! جب سے بیوی مریں شاعری کا مزہ جاتا رہا "۔ پوچھنے والوں نے دریافت کیا " حضرت! آپ کی شاعری میں اُن معظمہ کو کیا دخل تھا ؟ " اِرشاد ہوا " میں تو اُمی محض ہوں وہ مرحومہ لکھہ پڑھہ سکتی تھیں رات برات جب کچھہ نظم کرتا اُن سے فوراً لکھوا لیتا۔ اُن کے مرنے سے یہ آرام مٹ گیا اب شب کو جتنے بند منظوم ہوتے ہیں صبح ہوتے ہوتے کئی مصرعے حافظہ سے اُتر جاتے ہیں۔ اور اُنہیں یاد کرتے وقت طبیعت زچ ہوجاتی ہے —

حسین کے پانچ بھائی بہن تھے اور سب نے رحلت کی۔ اب ایک آپ اور دوسرے چھوٹے بھائی سید مجاورحسین تہنا بقیہ حیات ہیں اور شاہی پنشن جو " پنشن خاندان مجتہد " کے نام سے مشہور ہے اوقات بسری کا ذریعہ ہے - اِن کے بہت سی اولادیں ہوئیں لیکن یکے بعد دیگرے سب فوت ہوگئیں صرف تین صاحب زادیاں زندہ ہیں جن سے اِن کا غم زدہ قلب تسکین حاصل کرتا ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ حسین کے اور تمام بھائی پڑھے لکھے تھے' صرف یہی دولت علم سے محروم رہے۔ جناب تہنا کی معلومات علمی بقدر ضرورت کافی ہے ہرچند خاندان والوں کی طرح تبحر حاصل نہ ہوا مگر حسین کی طرح حرف نا آشنا بھی نہ رہے شعر اچھے کہتے ہیں اور اس فن میں جاوید مرحوم کے شاگرد ہیں —

اب حسین کے وہ اشعار ملاحظہ ہوں جس میں بعض الفاظ کی ترمیم سے استاد نے حسن و رفعت پیدا کردی ہے —

حسین: لوکری برق تبسم، لو نشیمن جل گیا
اب ذرا گلشن میں دیکھو تو چراغاں ہوگیا

اصلاح: لوگری برق تبسم، لو نشیمن جل گیا
باغ میں تم شب کو کیا آئے چراغاں ہوگیا

دوسرا مصرع سست تھا اُستاد نے تھوڑی ترمیم کر کے شعر کو چمکا دیا اور وہ نقص جو شاہد معنی پر نقاب ڈال رہا تھا دور ہوگیا —

حسین: کس طرح سے چاک اے جوش جنوں اس کو کروں
طوق جو میرے گلے میں تھا گریباں ہوگیا

اصلاح: اب لحد میں تربت میں گویا حشر تک یہ ساتھ ہے
طوق جو میرے گلے میں تھا گریباں ہوگیا

پہلے مصرع کی بندش بدنما تھی "اِس کو کروں" کا ٹکڑا ذہن کو غلط راستے پر لگا رہا تھا اُستاد نے مصرع بدل کے اس سقم کو دور کردیا —

حسین: روح تازہ تھی مری، میری وفا کا ذکر تھا
تم اُٹھے تربت سے گویا ختم قرآں ہوگیا

اصلاح: روح تازہ تھی مری، میری وفا کا ذکر تھا
تم جو اُٹھے تربت سے کچھ اور ساماں ہوگیا

اِس شعر کا مصرعۂ ثانی بدل کر شعر کو بلند کردیا —

حسین: حدت خون کف پا سے لگی ہے میرے آگ
اب چراغ شام ہجراں نجد کا ہر خار ہے

اصلاح: قیس کے خون کف پا نے لگائی ہے وہ آگ
اب چراغ شام ہجراں نجد کا ہر خار ہے

مصرعۂ اول کی ترمیم نے ضرورت شعر کو پورا کردیا —

حسین : غیظ سے دیکھو مجھے قبضے پہ کیوں رکھتے ہو ہاتیہ
ہر شکن ابرو کی میرے واسطے تلوار ہے

اصلاح : غیظ سے دیکھو فقط ' قبضے پہ کیوں رکھتے ہو ہاتیہ
ہر شکن ابرو کی میرے واسطے تلوار ہے

اِس شعر کے پہلے مصرع سے [مجھے] کا لفظ نکال کے [فقط] بنا دیا اور یوں (میرے) اور (مجھے) کا نا موزوں تقابل رفع ہوگیا —

حسین : بزم ہو' کوچہ ہو' ہم سے عاشقوں کی بھیڑ ہو
تم سا یوسف ہے جہاں وہ مصر کا بازار ہے

اصلاح : کوہ ہو ' جنگل ہو' کوچہ ہو کوئی بازار ہو
تم سا یوسف ہے جہاں وہ مصر کا بازار ہے

اس شعر کا پہلا مصرع کمزور تھا اُس کو دو لفظوں کی اصلاح سے قوی کر دیا —

حسین : آج اُس کی ہوگئی انجام غفلت پر نظر
موت کی جو نیند سویا ہے' وہی ہشیار ہے

اصلاح : محو نظارہ ہے چشم زخم ' قاتل ہے قریب
موت کی جو نیند سویا ہے وہی ہشیار ہے

اس شعر کے پہلے مصرع کو بدل کر زور معنویت پیدا کردیا —

حسین : امتحاں میں کرچکا ' کم مشق ہے ناوک فگن
کوئی ناوک دل میں ہے اور کوئی دل کے پار ہے

اصلاح : اِس سے ثابت ہے کہ ہوتی ہیں جفا کی بھی حدیں
کوئی ناوک دل میں ہے اور کوئی دل کے پار ہے

حسین کے اس شعر کا پہلا مصرعہ بدلا گیا اور اُس سے جو معنوی لطافتیں پیدا ہوئیں وہ اہل فہم سے پوشیدہ نہیں —

حسین کی طبعیت فی البد یہ گوئی میں بھی عاری نہیں - ایک مرتبہ کا ذکر ہے جاوید مرحوم اپنے دوات خانے میں بیٹھے تھے - چاروں طرف شاگردوں کا حلقہ بعینہ اس طرح تھا جیسے ماہ کے گرد ہالہ - حسین بھی حاضر صحبت تھے - شعر و سخن کا چرچا تھا - ناگاہ جاوید مرحوم کے ذھن میں ایک مصرع آیا اور انہوں نے اُس پر مصرع لگانے کی فکر کی - سوئے اتفاق ' طبعت حاضر نہ تھی جیسا چاھتے تھے ویسا مصرع سمجھہ میں نہ آیا اور اپنے شاگردوں کی طرف متوجہ ھوکر فرمایا " بھئی ! اس وقت ایک مصرع ذھن میں آیا ھے ' تم لوگوں میں جو کوئی اس پر سلام کا چست مصرع لگائے گا اُس کا منھہ میٹھا • کروں گا اور اُس کے بعد یہ مصرع پڑھا —

جب ھوئی زنجیر ھلکی ' اور کچھہ بھاری ھوئی

شاگردو نے طبع آزمائی شروع کی ھر ایک نے بقدر استعداد مصرعے لگا کے سنائے لیکن جاوید مغفور جیسا مصرع چاھتے تھے ویسا مصرعہ کسی کا نہ تھا سب سے آخرمیں حسین نے اپنا مصرع پڑھا - اُسے سنتے ھی جناب جاوید پھڑک گئے اور زانو پر ھاتھہ مار کر (یہ مرحوم کی جبلی عادت تھی) فرمایا - بیشک یہ مصرع میری طبعیت کے موافق ھے اور اُسی وقت شیرینی منگا کر عنایت کی جو حسین نے وھاں حاضرین پر تقسیم کردی - مصرع یہ ھے —

راہ چلنے سے کہیں کڑیاں ' بڑھا عابد کا ضعف
جب ھوئی زنجیر ھلکی ' اور کچھہ بھاری ھوئی

• جاوید مرحوم شاگردوں کی حوصلہ افزائی کے خیال سے ایسے لطیفے کہا کرتے تھے

حسین کا بیان ہے ' جو دنوں یہ مرثیہ جس کا مطلع ہے —

یہ دن وہ ہیں کہ سبط پیمبر سفر میں ہیں —

نظم کر رہا تھا اور تمام کرنے کی کوئی عجلت تھی ' جب سلسلۂ نظم انچاسویں بند تک پہنچا جہاں امام مظلوم جناب سکینہ کو اُن کے شش ماہے بھائی جناب علی اصغر کی شہادت کی خبر دینے کے بعد تسلی و تشفی دے رہے ہیں تو بند کے پانچویں مصرع پر مصرع نہیں لگتا تھا - جو مصرعے سوجھ میں آتے وہ میزان پسند میں پورے نہ اُترتے - مصرعہ یہ ہے —

ایذائیں سو طرح کی ہیں دنیائے زشت میں

بہت غور و خوض کیا کوئی رخ ذہن نشین نہ ہوا - آخر اسی الجھن میں آنکھ لگ گئی - خواب میں ایک بزرگ صورت کو دیکھا کہ ان سے ارشاد فرماتے ہیں " اتنی فکر کیوں ہے ' اس مصرعے کو یوں کیوں نہیں نظم کرلیتے -

محسن کے ساتھ کھیلتا ہوگا بہشت میں

چنانچہ صبح بستر سے اُٹھتے ہی انہوں نے اس الہامیہ مصرعہ کو لکھوا کر اُس بند کو یوں پورا کیا —

دادی لئے ہیں گود میں ' کرتی ہیں اُس کو پیار
یاں سے زیادہ چین میں ہے اب وہ شیرخوار
واں دھوپ ہے ' نہ لوں ہے ' نہ دکھ ہے ' نہ انتشار
ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں ' ہیں نخل سایہ دار
ایذائیں سو طرح کی تھیں دنیائے زشت میں
محسن کے ساتھ کھیلتا ہوگا بہشت میں

اِن کی خداداد طبیعت کہیں عاجز نہیں - ہر طرح اور ہر زمین میں

لل کا ریاں کرتے ہیں ۔ طبیعت کا میلان زیادہ تر مرثیہ و سلام کی طرف ہے ۔ ایک مرثیہ جو جاوید و عارف کے انتقال کے بعد نظم کیا ہے اس میں ایک مقام پر طوفان نوح کا ہولناک نقشہ کھینچ کر بہر طبیعت کی طغیانیاں پیش کی ہیں ۔ تخیل کا جزرومد دیکھنے کے قابل ہے ۔ مرثیہ کا مطلع ہے : —

اُمت کے ہاتھ کون نبی شاد ماں رہا

چلہ بلہ ملاحظہ ہوں : —

جس جس جگہ تری ریت وہاں دھارے ہوگئے
بہتے ہوے حباب بھی سیارے ہوگئے

ذرے زمین کے ' ٹوٹتے ہوے تارے ہوگئے
ابھرے رہے جو نخل وہ نوارے ہوگئے

ملتی تھیں موجیں ' عرش معلی کے کاخ سے
کوپل کے بدلے دھار نکلتی تھی شاخ سے

تھا جو کہیں اتار زمیں کا ' کہیں چڑھاؤ
پانی کا اس سبب سے نہ تھا ایک سا بہاؤ

گھیرے ہوے میں تھا ' خس و خاشاک کا حباؤ
اور زور تھا جہاں پہ وہاں کوہ بھی تھے ناؤ

پتھر بھی انقلاب نیا اک دکھا گئے
مغرب کے جو پہاڑ تھے مشرق میں آگئے

میداں سارے غرق تھے اور سبزہ زار غرق
کیا ذکر ہے مکانوں کا ' تھے کوہسار غرق

بڑھتا جوا ور رہوتی جہنم کی نار غرق

المختصر تھی ' ہستی نا پائدار غرق

یہ وجہ تھی ' جو موت ہر اک کو پسند تھی

راہ عدم نہ ہوتی ' تو ہر راہ بند تھی

ڈوبے ہوئے تھے آب میں اس طرح کوہسار

جس طرح سنگریزے ہوں کچھ تہ میں آشکار

تھی ہر خدا محیط کیا موجیں تھیں بے قرار

تھے مچھلیوں کے واسطے گرداب کے حصار

ٹھہرا رہا تھا مہر ' بلندی سے آب کی

پانی کو ناپتی تھی ' کرن آفتاب کی

مذکورہ بالا بندوں سے حسین کی رفعت تخیل کا اچھا اندازہ ہوتا ہے اور اس اُمی شاعر کی قدرت نظم تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ ایک اور مرثیہ جو جناب عون و محمد پسران جناب زینب کے حالات میں تصنیف فرمایا ہے جس کا مطلع اس مصرع سے شروع ہوتا ہے -

دو چاند جب طلوع ہوئے خیمہ گاہ سے

گھوڑوں کی تعریف میں اشہب قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں -

اسپ اُڑ کے چمکے تو سیارے ہوگئے

سرعت بڑھی تو ٹوٹتے ہوئے تارے ہوگئے

سلگی ہوئی ہوائیں کے دو دھارے ہوگئے

اور منہ سے کف اُڑایا تو فوارے ہوگئے

اِن کی ضیا سے کم ہے ضیا آفتاب کی دائیں تھیں اور دونوں کی دھاریں میں آب کی

یہ حکم اپنی جا سے ہلاوں ' تب یہ کہاں تدوانو ذرا ہوں بائیں تو ہوں تیر سے رواں

سو بار ہو چکا ہے زمانے میں امتحاں مرکب یہ راکبوں کے ہیں ایسے مزاج داں

لشکر کی سیدھ باندھ لی پا کر ارادوں کو
دو پریاں لے کے اُڑ گئیں شہزادوں کو

ان کا ایک معرکہ آرا مرثیہ ہے

روضۂ احمد مرسل سے جدا خواں ہو میں

جس میں انہوں نے تمام ناظموں کے خلاف یہ جدت طرازی کی ہے کہ جناب امام حسین کا سفر مدینے سے مکے اور مکے سے کربلا تک جاڑوں میں فرض کرتے ہوئے موسم برودت کی تصویر کشی کی ہے - اگرچہ یہ جدت خلاف واقع ہے تاہم حسین کی مضمون طراز طبیعت کا آئینہ ضرور ہے - جا بجا صنعت مبالغہ نے بندوں کو سج کر دلہن بنا دیا ہے - چند بند یہ ہیں -

برف باری سے بیاباں کا ہے سبزہ پامال
پالا پڑنے سے ہیں ٹھٹھرے ہوئے جنگل کے نہال
اُوس میں بھیگ کے نرگس کا برا ہے احوال
بیل جو باغ میں ہے اُس پہ ہے فالج کا خیال
گر بشر کیا تھیں ہزاروں کی تو ہوں تن نیلے
آج تک ہیں اُسی دن سے لب سوسن نیلے

اُوس پڑنے سے ہے بھیگی ہوئی صحرا کی زمیں
طائر دل کو بھی برودت سے کہیں چین نہیں
انقلاب ایسا یہ آیا ہے تہہ چرخ بریں
بلبلیں بیٹھی ہیں لالے کی انگیٹھی کے قریں
بال و پر اُوس سے بھیگے ہوں تو راحت کیسی
آج گلشن میں برودت ہے حرارت کیسی

حکما کو بھی ہے، اب مہر کی حدت میں کلام

دھوپ بھی چاندنی کی طرح سے دیتی نہیں کام

برف اطراف بیاباں کی زمیں کو ہے تمام

سر کھلے رہتے ہیں فواروں کو کیوں ہو نہ زکام

آب میں تری جو روانی، وہ تھمی جاتی ہے

دھار ہر ایک برودت سے جمی جاتی ہے

برف اس حد کی گری ہے کہ وہ صحرا ہے سفید

کوہ اسود تھا جو پہلے، وہی سارا ہے سفید

منزلوں دیکھئے میدان میں سبزا ہے سفید

سنگ مرمر کی طرح سامنے دریا ہے سفید

پانی جملے سے سمندر میں کہاں جوش ہے آج

جو شجر بن میں ہے گویا وہ کفن پوش ہے آج

جانور جانوں سے بیزار نظر آتے ہیں

برف کے دشت میں انبار نظر آتے ہیں

طرفہ دنیا کے کچھ آثار نظر آتے ہیں

یعنی باور کے اشجار نظر آتے ہیں

بلبلیں باغ میں بیکار ہوں اب روتی ہیں

برگ ہیرے کے جو ٹکڑے ہیں تو گل موتی ہیں

حسین کی طبع خداساز نے مرثیہ میں جو خیال آرائیاں کی ہیں اوپر لکھے ہوئے بندوں سے ظاہر ہو چکیں اب رباعیوں میں جودت فکر کے نمونے پیش ہوتے ہیں - کیوں کہ مرثیہ گو کے واسطے رباعی تصنیف کرنا اور آغاز ذاکری میں پڑھنا ضروری چیز خیال کیا جاتا ہے —

ہو کر یہ مجسم آج ایمان آیا | یا گھر میں خدا کے شیر یزداں آیا
کعبہ میں ہیں دست مصطفی پر حیدر | یا ہے سر رحل، کوئی قرآن آیا

دے سکتی نہیں دل کو بحالی دنیا | ہے روز ازل سے دیکھی بھالی دنیا
جیسے کہ غم و رنج سے خالی ہے بہشت | بس ہے یونہیں آرام سے خالی دنیا

بس کر چکیں عالم کے نظارے آنکھیں | بدتی تھیں جوانی کے سہارے آنکھیں
پیری میں یہ خود بھی ہیں چراغ سحری | ہیں صبح کے ڈوبتے ستارے آنکھیں

مٹی ہیں، لطافت نہ ہو جن پیکروں میں | بے سود ہیں، رنگت نہ ہو جن پھولوں میں
تازہ نہ ہو روح، اک ذرا بھی جن سے | کس کام کے، نکہت نہ ہو جن پھولوں میں

بے کار سمجھ برا بھلا کرتے ہیں | جو کچھ کہتے ہیں بے خطا کہتے ہیں
میں نظم کروں خدا کی قدرت سمجھیں، | تو اسی کو معجزا کہتے ہیں

امداد پہ اغیار کی، مغرور نہیں | طاقت سے میں احباب کی مشہور نہیں
ظاہر ہے، کہ شخصی ہے حکومت میری | پابندی انتظام جمہور نہیں

یہ حال ہو گر سب پہ عیاں بہتر ہے | حق گوئی کرے جو، وہ زباں بہتر ہے
گر حکم ہو، مجلس میں ابھی نظم کروں | اس ڈھنگ سے دستی کا امتحاں بہتر ہے

منکر ہو جہاں میں اس کا کیونکر کوئی | ڈھونڈھے سے ملے نہ جس کا ہمسر کوئی

میزان خرد میں ہم نے تولا سو بار   لیکن نہ ملا نبی سے بہتر کوئی

— • —

رباعیوں کے بعد سلاموں کا نمونہ پیش کرنا ضروری ہے ۔ اس سے صرف اتنا مطلب ہے کہ حسین اس صنف سخن میں بھی اپنے ہم عصر شعرا کے ساتھ ہیں ۔ ان سلاموں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کہیں کہیں پر تو حسین نے ایسے ایسے لطیف شعر نکالے ہیں جو ان کی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی پر دال ہیں —

یا علی! جام سبو پیمانہ میرا ہو گیا   اس فقیر مست کا کوثر پہ پھیرا ہو گیا
یا محمد یا محمد لب پہ کہتے کیجیے   آپ کے روضہ پہ اس صورت سے پھیرا ہو گیا
جب دیے بجھتے امام دیں نے پکارا یہ کہا   اب شتاب اٹھ ہوے آؤ اندھیرا ہو گیا
جب شب عاشور پھیلے سے سجادہ کا علم   ضو سے پنجتن کی بیاباں میں سویرا ہو گیا
کیا ضیا دیتے چراغ مرقد شبیر اورا   شام کے لشکر سے دنیا میں اندھیرا ہو گیا
مر کے جینے سے نصیری کے لیے اک نکتہ عیاں   جو خدا سمجھا وہ کیا بندہ بھی تیرا ہو گیا
غم میں بیٹوں کے یہ فرماتی تھیں زینب بار بار   ڈوبنے سے ان ستاروں کے اندھیرا ہو گیا
کٹ گئی عاشور کی شب یاد آل کہتی تھیں ماں   ہم شبیہ مصطفیٰ اٹھو سویرا ہو گیا
قبر والاتم بفن الاہ کا مطلب یہ ہے   کٹ گئی شب روز محشر کا سویرا ہو گیا
قتل گہ میں ہیں پڑے دونوں رقت ماتم ماں کے ہیں   گور میں آؤ اب علی اکبر اندھیرا ہو گیا

لے چلی جنت میں تجھ کو مدح آل مصطفا
اے حسین لے خوش ہو اب فردوس تیرا ہو گیا

پڑے ہیں عرش کے ٹوٹے ستارے ضو فشاں ہو کر
زمین کربلا! چمکے گی اب تو آسماں ہو کر

ہوائے تیغ عباس جری کا تیز دھارا ہے
پھریرے فوج اعدا کے اڑائیں گے دھجیاں ہو کر

شب معراج ہے، ہیں عاشق و معشوق میں باتیں
قیامت کر رہا ہے آج پردا درمیاں ہو کر

کھلا بعد ولادت مرتضیٰ کے چشم و ابرو سے
یہاں وہ بت کعبے میں توڑیں گے جواں ہو کر

بہا ہے ناریوں کا خوں، بڑھی ہے آب میں گرمی
ابھر آئے ہیں جوہر تیغ کے سب مچھلیاں ہو کر

گئے باغ جناں ظہر تک، دن جب کہ ناز تھا
کھڑے ہیں شہ اکیلے یوسف بے کارواں ہو کر

چلے ہیں لے کے یہ کہتے ہوئے شبیر خیمہ سے
بعینہ مرتضیٰ ہوتے علی اصغر جواں ہو کر

کہا شہ نے کہ اصغر حجت ناطق کا پوتا ہے
سوال آب اعدا سے کرے گا بے زباں ہو کر

احسن، نقش قدم پر کاملوں کے پاؤں رکھتے ہو
چلے ہو پیچھے پیچھے تم بھی گرد کارواں ہو کر

علمدار جری جب لے کے خیمہ سے علم نکلے — تن کفر کانپتے خوف سے اعدا کے دم نکلے
سنا کرتے تھے ہم مہر نبوت بھی کوئی شے ہے — مگر وہ آپ کے یا مرتضیٰ! نقش قدم نکلے
نجف ہو سامرہ ہو کربلا ہو یا خراساں ہو — الٰہی جس جگہ سجدہ کروں میں وہ حرم نکلے
کھلے وہ پھول جنت میں دعا وہ شہ کی درزم — غم زدہ یہ پونچھیں اک اور آنسو و چشم نم نکلے
علی اصغر گلے پر تیر کھا کر مسکراتے ہیں — جوانوں سے نبی کے گھر کے بچے بھی نہ کم نکلے

خدا کے خاص یہ بندے ہیں اس کو صبر کہتے ہیں
کریں منہ سے نہ اُف شبیر اور اصغر کا نام نکلے

وغا کے شرق میں حضرت اُٹھا کے جب نقاب آئے
خبر دی گرد نے اُٹھ کر کہ ابن بو تراب آئے
کھلیں آنکھیں ہوا دل خوش لحد میں جان سی آئی
پڑے تھے ظلم اُٹھا میں جب سرہانے بو تراب آئے
بری ہے تیغ شہ کے تئیں میں رہنا اس کا مشکل ہے
اُلٹ جائیں گی لاشوں کے کھوں پہ بے نقاب آئے
یہی اک ایک سے کہتی تھیں بانو روز عاشورا
کہیں سے میرے اصغر کے لئے اک جام آب آئے
ولادت سے امام عصر کے دنیا ہوئی روشن
جہاں میں آپ یوں آئے کہ جیسے آفتاب آئے
وہ اعدا میں پڑی ہل چل وہ تارا سا علم چمکا
پھٹا وہ گرد کا پردا وہ ابن بو تراب آئے
جہاں میں چھا گئی تاریکی ہر سو دو نظر کے بعث
مٹانے کو اسی ظلمت کے بارہ آفتاب آئے
کہا شبیر نے اعدا سے تم مجبور سمجھے ہو
جو چاہوں میں تو مسجد تک بڑھ کے خود دریا کا آب آئے
نبی زادوں کے لاشے بے کفن ہیں دشت غربت میں
"حسن" کیوں کر نہ دنیا میں بھلا اب انقلاب آئے

اوروں کو تو مقدور کے دئیے لعل و گہر بھی | اے فاطمہ زہرا کے ترا کچھ نہ تو ادھر بھی
دیکھو تو ذرا معجزۂ نفس نبی کو | ہر پور ہوئی بالائی ہرا ہاتھ میں در بھی
زینب کے پسر نیزوں پر ماتھے رکھے ہیں | اور دیکھو بلا پڑتے ہیں تر دونوں پہ نظر بھی
ساقی ہیں دئیے جسے کہ مداحوں کو اپنے | ریت کی چوٹکتا ہوا اک جام دھرا بھی
جب مہر نبوت پہ قدم رکھ چکے حیدر | پھر پاک ہاتوں سے کیا اللہ کا گھر بھی
جبریل کے پر تیغ سے رتے نہ کہ کٹتے | ہے دست علی میں در خیبر کی سپر بھی
یہ کہہ کے ہجوم کو اٹھ رن میں پکاری | شب کٹ گئی ڈھلتے دیے اور سحر بھی
اس شیر کی دریا پہ ہوا بند کمی ایسی | عباس کی تلوار سے اڑنے لگے سر بھی

ماں کہتی ہے ملکا ہوں تھلا سانس بھی اکھڑی
کچھ دیر میں دنیا سے بھی اصغر کا سفر ہو

حسین کو غزل گوئی کا شوق کم ہے کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر کہتے ہیں۔ وہ کلام بھی اتنا تھا کہ اگر وارستہ مزاجی جمع کرنے کی اجازت دیتی تو اب تک ضخیم دیوان جمع ہوگیا ہوتا مگر ان کا یہ رنگ کہ غزل کہی، گنگنائی، اور لاپروائی سے ٹال دی، کہیں دب دبا کر رہ گئی تو خیر ورنہ ضایع ہوگئی۔ جناب تمنا نے ۱۲-۱۵ غزلیں تلاش کرکے برائے تذکرہ عنایت فرمائی ہیں۔ ہمارا خیال تھا انتخاب درج تذکرہ کرتے مگر حسین کی بے توجہی کلام دستیاب کو رواج دینے کی اجازت نہ دے گی اور آنے والے زمانے کے لئے بزرگوں یا تذکروں میں جو کلام محفوظ ہوجائے وہی مناسب ہوگا اور ایک اسی شاعر کی یاد تازہ کرتا رہے گا، لہذا دستیاب شدہ غزلیں بجنسہ لکھی جاتی ہیں

---

* جنگ خیبر کی طرف اشارہ ہے

کس سمت منھ چھپا کے وہ تیر نظر گیا
دل کا لہو خون سے تہ کلیجے کے کر گیا

لچکی کمر دراز کی تو بوسہ کے شوق میں
دل کیا کے پیچ زلف کا خود تا کمر گیا

کیا کیا دکھا دیا ظلم سے تو نے نشتر کے
اے تیر آج تک تو نہ درد جگر گیا

خود ہی تو توڑتے ہیں مرے دل کے آبلے
اور خود ہی پوچھتے ہیں کہ درد جگر گیا

ظالم نے ہاتھ سینے پہ رکھ دو نظر سے
سمجھا یہ میں کہ زخم کلیجے کا بھر گیا

کیوں مسکرا کے اس نے دو دارا نگاہ کی
اک تیر اور زخم جگر میں اتر گیا

کیوں کر نہ دونوں کروٹیں دہلوں میں بار بار
اک تیر دل سے ایک جگر سے گذر گیا

جوش جنوں نے چاک گریبان کر دیا
اب دیکھئے ہیں وہ پردہ زخم جگر گیا

بس اے حسین بتوں پہ نہ دل کو کرو نثار
اب اُن محبتوں کا زمانہ گذر گیا

کسی کو صدمہ و رنج فراق یار نہ تھا
ہماری طرح کوئی اور بے قرار نہ تھا

لگائے ہاتھ میں مہندی جو قاتل پور دل لے
بس اک ادا کی کوئی تیرا غم گسار نہ تھا

زبان ان کے لئے بند ہو ہمارا غزل لے کر
علاج درد جگر کا بجز نثار نہ تھا

بڑی بہار ہماری شب کو تم جو آئے تھے
جگر کا زخم ہوا اس وقت اشکبار نہ تھا

رنگ ہی تھا گلوں پر تو خون بلبل سے
چمن میں کون سے غنچے کا دل فگار نہ تھا

شعلے ہماری آہ کے پتھر میں دیکھئے
دو ٹکڑے ہو گئے دل مضطر میں دیکھئے

باقی نہیں ہے نام کو جسم نزار میں
میرے لہو کو اپنے ہی خنجر میں دیکھئے

معشوق نیم جاں کو قتل کریں آپ کیا عجب
رخ آج چاند دیکھ کے خنجر میں دیکھئے

الفت زیادہ ہو گئی دل میں میرے حسین
اب آگے دل کے کیا ہو مقدر میں دیکھئے

دن آئے گی جو دیکھوں گا تصویر یار کی
اب حد نہیں رہی ہے مرے انتظار کی

راحت ہے میرے حق میں اذیت فشار کی | حسرت نکل رہی ہے دل بے قرار کی
آکر جلا گئے مری تربت کے سب چراغ | اتنی خوشی تو کی دل امیدوار کی
کیوں تیرہ بختیوں کی شکایت بڑھائیے | گل کیجئے نہ شمع ہمارے مزار کی

تم اے حسین جگر سے ذرا تیر کھینچ لو
ہو جائے گی دوا بھی دل بے قرار کی

ایسے بھی کہیں درد کے مارے نہیں دیکھے
ہم نے دل و بلبل کے اشارے نہیں دیکھے

جب میں نے کہا مرتا ہوں، منہ پھیر کے بولے
سنتے تو ہیں، پر عشق کے مارے نہیں دیکھے

ہر سمت پھرے خاک اوڑایا کئے برسوں
پر نقش قدم ہم نے تمہارے نہیں دیکھے

پوشیدہ ہیں کس طرح سے مری خاک کے ذرے
پتھر میں بھی اس طرح شرارے نہیں دیکھے

تربت میں مرے بند کفن کھول کے بولے
ہم نے دہن زخم تمہارے نہیں دیکھے

اب قبر پہ آئے ہو تو اس سمت بھی دیکھو
ہاں، نیچی نگاہوں کے اشارے نہیں دیکھے

بے چین ہے دل فصل بہاری میں حسین کا
اب تک کسی گلرو کے اشارے نہیں دیکھے

مندرجہ بالا غزلیں ابتدائے مشق سخن کا نتیجہ ہیں، جن میں عہد شباب کے ولولے اور جذبات جلوہ نمائی کر رہے ہیں۔ اب تھوڑا کلام موجودہ دور کا پیش ہوتا ہے جس سے حسین کی کہنہ مشقی اور شاعری کے عہد جوانی

پر روشنی پڑتی ہے ان فقرات سے حسین کی طرز ادا، حسن بیان، زور طبیعت، نزاکت تخئیل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

فکر طبیب نے ' نہ دوا نے بچا لیا
بیمار کو ' کسی کی دعا نے بچا لیا

قصہ تمام ہو گیا ' بس ایک ہاتھ میں
قاتل ! تیری جفا سے قضا نے بچا لیا

زخم تیر کا پاٹ دیا ' جھونکوں نے آ کے
میرا چراغ زیست ہوا نے بچا لیا

مطلب پھیر نے ہی کو تھا میں کعبہ کی سمت سے
ناقوس بت کدہ کی صدا نے بچا لیا

گرداب بحر غم میں پھنسا تھا جہاز دل
لیکن یہ شکر ہے کہ خدا نے بچا لیا

ہمارے گھر میں آنا صبح سے اور شام ہو جانا
خدا رکھے جوانی ہے ' نہ تم بد نام ہو جانا

بکھر کر زلف کچھ آتی ہے کچھ اڑتی ہے چہرے سے
نہ دیکھا ہو تو دیکھو صبح ہونا شام ہو جانا

نہیں بھاتا ہے کچھ بھی دنیا کا اے جوش دل مجھکو
مگر در پر اس کے صبح ہونا شام ہو جانا

سحر کو دیکھنے والوں کی قسمت اور بھی چمکی
وہ پڑنا دھوپ کا اور وہ سنہرے جام ہو جانا

جگر سے تیر تو کھینچا ہے ' لیکن یہ بھی کہتے ہیں
بہت دشوار ہے جلدی تجھے آرام ہو جانا

جمع سب عاشق تھے ان کے شوق سب کے دل میں تھا
کیا مزہ کیا لطف دور ساغر محفل میں تھا

سننے والوں کے برابر اشک بہتے رہتے تھے
کس کا عبرت خیز قصہ آپ کی محفل میں تھا

چھوٹ جاتی تھی تڑپنے سے کبھی اس کی چھری
میں تو میں قاتل بھی میرا ذبح سے مشکل میں تھا

قبر پر روتا تھا کوئی مجھکو ہوتا تھا فشار
میں تو بعد دفن بھی کچھ دیر تک مشکل میں تھا

وہ تھی قاتل کی نہ تڑپے یہ نہ اس کو موت آئے
عاشق رخ زار خمدر بھی بڑی مشکل میں تھا

نامہ بر سے یہ کہیں کہتا ہے لایا کچھ جواب
منتظر میں کب سے تھا تو کون سی منزل میں تھا

زخم دیتے ہیں لہو جب دیکھتا ہوں کوئی دوست
دل سے رکتی ہے تعلق جنبش ابروئے دوست

جب سے ہم زنداں میں ہیں راتوں کو نیند آتی نہیں
یاد کرتے ہیں تجھے اے ساکنان کوئے دوست

اس طرف سے کیا کسی ناشاد کی گزری ہے لاش
بے سبب اُڑتی نہیں ہے آج خاک کوئے دوست

عمر بھر خود بھی رہوں گا قبر بھی ہوگی یہیں
دے کے دل میں مول لیتا ہوں زمیں کوئے دوست

وسعت میدان دل بھی کر سکا ناوک نہ طے
دیکھ لی بس میں نے حد طاقت بازوئے دوست

فائدہ میری لحد بننے سے اتنا تو ہوا
بس رہی ہے آج پھولوں سے زمیں کوئے دوست

وقت آخر سوچتا ہوں کیوں میں دنیا سے چلا
مجھ سے بد قسمت کا سر ہو اور ہو زانوئے دوست

فاتحہ پڑھ او زرا قبر شکستہ پر مری
اس طرف بھی دیکھ او اے ساکنان کوئے دوست

اس طرح سیر گلستاں سے تعلق دل کا ہے
ہر کلی ہر پھول سے آتی ہے مجھکو بوئے دوست

کاش وقت نزع چہرے سے اُلٹ دیتے نقاب
کیوں جنازے پر مرے کھولے گئے گیسوئے دوست

مجھکو پروانوں کے جل جانے پر آتی ہے ہنسی
شمع تربت کو سمجھتے ہیں چراغ کوئے دوست

درد بن کر رہ گیا ہے جب سے اُلٹی ہے نقاب
دل سے جاتا ہی نہیں دم بھر خیال روئے دوست

منہ چھپائے ہیں لحد کے سونے والے خاک میں
کیا کفن کے پارچوں میں ہے نقاب روئے دوست

توڑتی ہے میری رگ رگ ہچکیوں سے موت کی
اُڑ گیا ہے بوئے گل کی طرح رنگ روئے دوست

کس طرح ہے جلوہ شمع طرب افزائے بزم
صبح صادق کی سفیدی ہے نقاب روئے دوست

مجھ پہ تلواریں اٹھانے کی ادا کو دیکھئے
پھوٹ نکلا جلد سے خون رگ بازوئے دوست

تم ہولئے ہو پر میرے آپ کو تو ہی ہے کچھ ہنسی
دل کا جانا ہے پتہ اب تو تہ زانوئے دوست

دل کی اُلجھن اے حسن ہر طرح سے باقی رہی
طول شام ہجر سے بڑھ گئی گیسوئے دوست

ہے وقت سحر باغ میں ... آئے ہوئے ہیں
وصل کی رات ہے بڑی شرمائے ہوئے ہیں

میں نے جو کہا وصل میں زلفیں ہیں پریشاں
اب تک وہ اسی بات پہ شرمائے ہوئے ہیں

اب ہجر کی بھی ہوگی کسی کو نہ شکایت
تصویر کے پہلو میں وہ شرمائے ہوئے ہیں

کچھ دیر ابھی اور نہ اجب اٹھائیں
وہ ہمارے جنازے پہ حسن آئے ہوئے ہیں

زخم کھولے ہیں اگر انکی تو بیمار نہ ہو
یہ نئی ضد کہ کوئی طالب دیدار نہ ہو

اس کے لڑنے میں ہے اک حسن گرنے میں ادا
دیکھا ہے کہ جو ہر بات میں تکرار نہ ہو

حال قیدی کا نہ ہو دیکھنے والا کوئی
آنکھ کھولے ہوئے گر روزن دیوار نہ ہو

مصلحت ہے کہ یونہیں غش میں رہیں طالب دید
وہ جو دامن کی ہوا دیں کوئی ہشیار نہ ہو

دیکھو انگڑائی نہ لو بند قبا ٹوٹ نہ جائیں
سو رہو رات بہت ہے ابھی ہشیار نہ ہو

دم نکلتا ہے ، مگر چھوڑ نہیں وسواس کی ہوا
اے حسن پاس وہ آجائیں جو انکار .. تو

وقت زینت دور رکھا کر ستمگر آئینہ
حسن عالم سوز .. چمکا ہے اکثر آئینہ

دیکھتے ہیں دوست میری سانس آخر وقت ہے
رکھ دیا ہے لا کے اک منہ کے برابر آئینہ

یہ بھی تدبیر اپنی اپنی یہ بھی اپنی اپنی چال
میں نہ دیکھوں ، اور دیکھے اس کو دن بھر آئینہ

آج وہ زلفیں بناتے ہیں نئے انداز سے
لا کے رکھا ہے میرے دل کے برابر آئینہ

وقت زینت چاہئے ہر ہر ادا کی دیکھ بھال
ان کے کاشانے میں ہو قد کے برابر آئینہ

آتش دل کا پتہ دیتی ہیں آہوں کے شرر
عکس تو باہر ہے اور ہے گھر کے اندر آئینہ

کیوں شب وصلت پسینے سے ہو ضو اس رخ کی کم
خوشنما ہوتا ہے زیر آب بھی ہر آئینہ

پہلے دیکھی شکل اپنی پھر یہ بولا وہ حسین
میری آنکھیں کشتیاں ہیں اور سمندر آئینہ

عشق کے ہاتھوں ہے وہ زرد اور آنکھیں ہیں پر آب
اے حسین دیکھو تو اب صورت دکھا کر آئینہ

درازی اور کچھ گر آپ کے گیسو میں بڑھ جائے
تو دل فرط مسرت سے مرے پہلو میں بڑھ جائے

ابھی ضد ہے تو مجھ پر شوق سے ناوک لگا قاتل
بڑھے مشق ستم بھی، زور بھی بازو میں بڑھ جائے

مثال خانۂ دل جل اٹھیں سب آنکھ کے پردے
ذرا سی اور حدت گر مرے آنسو میں بڑھ جائے

زیادہ ہو اگر سرمہ کی تحریر آنکھ کی حد سے
تو پھر دونا اثر چلتے ہوئے جادو میں بڑھ جائے

ہلال عید قرباں جان کر سب شوق سے دیکھیں
چمک اتنی تو اس کے خنجر ابرو میں بڑھ جائے

بھروں آہیں جو فرقت میں تو جنبش ہو پہاڑوں کو
کسی دریا پہ گر رووں تو اک آنسو میں بڑھ جائے

نکلتا ہے وہ جب تیر نظر تو میں یہ کہتا ہوں
الہی اور اک ناوک میرے پہلو میں بڑھ جائے

نہ دیں مجھ کو تسلی اور نہ وصلت کا کریں وعدہ
وہ خالی مسکرا ہی دیں تو دل پہلو میں بڑھ جائے

شب وصلت کی راحت اے حسیں ہے عارضی بالکل
وہ پہلو سے اٹھیں تو درد پھر پہلو میں بڑھ جائے

کلیجہ تھامے عاشق اور مضطر ہو کے نکلیں گے
جو اپنے گھر سے وہ خورشید خاور ہو کے نکلیں گے

گلے میں بیخودی سے طوق کر میں بانہیں نالوں کا
وہ محشر میں اگر میرے برابر ہو کے نکلیں

ہمیں ڈر ہے کہ کوسن ہیں نہ تابِ ضبط لائیں گے
انہیں ضد ہے کہ لاشوں کے [illegible]

کھلا رہنے دو منہ میرا کفن سے کیوں چھپاتے ہو
سدا ہے وہ جنازے کے برابر ہو کے نکلیں گے

دکھیں ان کو اگر صورت دکھانے کا نہ وہ ظالم
تو اس محفل سے آئینے مکدر ہو کے نکلیں گے

اتنی تو ہو طاقت کہ تصور سے گذر جائے
ناوک وہی ناوک ہے جو تا حد نظر جائے

الجھن میں کوئی کچھ ہو تڑپنے کا اثر جائے
پہلو میں جو تم ہو تو دل زار ٹھہر جائے

منہ دیکھ کے بیمار کا آجاتا ہے رونا
اللہ کرے خیر سے یہ رات گذر جائے

گھبرا کے میرے دل پہ لگاتے ہیں وہ ناوک
چھرے کی طرح سے کہیں چلہ نہ اُتر جائے

ہم چاہتے ہیں یہ کہ وہ زلفیں نہ بنائیں
اُن کو ہے یہاں ضد کہ یونہیں رات گذر جائے

خط اُس نے جو لکھا تو پر تیر پہ لکھا
مطلب یہ ہے کم بخت نہ مرتا ہو تو مر جائے

بڑھ جائے گی سوزش میرے چھالوں کو نہ تو رو
پانی کے ٹپکنے سے کہیں آگ نہ بڑھ جائے

پیکاں کا چھنکتا ہوا پہنچا ہے کہاں زہر
نزدیک ہے دل تک نہ کہیں خون جگر جائے

مثل حسرت پامالوں کے نقش دل پر پامال ہے
خار ہو شگفے ہے گلستاں کی یہ دل پر پامال ہے

کہتی ہے بلبل کہ دیکھیے کونسی حد شوق دین
شاخ پر کب ہے ؟ مرے تار نظر پر پھول ہے
رات دن ہم دیکھتے ہیں بام عالم کی بہار
شب کو تارے صبح کو خورشید خاور پھول ہے
کس لئے ساقی کلائی دیکھتا ہے بار بار
دست نازک سے اٹھا کر دیکھ ساغر پھول ہے
میرے آنسو کی دورنگی دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آنکھ میں موتی ہے اور دامن پہ گر کر پھول ہے
کھینچا ہے جو پیکاں تو سرک جاؤ ادھر سے
اب خون نہیں آگ نکلتی ہے جگر سے
کہتے ہیں وہ شانہ مرا تربت میں ہلا کر
کیا آنکھ نہ کھولو گے شب ہجر کے ڈر سے
لگ جائے کہیں آگ قفس میں تو غضب ہو
ہم آہ بھی کرتے نہیں صیاد کے ڈر سے
گھر جانے کے سامان ہوئے بندھنے لگے گیسو
تیور بھی بدلنے لگے آثار سحر سے
بکھرے ہوئے گیسو بھی چھپائیں گے اسے کیا
جاگے ہیں کہیں رات کو ظاہر ہے نظر سے

حقیر

حافظ قاسم محمد نام، حقیر تخلص - مولد تو بریلی توابع لکھنؤ ہے

لیکن مسکن خاص لکھنؤ تھا - چوک میں زنانیوں کے نام سے جو محلہ مشہور ہے وہیں رہا کرتے تھے - سلسلۂ نسب خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے - اسی اظہار کے لئے اپنے نام کے آخر میں لفظ "فاروقی" کا اضافہ کرتے ہیں - یہ نابینا لکھ اور مادرزاد تھے - اس لئے صحیح معنوں میں حافظ کہلانے کے مستحق ہیں - کلام اللہ حفظ کیا - قرآن خوانی اور کتب فروشی کر کے اوقات بسر کرتے تھے - حافظہ بے حد قوی تھا - ایک بار جو بات گوش زد ہوئی پھر کبھی فراموش نہ ہوئی - یہی سبب ہے کہ مذہبی معلومات بہت وسیع تھیں - علمائے دین کی صحبت نے مسئلے مسائل اور علم مناظرہ میں ہوشیار کر دیا تھا - حافظ صاحب اکثر بازاروں اور مجمعوں میں غیر مقلدین سے مناظرہ و مباحثہ بھی فرمایا کرتے تھے - تقریر بہت صاف و شستہ اور فصیح ہوتی اور اس سے اُمیت کا پتا نہ چلتا - صاحب تصانیف بھی ہیں ایک رسالہ علم مناظرہ میں "شریعت آرہ" کے نام سے تصنیف کیا تھا جو اُن کی حیات میں طبع ہوکر شایع ہوا تھا اور اب نایاب ہے - دوسری تصنیف نعتیہ دیوان ہے جسے مطبع آفتاب عالمتاب نے "کلام بے نظیر" کے نام سے چھاپا تھا - یہ دیوان بھی اب نہیں ملتا — حقیر کی ذات میں ایک حیرت انگیز صفت پائی جاتی تھی جس سے اُن کے جاننے والے حد درجہ متعجب ہیں - یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ حقیر کی معاش کا دارومدار قرآن خوانی اور کتب فروشی پر تھا - اکثر تجارت کے سلسلے میں بیرونجات اور مقامی میلوں ٹھیلوں میں شریک ہونے اور دوکان لگانے کا اتفاق ہوا کرتا جہاں کتابوں کی خریداری کو ہر قسم اور ہر مذاق کے لوگ آتے کوئی خریدار کسی مذاق اور کوئی کسی مضمون کی کتاب مانگتا - حافظ صاحب کو کتابیں نکالنے کا کچھ ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ ہزاروں سیکڑوں کتابوں کو صاحب فرمائش کی مطلوبہ کتاب نکال دیتے اور انتخاب میں کبھی غلطی نہ ہوتی

انہوں نے کسی زبان کا کوئی درس نہیں پڑھا تھا مگر قدرت نظم حاصل تھی چونکہ طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا اس لئے جب شاعری کی لہر آتی تو حمد و نعت میں کچھ کہہ لیا کرتے اور اُس کلام سے دینی جوش و مذہبی عقائد واضح ہوتے ہیں۔

حقیر گندم گوں گول ہاتھ پاؤں کے پستہ قد آدمی تھے۔ حاجیوں کی وضع کا ٹخنوں تک لمبا کرتا اور تہبند یا سہری کا شرعی پائجامہ، دوپلی ٹوپی، خاص وضع تھی جو کسی فصل کسی موسم اور کسی زمانے میں نہ بدلی جاڑا گرمی برسات ایک طرح بسر ہوئی سنہ ۱۹۰۷ء میں ستر برس کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ جناب عشرت کے ذریعہ سے جو کلام دستیاب ہوا بجنسہ درج تذکرہ ہوتا ہے اس مخمس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیر صرف اُردو زبان ہی میں نظم کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے بلکہ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے جسے شاعروں کی صحبت کا فیض سمجھنا چاہئے۔ خمسہ ملاحظہ ہو۔

ہیں ارض و سما سب تہہ فرمان محمد ہے ظل خدا سایہ داماں محمد
کس طرح نہ مخلوق ہو قربان محمد لولاک کہ نازل شدہ در شان محمد
جزو یست ز اوصاف فراواں محمد

نعت اُنہی خامہ سے کس طرح رقم ہو اللہ ہو قرآں میں خود جس کا ثنا گو
تو فی الحقیقت اُس کی نہیں تاب بشر کو از مدحہ بیچارہ چہ آید صفت او
جبریل امیں ست ثنا خوان محمد

مشتاق ہوا خالق سب معراج بلوایا اُنہیں حق نے فلک پر شب معراج
نبیوں کو ہوئی دید میسر شب معراج بر عرش چو افتاد گزر در شب معراج
گشتند ملائک ہمہ قربان محمد

دروازے پہ کب اُس کے پہونچا کوئی تہی دست — مجذوب ہوا اک، ہو وہ دیوانہ ہو کوئی مست
محروم ذرا فیض سے کوئی شیخ نہ شاب ہے — در ذات شریفش ہمگی رحمتِ حق ہست
بر جملہ خلائق بود احسان محمد

ادیان و ملل جملہ نبیوں کے ہوئے پست — پر دین محمد ہی رہا سب میں زبردست
شک نیست درین قول کہ این شعر بجا ہست — او ہر چہ بگوید ہمہ درست است بحق ہست
از جان و دلم تابع فرمان محمد

سرمہ جسے منظور ہو بینائی کے خاطر — جا کر در دولت پہ نبی کے ہو وہ حاضر
ہو روشنی آنکھوں میں اکا ایسے ظاہر — خاک قدم اوست بہ از کحل جواہر
شاہان جہاں زندہ غلامان محمد

کچھ دل میں حقیر اپنے نہیں خوف جہنم — بخشائیں گے خالق سے مجھے شافع عالم
افعال نہیں نیک ہوئے مجھ سے کسی دم — ہر چند ز حسنات تہی دست ترا ہم
غم نیست کہ دستم بدامان محمد

خبیر

اِس اُمی شاعر کا نام دریافت نہ ہو سکا۔ مگر حسین آباد لکھنؤ میں رہتا تھا۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہوا۔ خاندان میں دستکاری کا پیشہ ہوتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کی جانب بالکل توجہ نہ تھی۔ خبیر بھی خاندانی دستور کے مطابق پڑھا لکھا نہ تھا۔ کھراد کا کام کر کے زندگی گذاردی اور اِس پیشہ سے جو کچھ پیدا کیا اُس سے اپنی اور اہل و عیال کی بسر کی۔ لکھنؤ کی شاعرانہ آب و ہوا نے اِس کے قلب و دماغ پر پورا اثر ڈالا تھا۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ جب اپنے کام سے فارغ ہوتا تو شعر گوی

کی طرف توجہ کرتا - جو کچھ کہتا فکر کے ساتھ اور سمجھ سمجھ کے کہنے کی سعی کرتا - کلام میں لکھنؤ کا قدیم رنگ غالب ہے - کنگھی چوٹی ؛ گل و بلبل ؛ زلف و کاکل و لب و دندان کے مضامین کا والہ و شیفتہ معلوم ہوتا ہے - شاعروں کی شرکت سے ہمیشہ محترز رہا لیکن اہل فہم کو اپنی غزلیں سنانے کا بے حد شوقین تھا - جہاں جاتا شعر و شاعری کا چرچا ضرور کرتا اور اپنا تازہ کلام پڑھ پڑھ کے سناتا - غزل پڑھتے وقت ایک کیفیت سی طاری رہتی جس سے اس کا دلی ذوق و شوق ظاہر ہوتا - خواجہ عشرت کی دوکان پر (جسے شاعری کا مرکز کہنا بے جا نہیں) سخن سنجوں اور سخن فہموں کا جمگھٹا رہتا - اکثر تحقیق الفاظ اور شعر و شاعری کا ذکر جاری رہتا - خواجہ صاحب کے اخلاق حمیدہ نے شعرا کو گرویدہ کر لیا ہے - اب بھی روزانہ شام کو علم ادب کے شائق جمع رہتے ہیں خیر یہ بھی جب چوک آتا تو خواجہ صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا - خواجہ صاحب اُس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے توجہ سے کلام سنتے اور اچھے شعروں کی داد دیتے اور وہ شاد شاد مکان واپس جاتا دس بارہ برس ہوئے فکر روزگار میں کانپور چلا گیا - اُن دنوں وہاں طاعون کی کثرت تھی - روز سیکڑوں جانیں تلف ہو رہی تھیں - خیبر کی موت بھی اُسے لکھنؤ سے نکال لے گئی تھی - کانپور پہنچتے ہی بخار میں مبتلا ہوا - چڑھے میں گلٹی نکل آئی اور اُس وقت جب شہر میں موت کا بازار گرم ہو رہا تھا اُس اُمی شاعر نے ۵۵ برس سے زیادہ عمر پاکر غربت میں قضا کی - بڑی کوشش سے چند متفرق اشعار دستیاب ہوئے جو درج کئے جاتے ہیں —

رنگ جو کہتا ہے مری جان نہ پرہیز کرو — اپنی مہندی میں کرو خون بھی شامل میرا
زخم کھاتے ہیں، تڑپنے میں مزا آتا ہے — دل یہ ڈرتا ہے کہ ٹھہر جائے نہ قاتل میرا

دبیر اک دن اُٹھا لائیں گے اپنے دل کے ذروں کو
کسی دن تو گزر ہوگا زمین کوئے قاتل پر

لوٹتے سانپ کلیجے پہ ہدو کے کیا کیا
گر مرے سوگ میں وہ بال پریشان ہوتے

گلوں کا رنگ بڑ جاتا ہے دیکھا شرم کے مارے
اگر گلگشت کو سوئے چمن وہ جا نکلتا ہے

خلیفہ

اچھے نام خلیفہ تخلص - دہلی میں موتراشی کا پیشہ کرکے بسر اوقات کرتا تھا - حد سے زیادہ ظریف الطبع و شگفتہ مزاج واقع ہوا تھا ضلع جگت میں کافی مہارت تھی - کوئی کلام تلازمہ سے خالی نہ ہوتا - انہیں ظرافتوں اور چلبلی طبیعت نے مرزا رفیع السودا کی طرح مزاج میں شعلہ خوئی پیدا کردی - ذرا ذرا سی کبیدگی میں ہجو نہیں کہہ ڈالنا کوئی بات ہی نہ تھی - قوت نظم بہت بڑھی چڑھی تھی - اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کے نمونے پیش کرتا - ان پڑھ ہونے کی وجہ سے کلام کا اکثر حصہ ضایع ہو جاتا - کسی کی عنایت و مہربانی سے جو لکھ گیا

وہ محفوظ رہا۔ جو ضابطۂ تحریر میں نہ آسکا اور حافظہ سے اتر گیا وہ تلف ہوا۔ بعض اہل پیشہ شاعروں کی طرح اس کا حافظہ قوی نہ تھا۔ شعر نظم کر کے بہت جلد بھول جاتا۔ ہمیشہ صاف صاف کہتا۔ چونکہ ظریف تھا لہذا میں کلام میں بھی سید انشا کے مانند ظرافت کا عنصر غالب رہتا۔ شوخ طبیعت اپنی شرارت سے باز نہ رہتی۔ ایک مرتبہ کسی نامی پہلوان سے آن بن ہوگئی۔ پہلوان کو اپنی تہمتنی اور بھرے بھرے بازوؤں پر گھمنڈ۔ خلیفہ کو طبع کا ساز پر شور ہوا تو ایسی ہجو لکھی کہ پہلوان صاحب کو اکھاڑے سے بھاگتے ہی بنی دوسرے اکھاڑوں میں پہلوانی کے سارے کرتب فراموش ہوگئے۔ خلیفہ کی تصنیف کی ہوئی ہجو کے اشعار بچے بچے کی زبان پر تھے جو دہلی کی گلی کوچوں میں شور مچاتے پھرتے تھے —

وہ زمانہ بہت دور نکل گیا۔ وہ ہجو نایاب ہوگئی۔ کوشش و تلاش سے چند شعر بھی حاصل نہ ہوئے کہ خلیفہ کی شوخیوں کا نمونہ پیش ہوتا۔ تذکروں میں صرف ایک شعر دیکھا گیا جو نقل ہوتا ہے —

ارندھا پڑے ہے نیچے سدا ہر جواں کے
تا لوگ یہ کہیں کہ کبھی چت ہوا نہیں

متین کلام کا نمونہ یہ ہے —

سارے عالم کی آنکھ پڑتی ہے   تیرا ابرو ہلال ہے گویا

خلیفہ مر مٹا آخر ادائے خوبرویاں پر
جوانا مرگ مرنے کا بڑا ارمان رکھتا تھا

خلیفہ کو نہ ٹالو اے حسینو ایک دو سے پھر
کیا تھا اور جو وعدہ اسے بھی اب وفا کر دو

کچھہ بھی خسرو کی خطا یا جرم شیریں کا نہ تھا
تو نے اپنی جان دی فرہاد اپنے ہاتھہ سے

دلاور

دلاور علی نام ' دلاور ' تخلص - والد کا نام بہادر علی تھا - قصبہ آنولا کے رہنے والے بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی تھے - آزادی کی ہوا دماغ میں بھری ہوئی تھی - جب تک سر پر باپ کا ظل عاطفت قائم رہا وہاں میں مقیم رہے - اُن کے مرتے ہی وطن کی سکونت ترک کر دی - عزیز و اقارب تھے ہی نہیں جن کی محبت دامن پکڑتی - نیم پختہ مکان فروخت کر کے اطراف ہند میں سیاحت کرتے پھرے - فن کشتی کے نہایت گرویدہ تھے اور اُسے کامل سعی کے ساتھہ پہلوانوں کی خدمت کرکے حاصل کیا تھا - اُٹھا ہوا ورزشی جسم ' چہرے کے خط و خال دل کش ' بڑے زور آور جوان تھے - فن کشتی کی بدولت ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی تھی - سنا جاتا ہے بڑے مضبوط اور گویا اسم با مسمی تھے - اوائل شباب سے مطلق العنان رہے جس نے بے اعتدالیوں کے راستے پر لا ڈالا - اول اول تو کچھہ معلوم نہ ہوا - آخر کار فطرت کا انتقام شروع ہوا - جسمانی طاقت گھٹنے اور کمزوریاں زور پکڑنے لگیں - رفتہ رفتہ مختلف امراض پیدا ہوے - ہنوز شباب اپنی آخری منزلیں طے کرنے میں مصروف تھا کہ پہلوان قضا کا

دائی چل گیا اور 'دلاور' نے ۳۵ یا ۴۰ سال کی عمر میں داعی اجل سے شکست قبول کرتے ہوے گوشۂ قبر آباد کیا —

دلاور کو شاعری کا بہت شوق تھا مگر اُس شوق کو قیام نہ تھا۔ ہاتھی کے ابال کی طرح جوش شباب سے کچھ کچھ نظم کرلیتے تھے۔ لہو و لعب میں پڑ جانے اور صغر سنی میں یتیم ہوجانے سے علمی تعلیم بالکل نہ ہوسکی' نہ پہلوانی کے سوا کوئی ہنر آیا۔ طبیعت کی موزونی سے کاہ گاہ کچھہ موزوں کرلیتے' کم گوتھے مگر کلام صاف ہوتا۔ نمونۂ سخن یہ ہے :—

تجھے خنجر بکف دیکھا تو اے قاتل خیال آیا
لہو ہوگا نہ کس کس کا ترے دست حنائی پر
گلہ شکوہ نہیں ہے' یہ تو باتیں ہیں محبت کی
ہوے جاتے ہو کیوں برہم مرے دل کی صفائی پر
بھلا ناصح کسی کو سوجھتا ہے کچھہ جوانی میں
نظر رہتی مری کیوں کر برائی پر بھلائی پر
پلا دیتا ہے قسمیں دے کے وہ مئے دست ساقی سے
بھلا زاہد! کوئی قائم رہے کیا پارسائی پر
'دلاور' نوجوانی میں نبھے گی کس طرح توبہ
عجب ہوتا ہے رہ رہ کر تمھاری پارسائی پر

ذاکر

سید عشرت حسین نام 'ذاکر' تخلص۔ وطن کا حال دریافت نہ ہوا ہاں یہ بلگرام یا اُس کے قرب و جوار میں رہتے تھے۔ امامیہ مذہب کے

پیرو عزادار حسین تھے۔ ایک دفعہ ایام عزا اور زمانۂ اربعین میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بڑے نیک و خوش مزاج، گورے چٹے، متوسط الاعضا، کشیدہ قامت آدمی تھے۔ محرم اور چہلم میں بعض مقامات پر ماتم کرنے جایا کرتے۔ تعزیہ خانوں میں گاہ گاہ اپنے تصنیف کئے ہوے نوحے و سلام پڑھ کر ماتم کرتے۔ اور خود روتے اور دوسروں کو رلا کر مثاب کرتے۔ اگر کسی نے نذر حسین سمجھ کر کچھ پیش کش کیا تو بطیب خاطر قبول کیا ورنہ ماتم سے فارغ ہوکر چپ چاپ چلے گئے —

ان کے خاندان میں مدت سے یہ رسم جاری تھی کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی گھروں میں چراغ روشن کرنا ترک کر دیا جاتا اور پورا عشرہ مجالس کے حصوں سے بسر ہوتا۔ ذاکر، بھی سختی سے اس رسم کے پابند تھے اور مجلسوں میں شریک ہوکر اتنا تبرک جمع کرلیتے کہ خود کھاتے اور اپنے ساتھیوں یا فقیر فقرا کو تقسیم کردیتے —

شاید وطن میں کچھ زمین تھی جس میں زراعت کرکے بسر کرتے سال بھر تک بہت کچھ کر پس انداز کرتے اور محرم میں کل اندوختہ حسین کے نام پر صرف کردیتے۔ پڑھنا لکھنا بالکل نہ جانتے تھے۔ لیکن موزوں طبع تھے۔ جب جذبۂ شاعری پیدا ہوتا تو نوحہ، سلام یا منقبت تصنیف کرتے اور اسے نجات آخرت کا موجب تصور کرتے۔ غزلیں کہیں مگر بہت ہی کم اور شاذ شاذ۔ کلام جمع کرنے کا مطلق شوق نہ تھا۔ جب محرم یا شہیں* آنے والی ہوتیں تو نوحہ تصنیف کرکے حفظ کرتے اور جب زمانۂ عزا ختم ہوتا تو بدستور اپنے کاموں میں مشغول ہو کر بھول جاتے —

---

* زمانہ شہادت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب جو ۱۸ ماہ صیام سے شروع ہوکر ۲۱ تک رہتا ہے —

جس زمانے میں مجھ سے ملاقات ہوئی تھی اُنھوں نے اپنی غزلوں کے متفرق اشعار سنائے تھے ۔ چند شعر پسند ہونے کی وجہ سے اکھہ لئے تھے جو تذکرہ میں شامل ہوئے ۔ دس بارہ برس سے اُن کا آنا نہیں ہوا نہ معلوم کہاں اور کس حال میں ہیں ۔ زندہ ہیں یا عالم بقا کو سدھارے ۔ کلام یہ ہے —

ہر وقت خفا ہونا ' ہر وقت برا کہنا
کی قدر وفا کیسی ' ظالم ترا کیا کہنا
بے چین ہو دل اُن کا ' بیتابی دل سن کر
اس رنگ سے اے ذاکر قصہ نہ مرا کہنا
کچھہ عنایت جو آپ کی ہوگی زندگی میری زندگی ہوگی
یہ چمک ہے جو طور کی جانب اُن کے جلوے کی روشنی ہوگی
قم کے بعد لے سرھانے ذاکر کے
لب جاں بخش پر ہنسی ہوگی

رضا

سرفرازالدولہ نواب مرزا حسن رضا خاں ، رضا تخلص لکھنؤ کے نامور رئیس اور امیر باذل گزرے ہیں ۔ اِن کے والد کا نام مرزا علی رضا تھا جو هندوستان کی تاریخ میں کافی شہرت و امتیاز رکھتے ہیں ۔ دادا مرزا جاں سپار خاں جو شاہ جہاں ' بادشاہ دھلی کے معتمد خاص اور مزاج میں کامل درخور رکھتے تھے -

نواب سرفرازالدولہ اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے مرزا علی رضا خاں کے ۲ شالۂ راحت میں پیدا ہوئے لیکن منجھلے چچا محمد ابراهیم خاں کے یہاں

پرورش پائی - وہ اِنہیں بمنزلہ جان و روح سمجھتے تھے - یہی چہیتہ پیار مرزا حسن رضا خان کی بے علمی کا موجب ہوا - بچپن میں کسی کو لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں ہوتا - بچوں کے اتالیق اور نگران حال حکمت عملی سے کام لے کر اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں - لیکن محمد ابراہیم خاں نے فرط محبت سے انہیں اِن کی خوشی پر چھوڑ دیا - جس کی بدولت یہ ایک حرف بھی نہ پڑھ سکے - مگر اہل علم کی صحبت نے فارسی بولنے اور سمجھنے کی قدرت پیدا کردی تھی - اہل فارس کی طرح بے تکلف فارسی زبان میں گفت و شنید کر سکتے تھے - مبداء فیاض نے نعمت ہائے اقبال و مراتب اور دنیوی جاہ و ثروت ' دولت و حشمت سے مالا مال کیا تھا - جب تک زندہ رہے ہزارہا آدمیوں کی پرورش کرتے رہے - اِن کے عروج کو سلطنت اودھ میں جتنا قیام نصیب ہوا کسی اور امیر کو یہ بات حاصل نہیں ہوئی - چنانچہ نواب شجاعت الدولہ کے عہد معدلت مہد سے ترقیاں شروع ہوکر عہد بعہد جاری رہیں اور اُس وقت تک منقطع نہ ہوئیں جب تک ہوائے مرگ نے اُن کا چراغ زندگی گل نہ کردیا - ابتدا میں انہیں داروغگی باورچی خانہ - توشے خانہ اور دیوان خانہ عنایت ہوے جو اس زمانے میں نہایت معزز و موقر عہدے سمجھے جاتے تھے - جب نواب آصف الدولہ سا سخی اور عادل نواب سریر آرائے حکومت ہوا تو قرعہ انداز ازل نے اِن کے نام قرعہ نیابت ڈالا اگر چہ اُمی تھے اور انتہا یہ ہے کہ شین و پے میں فرق نہ کر سکتے تھے چنانچہ مشہور ہے کہ کسی خوش نویس نے صلہ اور انعام کی طمع میں فارسی کا ایک قطعہ نہایت حسن و خوبی سے بخط نستعلیق لکھ کر بطور نذر نواب کی حضور میں پیش کش کیا - یہ سخی تو تھے ہی بہت خوش ہوے اُس کی اُمید سے دو چند انعام و اکرام عطا کیا مزید عنایت یہ فرمائی کہ ازراہ حوصلہ

افزائی وقدردانی تعریف وتوصیف کرتے ہوے فرمایا پے کے نقطے بہت خوب ہیں جیسے پے کے نقطے کہا تھا وہ حقیقتاً شین کے نقطے تھے - باوجود اس کے عاموی کے بہی نواب آصف الدولہ نے مسٹر جان برسٹو رزیڈنٹ اودہ کے مشورے سے انہیں خلعت نیابت سے بلند و سرفراز فرمایا اور کاروبار ملکی میں مدد دینے کے واسطے نواب حیدر بیگ خاں کو خطاب امیرالدولہ عنایت کر کے نواب حسن رضا خاں کا پیش دست مقرر کیا اور راجہ ٹکیت رائے کو خلعت دیوانی بخشا گیا —

نواب حسن رضا خاں صفات شریفانہ اور اوصاف امیرانہ سے آراستہ تھے - نہایت فیاض منش , جودوکرم کا یہ عالم کہ ہمہ وقت ہزار ہا حاجت مند ڈیوڑھی پر حاضر رہتے اور نواب کے خوان کرم سے اپنا آزوقہ بہم پہنچاتے غریبوں اور محتاجوں کی کافی و وافی امداد و خبرگیری کی جاتی - کم وبیش دس ہزار آدمی مستقل طور سے اس سرکار فیض آثار کے زلہ خوار تھے -

نواب حسن رضا خاں کو مذہب میں نہایت غلو تھا حضرات اہل بیت علیہم السلام سے بے حد حسن عقیدت رکھتے تھے - چہاردہ معصومین کے نام پر فدا تھے - زمانۂ محرم میں عزائے حسین کا سامان بڑے تزک و احتشام سے ہوتا - لنگر خانے جاری کئے جاتے - غربا و مساکین پر تقسیم کا سلسلہ جاری رہتا - مسجدوں , کربلاوں , امام باڑوں میں کثرت سے نذرو نیاز ادا کی جاتی - خود اُن کی تعمیر کی ہوئی بعض عمارتیں اب تک ان کی امارت و ثروت کی یاد تازہ کر رہی ہیں - انہیں کی سعی جمیلہ سے قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مولانا سید دلدار علی صاحب نے مذہب امامیہ کی فقہی کتابیں تصنیف و تالیف کر کے شایع کیں جو مومنین کے واسطے مشعل راہ ہدایت بنیں اور بعض ملیہات شرعی کا ازالہ

ہوا جو اُس وقت لاعلمی کی وجہ سے عوام میں پھیلی ہوئی تھیں - نواب نے صرف یہیں تک فیض کا سلسلہ نہیں رکھا بلکہ اکثر ہندی نژاد عالموں کو عتبات عالیات روانہ کیا جو علمائے عراق و حجاز سے اجازہ لے کر واپس آئے اور اُن کے گھروں سے علوم کے چشمے جاری ہو کر اہل ہند کو سیراب کرنے لگے - وہ زمانہ لد گیا مگر آج تک اُن کا فیض عام جاری ہے —

نواب بے انتہا بات کے پکے اور قول کے دھنی تھے - کوئی وعدہ کر لیتے تو وہ پتھر کی لکیر ہوجاتا - ایک دفعہ نواب آصف الدولہ کی حضور میں راجہ ٹکیت رائے نے پچھتر لاکھ کی فرد حساب پیش کی نواب آصف الدولہ نے راجہ جھاولال کو حساب سمجھنے کا حکم دیا - اُنھوں نے ساٹھ پینسٹھ لاکھ کا غبن نکالا اور راجہ ٹکیت رائے پر عتاب آصفی نازل ہوا - عالم اضطراب و سراسیمگی میں راجہ موصوف کو بجز آستانہ نواب حسن رضا خاں کے کوئی امن و عافیت کا ٹھکانا نظر نہ آیا حیران و پریشان، مضطرب و بد حواس نواب کے محل کی طرف بھاگے - شام کا وقت تھا، نواب نماز مغرب سے فارغ ہو کر زیارت پڑھنے میں مشغول تھے - انگشت شہادت قبر مطہر امام مظلوم کی جانب بلند تھی کہ راجہ نے دوڑ کر قدموں پر سر رکھ دیا - ادھر نواب نے زیارت ختم کی، اُدھر راجہ نے گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کی کہ میری عزت اور جان و مال کا تحفظ حضور کی چشم عنایت پر منحصر ہے - نواب نے واقعہ دریافت کیا اُنھوں نے تفصیلی حالات گوش گذار کئے اور ممکن طریقے سے نواب کو رحم و کرم کی طرف مائل کیا - نواب نہایت رحیم النفس و کریم الطبع واقع ہوئے تھے راجہ ٹکیت رائے کے حال

پر ترس آگیا - تحفظ جان و مال اور حفظ مراتب کا وعدہ کرتے ہوئے یقین دلا دیا کہ " میں تمہارے سوا کسی کو اپنی پیش دستی میں قبول نہ کروں گا " اور اس وعدے پر تا مقدور قائم رہے - جب نواب آصف الدولہ کو معلوم ہوا کہ نواب حسن رضا خاں راجہ ٹکیت رائے کی پیچ پر ہیں تو انہیں بلا کر فرمایا نواب بھائی ! ایسے کور آنکھ کا رکھنا مناسب نہیں آپ راجہ جھاؤلال کو اپنی پیش دستی میں قبول کیجئے یہ نہایت متدین اور ایمان دار آدمی ہے - نواب حسن رضا خاں نے منظور نہ کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ جناب عالی اس معاملے میں اصرار نہ فرمائیں - میں نے راجہ ٹکیت رائے سے وعدہ کرلیا ہے اور اُس سے انحراف ممکن نہیں - یہ جواب نواب آصف الدولہ کے دل میں جم گیا - اگر چہ اُس وقت کچھ نہ کہا مگر بعد میں یہی خلش باعث تکدر طبع ہوی اور مولانا تفضل حسین خاں کو خلعت نیابت دیا گیا اور نواب حسن رضا خاں نام کو وزیر رہ گئے - پورے بیس سال تک اس عظیم المنزلت عہدے پر سرفراز رہے —

انہوں نے اسی عہد آصفی میں نواب آصف الدولہ کے حکم سے کلکتے کا سفر کیا تھا جو سنہ ۱۲۰۷ ھ یکم ماہ شوال سے شروع ہوکر سنہ ۱۲۰۸ ھ جمادی الآخر میں نو مہینے کے بعد ختم ہوا - سبب یہ تھا کہ گورنر جنرل لارڈ کارنوالس خدمت سے سبکدوش ہوکر ولایت جارہے تھے اور اُن کی جگہ سرجان شور آنے والے تھے - ایک کو رخصت اور دوسرے کا خیر مقدم کرنا تھا - اس سفر کی شان و شوکت ' جاہ و تجمل اور کروفر اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ پندرہ بیس ہزار کی جمعیت ' توپیں اور دو انگریزی

کمپنیاں ہم رکاب تھیں - راجہ تکیت رائے بھی جلو میں حاضر تھے - جدھر سے گذر ہوتا اتنی داد دہش کرتے کہ غربا و مساکین مالا مال ہوجاتے - بنارس و عظیم آباد میں بھی کچھہ کچھہ دن قیام کیا وہاں کے شرفا کو خلعتہائے فاخرہ اور محتاجین کو روپیہ تقسیم کرکے عازم مرشد آباد ہوئے - عشرۂ محرم یہیں بسر کیا - دھوم دھام سے مجلسیں منعقد کیں لنگر خانے جاری کئے - عشرۂ محرم گذرنے کے بعد کلکتے پہنچے اور شہر سے باہر پڑاؤ ڈالا - لارڈ کارنوالس سے اکثر دوستانہ ملاقاتیں ہوئیں اِنھوں نے نواب آصف الدولہ کی طرف سے تحفہ تحائف پیش کئے انھوں نے سرکار کمپنی کی جانب سے خلعتہائے مکلف عنایت کئے - اُن کے ولایت جانے کے بعد سر جان شور سے بھی شرف ملاقات حاصل کرکے عظیم آباد ہوتے ہوئے اودھ میں داخل ہوئے - پندرہ لاکھہ سے کچھہ زیادہ صرف ہوا —

جب سنہ ۱۲۱۲ ھ نواب آصف الدولہ نے وفات پائی اور نواب وزیر علی خاں کے مختصر دور حکمرانی کا آغاز ہوا' اُس عہد میں بھی نواب حسن رضا خاں کے اعزاز و اقتدار میں فرق نہیں پڑا' سابق کے مانند خلعتہائے گراں بہا سے ممتاز ہوئے - مگر اُس دور کو قیام نہ ہوا - ہوا کے جھونکے کی طرح آیا اور نکل گیا - نواب وزیر علی خاں کے عزل کے بعد نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی عمل میں آئی - اُصولوں میں بہت کچھہ تبدیلیاں واقع ہوئیں لیکن نواب حسن رضا خاں بدستور اپنے عہدے پر قائم رہے - نواب موجودہ نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح خلعت نیابت سے سر بلند فرمایا اور انھوں نے بھی اپنے پرانے عہد سے روگردانی نہ کی - پیش دستی کی خدمت راجہ تکیت رائے کے سپرد کی - چونکہ نواب سعادت علی خاں کو امور ملکی و مالی کے انتظام و انصرام میں کمال دلچسپی

تھی ، کل کام اپنے ہاتھوں انجام دیتے تھے ۔ نواب حسن رضا خاں تو اُسی معنی تھے ہی جب نواب نے ان سے کوئی کاغذ دریافت کیا تو انہیں جواب دینے میں تامل ہوا اور کاموں کی تکمیل میں تاخیر ہوئی تو نواب سعادت علی خاں کو جز بز ہونا پڑا ۔ اُنھوں نے وقتاً فوقتاً رزیڈنت سے کہا بھی کہ " جس ریاست کا نائب جاہل ہو اُس ریاست کا کام دقت سے خالی نہیں " ۔ مگر اس خاندان پر ابتدا سے سرکار اودھ کی عنایتیں مبذول تھیں لہذا عہدے سے معزول نہ کیا ۔ پھر بھی نواب آصف الدولہ کے عہد کی سی آسائشیں نہ رہیں ۔ اُس عہد میں حاضری اور دربار داری معاف تھی ۔ جی میں آیا تو مجرے کو حاضر ہوئے ورنہ گھر ہی میں استراحت کی اور اب بغیر حاضر ہوئے چارہ ہی نہ تھا ۔ صبح کو جب تک نواب حسن رضا خاں نہ پہنچ جائیں نواب کی حضور میں کسی امیر کا مجرا قبول نہ ہوتا ۔ چوں کہ یہ اھیم شحیم آدمی تھے اپنے مکان میں نرم و گداز صوفے پر بیٹھ کر خدمات متعلقہ انجام دیتے لیکن اب نواب سعادت علی خاں کے سامنے گھنٹوں کھڑے ہوکر ایک ایک کاغذ ملاحظہ میں پیش کرنا پڑتا طرہ یہ کہ جو وقت اِن کی استراحت کا تھا وہی وقت نواب سعادت علی خاں کے کاغذات ملاحظہ کرنے کا مقرر ہوا جس سے اوقات معینہ میں فرق پڑا اور عادات بدلنے سے صحت بگڑ چلی ۔ نواب سعادت علی خاں کی بے حد عنایتیں عذاب جاں ہوگئیں ۔ وہ جب ہوا کھانے نکلتے تو انہیں خواصی میں ساتھ لیتے ۔ اُن کے واسطے ہاتھی پر جو ہودہ کسا جاتا وہ نہایت مختصر ہوتا جس میں بیٹھنا کیا ہوتا گویا انہیں شکنجے میں کس دیا جاتا ۔ اِنھوں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ بلطائف الحیل علحدہ ہو جائیں مگر ممکن نہ ہوا ۔ سن بھی آچکا تھا ۔

بچپن اور جوانی تو آسائش و آرام میں بسر ہوئی لیکن عالم پیری میں مصلحت و مشقت کا سامنا ہوا انجام کار مرض موت میں مبتلا ہوے اور بعد نواب سعادت علی خاں ایک فرزند نرینہ مسمی نواب محمد رضا خاں چھوڑ کر سنہ ۱۲۱۶ھ میں انتقال کیا - انا للہ و انا الیہ راجعون —

نواب حسن رضا خاں خود تو شعر کہنے کے زیادہ عادی نہ تھے مگر شاعروں کی قدر دانی اور عزت افزائی میں بالکل کمی نہ کرتے تھے اکثر شعرائے وقت ان کے خوان یغما سے مستفیض و مستفید ہوتے تھے - چنانچہ مشہور و معروف شاعر میر غلام حسن ' حسن ' صاحب بےنظیر و بدر منیر بھی مدت تک ان کی سرکار میں حاضر ہوتے رہے - کبھی کبھی طبیعت حاضر ہوتی تو دو چار شعر موزوں کر لیا کرتے - اصلاح کا حال معلوم نہیں - غالباً کسی استاد وقت سے مشورہ کرتے ہوں گے ایک قدیم بیاض کے شکستہ و دیمک خوردہ ورق پر ان کے نام سے تین شعر نظر آے جو درج تذکرہ ہیں —

ٹپک رہی ہے' ہواؤں سے کچھ عجب مستی   چمن میں آج مقرر کوئی شرابی ہے

وہ کل کی طرح نہ آئیں گے آج بھی ہمدم   کہ آپ ہی آپ مرے دل کو اضطرابی ہے

' رضا ' کی نعش خبردار اے لحد کی زمیں

اسے فشار نہ دینا کہ بو ترابی ہے

میر تقی میر کے سلام اور مرثیے

میر صاحب کا کلیات دوبار چھپ چکا ہے۔ حیرت ہے کہ اس میں ایک مرثیہ یا سلام بھی نہیں۔ یہ مرثیے اور سلام حضرت علی خاں صاحب رحمانی دہلوی نے میر صاحب کے کلیات کے ایک معتمد قلمی نسخے سے نقل کرکے اردو کے لئے بھیجے ہیں جو ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ اردو کے مرثیوں میں حال کے مرثیوں کی سی بلند آہنگی، شان و شکوہ اور شاعرانہ نازک خیالی نہیں پائی جاتی۔ اُن کی بڑی صفت زبان کی سادگی اور سوز و گداز ہے جو مرثیے کا اصلی مقصد ہے۔ یہی شان میر صاحب کے مرثیوں کی ہے۔ میر صاحب کی ہر چیز قابل عظمت ہے اور یہ کلام بھی نادر اور یادگار سمجھ کر شائع کیا جاتا ہے تاکہ گمنامی سے محفوظ رہے —

اڈیٹر

سلام

اے سبط مصطفیٰ کے تجکو سلام پہنچے!　　اے جان مرتضیٰ کے تجکو سلام پہنچے!
اے حکم کش قضا کے تجکو سلام پہنچے!　　اے غمزدہ صدا کے تجکو سلام پہنچے!

بھائی بھتیجی پیاری یارو رفیق سارے　　ساقیٔ کوثر آکے کیا تشنہ لب سدھارے
پالی جو اُن نے مانگا سو تیر تجکو مارے　　اے خستہ دل جفا کے تجکو سلام پہنچے!

ہا ہا شہ ولایت نانا کی خلق اُمت　　دریا کنارے اُترے سارے وہ بے مروت
تو تشنہ کام و تنہا یہ رنج یہ مصیبت　　اے مبتلا بلا کے تجکو سلام پہنچے!

اللہ رے تیری عزت مرنا جو تونے ٹھانا　　زنہار منہ نہ پھیرا کو پھر گیا زمانا!
آتا ہے کس سے ایسا بیکس ہو سر کٹانا　　اے دل زدہ رضا کے تجکو سلام پہنچے!

برسا کی تیغ لیکن تو نے سپر نہ رکھی!　　دریا بہا کیا پر تو نے نظر نہ رکھی!!
کیا کہئے جب توجہ ہی جان پر نہ رکھی　　کشتہ ہیں اس وفا کے تجکو سلام پہنچے!

تسلیم کا رضا کا دیکھا ترا عجب ڈھب　　وقت بریدن سر سجدہ میں تھا سرِ رب
یہ بندگی الٰہی یہ انکسار یارب!　　اے شوق کش خدا کے تجکو سلام پہنچے

عباس میں گر پڑا تھا گرم آہ کا پیالا　　چھینٹیں پڑیں جو تجھہ پر سہماوہ لانے والا

قصہ کو کہا گیا تو منہ سے نہ کچھ نکلا ! اے صاحب حیا کے تجکو سلام پہنچے

تعریف سے ہے باہر سید ترا یہ سا کا شایستہ معرکہ میں تو ہی تھا اپنی جا کا
اب نقش ہے دلوں پر تیرا ثبات پا کا اے باب صد ثنا کے تجکو سلام پہنچے !

درویش بے بضاعت ہے 'میر' دست کو تہ
غیر از سلام تحفہ رکھتا نہیں ہے کچھ وہ
ہر لحظہ اور ہر دم ہر گاہ اور بے گہ !
اے شاہ دو سرا کے تجکو سلام پہنچے !

مرثیہ

کرتا ہے یوں بیان سخن ران کربلا احوال زار شاہ شہیدان کربلا
با آنکہ تھا فرات پہ میدان کربلا پیاسا ہوا ہلاک وہ مہمان کربلا

انصاف کی نہ ایک نے کی چشم نیم باز کھولے ستم کے ہاتھ زبانیں کیاں دراز
قتل امام مقصد و تھا روِ نماز ! بدتر تھے کافروں سے مسلمان کربلا

سیلاب تھا بلا کا ہر اک سمت گرم جوش فریاد بیکساں کی طرف کم کسو کے گوش
آل نبی تمام ہوے خوں سے سرخ پوش صلوات بر حسین و جوانان کربلا

انواع جور مدعی ایجاد کر گئے ! تخت و کلاہ احمدی برباد کر گئے
کیا تیرہ روز شامی بھی بیداد کر گئے پایا زبون مور سلیمان کربلا

یا رب نہ تھا سپہر نہ اس وقت کوئی کیا !
جب سر پہ اہل بیت کے تھی اس قدر جفا
ہوتا تو کوئی دیتا ہی سر کو ٹلک جھکا !
تا لا مکان تھا شور فریباں کربلا

نوک سناں پر رکھہ کے چلے لے سر امام
ناموس کو جو لوگ تھے بلدے ہوئے تمام
ٹکڑے جگر کے ہوتے تھے جب کرتے تھے کلام
بے خانماں وہ جمع پریشان کربلا

بیٹے بھتیجے اسکے جوان مارے سب پڑے
ہو ٹکڑے ٹکڑے سامنے بیکس بہت لڑے
فرصت نہ اتنی دی کہ کوئی خاک میں گڑے
پوشیدہ کیا ہے ظلم نمایاں کربلا

سر اُسکا کٹ کے نیزہ کے اوپر رکھا گیا !
او بیزہ پانی چڑھ کے جیونکو ڈوبا گیا
ہر چند بوند پانی کے کوئی نہ پا گیا
لیکن خدا کا قہر تھا طوفان کربلا

تھی عابدین کے لب پہ شکایت یہ خونچکاں
کا ہے چرخ آہ کیونکہ نبھے گا یہ کاروان

اُرہو جلوری سنہ ۳۱ ع

یہہ لب ھیں زیر بار الم میں ھوں ناتواں
طے کس طرح سے کوئے بیابان کربلا

مشفق پدر تو رخت سفر کر گیا ھے بار
بھائی کو اُس سے آگے ھی توھی دشمنوں کی مار
ھوں میں برھنہ پا سو مرض سے ضعیف و زار
پھر ھر قدم پہ خار مغیلان کربلا

ھیں تو دہ تو دہ لاشوں پہ جنگی یہ خاک دھول
سب یہ شگفتہ رو ھیں ذکا ھوں میں جس سے پھول
مدہ دیکھہ انکے کہتے تھے صلوات بر رسول
گلزار تھی یہ وادی ویران کربلا

اب سب ھی خاک و خوں میں وھی ھیں اتے پڑے
اشجار نونہال ھیں سارے کٹے پڑے
دل ھیں فگار و سینے ھیں سب کے پھٹے پڑے
مسلخ سے کم نہیں وہ گلستان کربلا

جل جل کے ایک ایک سے اُسکا تھا یہ خطاب
کاٹے تو م بس بہت ھوئے اب کم کرو عذاب
پہلو سے میرے ھے جگر دوست بھی کباب
رکھہ ھاتھہ دیکھہ سینۂ بریان کربلا

یہہ آگے جانتے نہ تھے دیکھیں گے یہ ستم
خون پدر کرے گا زمیں پر کریں گے دم
اندوہ و درد و رنج و الم اب ہے اور ہم
خورد و کلاں ہیں کشتۂ احساں کربلا

سو قوت ضم نہ ہو گا یہ جب تک کہ ہوں گا میں
مدت تلک مصیبتیں اپنی کہوں گا میں
جیتا رہوں گا جب تئیں روتا رہوں گا میں
اب تھم چکے یہ دیدہ گریان کربلا

زینب کے لب سے حرف نکلتے تھے شکوہ ناک
آشفتہ ہو وہ سر میں کھڑی ڈالتی تھی خاک
کہتی تھی تا سپہر نہ کر اے خدائے پاک!
جاتی نہیں یہ نالہ و افغان کربلا

شاید غبار رکھتے ہیں چشمان مہر و ماہ
احوال پر ہمارے نہیں مطلقاً نگاہ!
پردار ہے جو گر پڑے گردوں روسیاہ
ہیں سر برہنہ خاک نشینان کربلا

باد شمال ظلم ادھر کو جو آ گئی!
ایک ایک کر کے دین کی شمعیں بجھا گئی

دل داغ سارے کر گئے سینے جلا گئے
سب اُڑ گئی ہے خوبیِ ایوان کربلا

پیٹے ہیں ہم حسین کو جو کھول کھول بال
کیا خاطروں سے جاتے رہیں گے ہمارے حال
اشجار بعد کے جو رہیں گے سو سالہائے سال
دیویں گے بادلی سر مریان کربلا

کرتے جو نوحہ لاشوں پہ ہم جمع آ ہوئے
آنکھوں سے دل کے ٹکڑے گرے بال وا ہوئے
بیجا ہمارے شور سے وحشی بجا ہوئے
دیوان ہوا ہے حشر کا دیوان کربلا

اس لوٹے کاروان کا دیکھے کوئی گذار
یہہ سانحہ ہوا ہے زمانے میں یادگار
عترت نبی کی ننگے سر اونٹوں پہ تھی سوار
سعدا وہ نالہ کش ہے حدی خوان کربلا

وارث کے پیچھے جانیں گئیں وسوسوں سے ہائے
کیا ظلم چرخ کرتے ہیں ہم بیکسوں پہ ہائے
کیسی کڑی اُٹھائی ہے ہم نے جیوں سے ہائے
کس سے کہیں یہ درد فراوان کربلا

ناگه جو لاش پر قاسم کے جا پڑی ! 　　ساعت وہ گزری اهل حرم پر بہت کڑی !
ماں اس کی سر کو پیٹتی پہرتی تھی ہر گهڑی ! 　　هے دیدنی یه نوشۂ ہیجان کربلا

دن چن کے دشمنوں نے عزیزوں کے کاٹے سر 　　مارا پڑا رئیس تلف هو گئے پسر
سر پر نه عورتوں کے ردا تهی نه ان کو گهر 　　آئی نه کام همت مردان کربلا

آیا جو شه یہاں سو یہیں کا یہیں رہا ! 　　انواع جور و ظلم ستم جان پر سہا
آخر کو خون اس کا یہیں خاک پر بہا 　　نکلا نه پهر وہ یوسف زندان کربلا

آنکھوں کو جسکی رہ میں بچھایا کئے هیں هم 　　منت سے جس کے ناز اٹھایا کئے هیں هم
مسند په ناز کی سے بٹھایا کئے هیں هم 　　سو خاک میں پڑا هے وہ سلطان کربلا

یه مرده هے تو دیکهیو که دریا بہا کیا 　　خیمه کهڑا کنارے په اس کے رہا کیا
شه پر طفل پالی هی پانی کہا کیا ! 　　پیاسا موا ندان وہ نادان کربلا

بالفرض دشمنوں نے نه کی اس طرف نظر 　　کہنه سے هونٹ بهی تو همارے نه چاهے تر
ایک ابر آن کے بهی نه برسا تنک ادهر 　　تا آسماں تهی شورش غلطاں کربلا

کلثوم یوں تهی لاش په بیاکی کی حرف زن 　　سر کیا هوا که خاک میں پا مال هے بدن
پهر کیا رهے که اب نہیں ملتا تجهے کفن 　　اے بادشاہ بے سرو سامان کربلا

ہم کچھ کریں جو فکر سو قدرت نہیں ہمیں
ماتم میں تیرے بیٹھیں سو فرصت نہیں ہمیں
مہلت کی رہ میں کوئی سو مہلت نہیں ہمیں
رسوا اُٹھ کر رہے ہیں نگہباں کربلا

مہمانی ہم مسافروں کی کیا رہے ہیں یہاں
لخت دل و جگر تھے جو مارے پڑے جواں
کھانا نہ ملے یہاں نکلا دم آب و پارہ نان
دیکھے سو اب یہہ لقمۂ الوان کربلا

اس خاک پر اُتر کے نہ فرصت تجھے رہی
درپیش ہر دم ایک قیامت تجھے رہی
بیدلوں سے یہاں کے کدورت تجھے رہی
شایستگی مگر نہ تھی شایاں کربلا!

ہوے خوشی کسو کو تو ہوے شگفتہ روا
شادی ہو جان کو تو کرے ہلس کے گفتگو
تھی رونے کی جگہ کہ بعدو ہم نہ تھے ترا
لبہائے زخم تھے اب خنداں کربلا

ہفتہ سے آب و دانہ کا قدغن ہوا تھا یہاں
جز ذکر تیغ تیز نہ کچھ آیا درمیاں
سادات کشتہ جانتے ہیں یا اُنہوں کی جاں
جو دیکھ کر موے ہیں یہ حرمان کربلا

یہاں سے نہیں چلے ہیں ہم ایسے ہو پائمال
جو خاطروں سے اپنی فراموش ہو یہ حال
اب جا چکے داروں سے یہ حیرانی و ملال!
رہے گا زندگی تئیں حیران کربلا!

القصہ بیت رو کے گئے آگے وے اسیر
دل چاک سر میں خاک جوان اور خوردہ و پیر
بس تو بھی اپنے ہاتھ سے رکھ کر قلم کو میرؔ
کہہ باد سے کدھو وے گل افشاں کربلا

بعد از نماز و سجدہ کرے عرض یہ التماس !　　کاے شاہ بندہ پرور و قدر گہر شناس
مقصود میرا یہ ہے کہ اب ترک کر لباس　　جوں زائران خاک کو چھان کربلا

ہندوستان سے قطرہ زن آوے چلا ہوا　　مانند ابر جلد بھرے دل بھرا ہوا
تو ملتفت ہوا کہ یہ مطلب روا ہوا　　دیویگا پھر خدا تجھے یہ آساں کربلا

—‡*‡—

مرثیہ

فلک قتل سبط پیمبر ہے کل　　یہ ہنگامہ ہونا مقرر ہے کل
سحر شام تیرہ سے بدتر ہے کل !　　بلا کل مگر ہے کہ محشر ہے کل

کہاں ہوگا افسر سر شہ کہاں !　　یہ خیمہ کہاں اور خرگہ کہاں
جو کچھ حشم ہے آج سو یہ کہاں　　نہ حاکم نہ یاور نہ داور ہے کل

نہ ہوگا کوئی جو کرے داوری !　　رہےگی وہ لاش اس زمین پر پڑی
نگہبان ہو گا خدا ے قوی !　　مصیبت عجب ایک اس پر ہے کل

نہ ہوگا کوئی یار و انصار آہ !　　نہ خویش و برادر نہ رتبہ نہ جاہ !
مریگا بہت ہو کے بیکس وہ شاہ　　نہ قاسم نہ اکبر نہ اصغر ہے کل

جو بازو ہیں جاویں گے سب دیکھے جاں   نظر جسکے اوپر کرے سو کہاں!
ستم ہوگا چار و نظرت سے عیاں   نہ احمد معاون نہ حیدر ہے کل

نہ عباس ہوگا نہ ہوگا علم!   کہ ہاتھ اُس کا بازو سے ہوگا قلم
رہیں گے جو پیچھے کسان حرم   سو ان کو نہ جاگہ نہ گھر در ہے کل

سر دہ نہ ہوگا یہ اسرار ہے   کسان حرم اور بازار ہے
رہے گا جو سجاد بیمار ہے   سو اُس کو نہ دارو نہ بستر ہے کل

معزز حرم کے رہیں گے جو لوگ   پریشان پھریں گے گرفتار لوگ!
اسیری و غارت سے چالوں کو روک   نہ پردہ اُنھوں کو نہ چادر ہے کل!

دم آب ہووے گا نایاب وہاں   نہ کلمہ قبیلہ نہ احباب وہاں
نہ دولت برادر نہ اسباب وہاں   نہ ساماں نہ سر ہے نہ سرور ہے کل

جہاں جائے غیرت ہے کیا اعتبار   ہمیشہ نہیں ایک کا اختیار
شکستہ شہ دیں سے ہے آشکار   نہ وہ کوکبہ ہے نہ لشکر ہے کل

تن نازنیں ہوگا کہاں تک تمام   بلا ہوگا اس ایک پر ازدحام
جبیں سے بہیگا لہو لعل فام   گلوئے مبارک پر خنجر ہے کل

بھیا جو بیٹا سو ہوگا اسیر   عزیز حرم سب بحال فقیر
کیا کرتی ہونگی صغیر و کبیر!   کہاں ایسی غارت سے وہ گھر ہے کل

سکینہ کہیگی پدر کیا ہوا ! | کرے دل وہی جو گلے سے لگا
نہ کلثوم کے پاس ہوگی ردا | نہ زینب کے تارک پہ معجر ہے کل

قیامت ہے ودھر کو ہوگا گذار | جدھر اسطرح کا ہوا کار زار
نظر آویگی لاش شہ ایکبار | نہوگا وہ ساماں نہ وہ سر ہے کل

ذالک حال پر تیرے روتے ہیں آہ ! | کہاں ہونگے یہ دیدۂ مہر و ماہ
جہاں اُسکی آنکھوں میں ہوگا سیاہ | کرے سو جہتا تو ، تو بہتر ہے کل

نہو ویگا سادات میں مرد ایک | مگر عابدیں زار اور زرد ایک
زمیں سے اُٹھیگا سیہ گرد ایک | سپہر بریں تک سکدر ہے کل

سر شہ سناں پر رکھا جاویگا | اڈا قافلہ بھی چلا جاویگا
بس اب مت لکھے کیا لکھا جاویگا | زمانہ ہی اے سپہر دیگر ہے کل

مرثیہ

سنو یہ قصۂ جانکاہ کربلائے حسین | رکھو اٹھاکر کوبھی تک گوش از برائے حسین
جہاں سے واسطے امت کے جو سدھائے حسین | ہزار حیف کہ اُمت نہو فدائے حسین

حسین آکے مدینہ سے خانماں سے گیا — حسین تشنہ گرسنہ ہو اس جہاں سے گیا
حسین بیکس رہے یار اپنی جاں سے گیا — جگر ہو سنگ کا سنتی گر ماجرائے حسین

حسین بیدل و غمناک بیوطن ابتر ہوا — حسین جی سے گیا ٹکڑے سب بدن اسی ہوا
حسین کو نہ رہی گور بے کفن بیو ہوا — حسین کو کوئی کیا کہکے روئیے ہائے حسین

حسین کا سا جگر کن نے پار کیا ہے کہو — کسو نے جی کے تئیں اسطرح دیا ہے کہو
کوئی تو خوں جگر جن نے یوں پیا ہے کہو — حسین جانے ہے یا جانے ہے خدائے حسین

جبیں پہ زخم لگا چشمہ چشمہ خون بہا — خیال آئے بہت دل میں لیک کچھ نہ کہا
جھکاکے سرکے تئیں سجدے میں رہا سو رہا — جفا کی تیغ تلے مرات دق فدائے حسین

جو تعزیہ کی ہو مجلس بکا کرو یارو — غم حسین میں چپکے رہا کرو یارو
بجائے چشم بدن اب گوش وا کرو یارو — کہ سرگزشت کہی ہے سر جدائے حسین

حسین کشتہ ہوں تیرے ثبات پا کا ہائے — حسین تو ہی تھا شایستہ اپنی جا کا ہائے
تھوا ہی کام اٹھانا تھا اس بلا کا ہائے — کیا ہے ایسا جگر کن نے تجھ سوائے حسین

کہیں عزا کہیں آنکھوں کو چشمہ ساں ہیں جوش
تمام خلق میں انواع ہیں کے جوش و خروش
جہاں کے قدس کے باشندگاں میں سیاہ پوش
نہیں ہیں ہم میں فقط [illegible] وفائے حسین

جڑا حتوں سے تھا یا ٹوٹ رنگ خوں جاری　　حسین ہائے ڈیری اُٹھ گئی سبھا ساری
لڑی سی ٹوٹ گئی موتیوں کی یکبارو　　ملے ہیں خاک میں کیا لعل پارہ ہائے حسین

کیا حسین کا برباد خاندان سارا　　پسر حسین کا کس ظلم سے جواں مارا!
حسین آپ موا بھاسا نہ بیچارا　　حسین رونے کی جا کہ ہے ہائے حسین

حسین جان سے اپنی گیا نہ دم مارا!　　ہزار حیف کہ اس کو بصد ستم مارا
اسی کا دل تھا جو اس راہ میں قدم مارا　　رضائے حق ہی جو کچھ تھی وہی رضائے حسین

حسین دل زدہ نے صبر سا کیا ہے صبر　　ہوا ہے تشنہ لبی سے قیامت اس پر جبر
ہزار حیف نہ صحرا سے اٹھ کے برسا ابر　　دریغ! پانی نہ دریا کنارے پائے حسین

غضب ہوا ہے ان اسلامیاں بیدیں سے　　حسین قتل ہوا سر جدا کیا کیں سے
نکالے اُس کے جنازے کو کوئی تزئیں سے　　ہوا اسیر پسر جورہا بجائے حسین

ملی حسین کی آنکھیں کہا بلا آئی　　تمام فوج مخالف کی اس طرح دھائی
جفا رہے ہرے لوگوں کو کیسے دکھلائی　　جلائے خیمے لٹائے حرم سرائے حسین

حرم کے لوگ معزز تھے مو پریشاں سب　　برہنہ پاوسر اُوانو نہہ تھے نمایاں سب
ہرشتہ سوختہ اس واقعہ سے حیراں سب　　زباں پہ ہائے حسین اور لب پہ ہائے حسین

کوئی تھی نوحہ کی سرگرم غمکش و ناشاد کسو کے دل سے نکلتی تھی ہو کے نہاں فریاد
سکینہ روتی تھی ہر لحظہ باپ کو کر یاد رہی نہ رکھ کسو کی مگر ملائے حسین

کوئی کہے تھی کہ اکبر کو مرنے جانا تھا ! نہ جنگ گاہ میں عباس کو بلانا تھا
چچا کے ساتھ نہ قاسم کو آہ لانا تھا کوئی رہا نہ جسے ہم کو سونپ جائے حسین

کوئی کہے تھی کہ ہے عابدین بہت بیمار ! ابھی تو شدت تپ سے ہے اُس کا زار نزار
گرے ہے اُس پہ بھی دل جوئی ہووے ہے تلوار ولے سکینہ کی خاطر کہاں سے لائے حسین

رسن سے ہاتھ بندھے ہیں ناتواں کو روتا ہے ہمارے شور و بکا سے حواس کھوتا ہے
سکینہ کہتی تھی بابا تو داغ ہوتا ہے کہاں حسین جو اُسکو گلے لگائے حسین

کوئی کہے تھی کہ اب اک یہی ہے نام خدا سوائے اسکے جو دیکھو تو کوئی بھی نہ رہا
زناں اسیر ہوئیں مرد ایک ایک موا کہاں حسین کے گذرے اقربائے حسین

عزیز و خویش و پسر لگ گئے کنارے سب ! ستم سے ظلم سے یعنی گئے ہیں مارے سب
غریق خون کے دریا میں ہیں بچارے سب کوئی لگا نہ چڑھتا تھا آشنائے حسین

کوئی کہے تھی کہا ہوگا منہ لے کیا کہیے ! یہی ہے مصلحت اب تو کہ جور ہی سہیے
گلے کو رکھ کے تہ تیغ جن کے سر رہیے نہ ملتفت ہوئے کہنے کو کچھ حیائے حسین

کوئی کہے تھی کہ ایسا نہ ہوے گا کوئی   ہر ایک بات میں تھی قابوؤں سے دو دو کوئی
سلوک اُس کے کریں یہ نہ پایا کہ دام پڑی!   کہیں سو کہا لوہی اس سقہ عہد تمنائے حسین

سہا یہ کہ ستم فلک کو مگر تھا سودا کچھ   کہ اُن نے ترک نہ کی اس ستمگاں کی پروا کچھ
اُدھر تو سودے کریں اِدھر سارا کیا کیا کچھ   سوائے غصہ و غم اور کچھ نہ ہوا ئے حسین

کوئی کہے تھی کہ رکھتا نہ تھا حسین نظیر!
برابری نہ کوئی اُس کی کر سکے گا امیر!
... ...!
جہاں کو قتل تو ہوے نہ خونبہائے حسین

کوئی کہے تھی کہ غارت ہوا ہمارا گھر!
ملا ہے خاک میں سب ناز کوں ہوا انسر
حرم کے لوگ جو ہیں سو ا سہر و کرم سفر!
رہے تو روو ے کوئے لے کوئی عزائے حسین

بہن سے کہتی تھی رو رو کے زینب اے کلثوم
چلا تھا بھائی مدینہ سے کیسے وقت شوم!
ہتا ہی راہ جو کرتا تھا قطع تھا معلوم
کہ سر کے مارے ہی جاتا تھا مدعائے حسین

کبھی کھیے تھے زمانہ اُلٹ گیا اک بار
نہ اس چمن میں رہے کچھ نہال نے تھے خا
خزاں نے لوٹتے ھوں کیا پات پات کر گلزار
ھوا اب اوروں کو ھے یہاں کہ اب ھوائے حسین

کوئی کہے تھی کہ یہ بھی خدا کی باتیں ھیں
کبھو کے ٹس پڑے ھیں یاں کبھو کی راتیں ھیں
فغاں کھوے وھی دشملوں کی گواتیں ھیں
نگوں پڑا ھے سر خاک پر لوائے حسین

کوئی یہ کہتی تھی وہ وقت آگیا دیکھو! — امام وقت گلے کو کٹا گیا دیکھو ! ! !
جراحت ایسی سر اوپر اُٹھا گیا دیکھو — کہ سر رہا نہ جو سجدے کو پھر جھکائے حسین

وہ ابتدا ھے محمد گلے لگاتا تھا ! — وہ اور عزیز بہت رکھ کے سر چڑھاتا تھا
سو کربلا میں سر اُس کا سناں پہ جاتا تھا — دکھائے چرخ نے اس طور اٹھائے حسین

یہ کہہ کے شام کی جانب ھوے اسیر رواں
قلم کی 'مہر' نے بے تاب ھوکے رکھ لی زباں
کہ آگے خوب نہ تھا ایسے واقعہ کا بیاں
شفیع حشر میں بس ھے اُسے لائے حسین

مرثیہ

آئی ہے یہ شب قتل حسین ابن علی کی
رخصت ہے سحر عترت والائے نبی کی
کٹ جائیگی سب آل رسول عربی کی
برہم ہوئی جاں کو صحبت یہ کبھی کی

جب اُس شہ مظلوم سے تلوار چلے گی
گرد اُٹھ کے سوئے چرخ کی لاچار چلے گی
پاؤں کے تلے سے زمیں یک بار چلے گی
اُڑ جائے گی نیند انس و ملک و جن و پری کی

لوگو جو مقدر ہو شہ دین کا مرنا　　آزار دلی دیکھنا اس جان کا کھونا
احباب جو ہیں ان کو قیامت تئیں رونا　　کس طرح ظفر ہووے نہ اس قوم دنی کی

یاں احمد مختار کا کرنے کے نہیں کچھ　　اور حیدر کرار کا کرنے کے نہیں کچھ
ہم عابد بیمار کا کرنے کے نہیں کچھ　　کیا دیکھو ہو اس قوم نے دل لیا طلبی کی

یہ صرفہ چلے آوینگے غارت کے بہانے　　لیجا ڈینگے لوگوں کے تئیں پاؤں چلا کے
دیکھوگے کہ اس سرا پاے جفا لے　　وارث سوئے بار ہیں تو جدا سے نہ کٹی کی

دم لینے نہ دیوینگے جو ہو ماتم مظلوم ازمان کروگے تو تمہیں ہوویگا معلوم
خوش ہوونگے دیکھیں گے اسیروں کو جو مغموم ان بدگہروں نے کوئی بھی بات بھلی کی

القصہ وہ سب شام کی جانب کو چلیں گے
دل اور جگر آتش کر تب سے جلیں گے!
کم فرصتئی وقت سے تک دم بھی نہ لیں گے
سن لیجو کہ عابد نے بلا رنج کشی کی

یک چند جدا جا کے وہ رنجور رہیگا
بے گور و کفن یہ تن پر نور رہیگا
ہر جاے بہم دہ ملک دور رہیگا
کیا سمجھے تھے وے لوگ جو یہ بے ادبی کی

ہووے گا نمودار سحر کا جو ستارا!
ہوگا تمہیں سے شام کے لوگوں کا نظارا
میدان میں نکل صف یہ شہ جائیگا مارا
ساتھ اوس کے اجل آویگی یک بار سبھی کی

ہرگز نہ ملے گا کسی کو ایک دم اب
کیا خورد کلاں پیاس سے ہو جاوینگے بیتاب
تڑپیں گے پڑے خاک میں کیا کیا گہر ناب
دریا پہ یہ آفت پڑے گی تشنہ لبی کی

اکبر کو تڑپتے کہیں وہ دیکھے گا مظلوم
مرتا کرے گا گود میں اصغر کو یہی معلوم
سن لیوے گا قاسم کی ہلاکی کی پڑی دھوم
لجاوے گا سب مرتے ہوئے جی ہی میں جی کی

گزرے گی جو کچھ سر کے اوپر سب وہ سہے گا
بیٹوں میں بھتیجوں میں کوئی کم ہی رہے گا
جو وارثی کر لاش کی یک بار کہے گا
اوقات نے دیکھوگے بہت اُس سے کمی کی

لے جائیں گے پھر سر کے تئیں نیزے چڑھا کر
برپا کریں گے حشر عجب خیموں میں جا کر
لاویں گے بلا ایک حرم شام میں آ کر
دلجوئی نہ عابد کی تسلی نہ کسی کی

کچھ کہہ نہ سکے گا کوئی واں فرط الم سے
چھینیں گے ردائیں سر سکان حرم سے
در گوش سکینہ کا اتاریں گے ستم سے
دلداری کرے گا نہ کوئی باپ موئی کی

محجوب نہ ہو گا کوئی شبیر کے رو سے
ہو گا وہ پڑا خاک میں آلودہ لہو سے
کہاریں عما آنکھ ملاوے گا کسو سے
کچھ چشم کسو سے نہ جسے داد رسی کی

جس جا تھا پڑا خاک میں وہ گلبدن پاک — ہووے گی کبھی سوکھ کے گلا زہرا غمناک
کلثوم اڑا دیگی کبھی ہو کے بہت خاک — پرسش نہ کرے گا کوئی اس خاک ملی کی

اصغر کے لئے بانو الم ناک پھرے گی — آنکھوں سے لہو روتی جگر چاک پھرے گی
فریاد کناں منہ کو ملے خاک پھرے گی — سننے کو نہیں بات کو اس جان جلی کی

مرثیہ

کیا گردوں نے فتنہ کو اشارا — بلا کو کربلا میں لا اتارا
ہوا آخر طلب سوہ ہمارا — لٹا ناموس پیغمبر کا سارا

مروت شامیوں سے بن نہ آئی — ہوئی بے چشم و روئے بیوفائی
ستم کی تیغ سب نے آزمائی — حسین ابن علی کو جی سے مارا

رہا جو عابدیں سو زار و بیمار — اٹھانا یک قدم کا جس کو دشوار
بلا کا مبتلا غم کا گرفتار — غریب و بیکس و بے یار و یار

خطاب اس کا تھا ہر دم آسماں کو — کہ دم ہے ظالموں ہمدیدگاں کو
دیکھا یا توڑے بندہ کو جہاں کو — مگر رکھتے نہ تھے ہم سب ستارا

فلک تو نے عجب چوپڑ بچھائی ! سمجھ میں چال تیری کچھ نہ آئی
امام دیں نے جاں بازی لگائی ! موا لیکن نہ اپنے جی کو ہارا

چلا وہ قافلہ لٹتا ہوا جب ! انہوں کے پیش رو عابد جیسے تب
کوئی روتا کسو کے نالہ بر جپ　کسو کو زندگانی ناگوارا !

کوئی رو کے زہرا کو پکاری　کہ دیکھو خوار ہے اولاد ساری
نہیں لیتی خبر جو تم ہماری　ہوا شاید جگر پتھر تمہارا

کیا ہے چرخ نے ناشاد ہم کو　کیا ہے اس طرح برباد ہم کو
نہیں کرتی جو مطلق یاد ہم کو　مگر تم نے ہمیں دل سے بسارا

ضرورت ہے کہ ہو ٹک تم بھی آگہ　مصیبت پڑ گئی ہے ہم پہ ناگہ
ہمارا حال ہے رونے کی جاگہ　کرے آ سب کھڑے ہو کر نظارہ

جگر ہم سب کے اس غم سے پھٹے ہیں　شجر اس باغ کے سارے کٹے ہیں
گل و بوٹے ہٹے ماتی میں اٹے ہیں　جفا کا ہر طرف چلتا تھا آرا

نہیں بھائی بھتیجوں کا ٹھکانا　میسر سب کو آیا جی سے جانا
کسو کا تن ہے تیروں کا نشانا　کسو کا سر ہوا ہے چار پارا

—‡*•*‡—

مرثیہ

اس گل باغ امامت کے ہیں پھول آبیاری جنکی کرتی تھی بتول
سوتن نازک پہ اس کے خاک دھول دیدنی ہے رنگ صحبت یا رسول

گل سبھی اس باغ کے مرجھا گئے پودے پامالی میں سارے آ گئے
جور کے آرے شجر سب کھا گئے جڑ گئے گلبن سبز و خرم ہے ببول

شامیوں کے ظلم سے ہو کر ہلاک ال لے جانی گئے کس کی مشت خاک
دھوپ میں جلتا رہا وہ جسم پاک سایہ پرور کو گئے تم اپنے بھول

اب نہیں ہے برگ و بار و بر کا نام خار غنچہ ہور ہے ہیں کام کام
سیر کر تک جور کے پیشوں کا کام کچھ نہ چھوڑا کیا فروغ و کیا اصول

پھر گئی کیا آہ یک باری ہوا اُڑ گئے سب طائران خوش نوا!
کیا زمانے نے ستم رکھا روا! جائے بلبل زاغ بیٹھے پھول پھول

ظالموں پر مردہ کل سب کر گئے خار و خس سے گلستاں اب بھر گئے!!
آدمی کی جنس یعنی مر گئے باغ جنگل ہوگیا پھرتے ہیں غول

الغرض میدان میں شہ مارا گیا! دار و دشنہ قتل ہو سارا گیا!
عابدین کا یاور و یارا گیا کرتے ہیں کیا کیا فضولی اب فضول

جس کا نانا رحمۃ للعالمین ! — باپ جس کا وہ امیر المومنین
خود امام بر حق دین مبین ! — جس کو ماریں یہ ظلوم ایسے جہول

پھر وہ مارا جائے یوں بیکس غریب! — نے کوئی جس کا رہے یار و حبیب
کیوں کہ ہووے مشت خاک اُس کو نصیب — زندہ دے کون آکر کیسے پھول

داد چاہیں کیا شہ مقبول کی ! — لاش پہنچا دیں کہاں مقتول کی
اصل ہے معلوم اس مجہول کی — دم زبان خلق جو نا مقبول

نوزدہ سالہ پسر اک رشک ماہ — لڑتا تھا خاک و خوں میں پیش شاہ
ہو جہاں کیوں کر نہ آنکھوں میں سیاہ — اُس جگر پارہ کے اُٹھیں برچھی کی ہول

اک پسر شش ماہہ لاگا جس کے تیر — خون ہوا جس سے دل برنا و پیر
ہوگا جس پیارہ دلارہ صغیر — اُس کے دل میں کیسے لگتے ہونگے پھول

زور دکھلانے کا کچھ حاصل نہ تھا ! — قافیہ یہ مرثیہ قابل نہ تھا
ہم سے پھر مجکو دماغ و دل نہ تھا — ورنہ دیتا بات کو میں اور طول

تھا غرض شاداب یہ گلستاں — پھول جا تھے رنگ رنگ اس میں عیاں
آگئی یک بار اس پر یوں خزاں — کل جو تھے غنچے ہوئے ہو کر ملول

یہ چمن جو سبز و باخورم رہا ! خوبی و رونق ہی کا ہمدم رہا
ہر گل و بوٹے پہ اک عالم رہا حظ روحی اُس سے ہوتا تھا حصول

ہوگیا ہے سو وہ اب ماتم کا گھر جھڑ پڑے اُس کے گل تر خاک پر
دیکھئے اُدھر تو خوں ہووے نظر درد و غم بن کچھ نہیں ہوتا حصول

درد دل اے دہر! کب تک بس خموش کشتہ ہیں اِس واقعے سے اہل ہوش
ہوگیا احباب کو تر درد گوش مردہ ہیں اس سانحہ سے ذی عقول

مرثیہ

ابن علی سے سنا ہے یارو دشمن بلا میں لڑائی ہوئی
ایدھر تھے ہفتاد و دو تن وے اُدھر ساری خدائی ہوئی
... ...
... ...

تھے وہ ختم رسل کی کی اُمت یہ بھی اُس کا نور سا تھا
چشم وفاداری رکھتا تھا ایک جگہ کا پاسا تھا !!
سو وے سب دریا پر اُترے ایک یہی واں پیاسا تھا
دیکھو ان اندھے لوگوں سے کیسی دیدہ درآئی ہوئی

هاے کوئی یه نہیں که پوچها کیا هے گله ان لوگوں کا
ثابت کچھ تو کیا جرم هے حال برا ان لوگوں کا
قتل هوا پھر کس خاطر سردار بھلا ان لوگوں کا
یه تو مسافر اُترے تھے کاهیکو ان په چڑهائی هوئی

آنکھ اُٹھا کر دیکھ تو فلک پر کیسی نظر تھی تاروں کی
جانیں کھپائیں گردنیں کٹیاں بھوکے پیاسے بچاروں کی
سرور دیں یوں خاک په لوٹیں عزت هوے خواروں کی
آیا ظالم کیسی یه ساتی دو بہائی هوئی

کهتے طول جو جوڑ رکھے کچھ ظلم رحم کے هاتوں کا
کیا تھوڑا یا سچا نبی پر قدغن تھا سب باتوں کا
دن کا کھانا ترک هوا تھا منع تھا رونا راتوں کا
پانی سید پیاسے نہاویں چاروں اور منائی هوئی

کھانا ترک کئے پر اس کو ایسے غم کھانے پڑے
بیٹے بھتیجے بھائی بھتیجے سب کے سر ناچار کٹانے پڑے
هاے رے اس عزت پر اس کو کیا کیا ظلم اٹھانے پڑے
جان گئی ناموس لٹی گھر بار گیا رسوائی هوئی

جب بولیں هیں لوگ حرم کے چھاتی پیٹ بہت جاوے هے
ایک گھڑی تھا........ عابد ایک اسے سمجھاوے هے

ایک طرف مچلی ہے سکینہ زینب اس کو بہلاوے ہے
بابا بن وہ روتی جو ہے منتی نہیں ہے ستائی ہوئی ہے

ایک بہن کہتی تھی یوں پھر بار ترا کیوں لوٹ لیا
کوئی نہ چھوڑا پیچھے جیتا بھائی یہ کیا ستھراؤ کیا
کنبہ مرکر ڈھیر ہوا آخر کو تو نے جی بھی دیا
بارے تقدیر ایسی سزا کی کیا تجھ سے اے بھائی ہوئی

ایک کہے تھی نوشہ قاسم کیسا بیاہ رچایا تھا
کیا ساعت تھی نحس وہ جس میں بیاہنے کو تو آیا تھا
چپ بھی لگ گئی ایکا ایکی آفت ہی کیا لایا تھا
منہ بولے ہے ابتک تیرے ہاتھوں کی مہندی ہی لگائی ہوئی

ایک کی جسکو رسم تھی اس سے کہتی تھی وہ رو رو کر
اس میں کتنی باقی ہیں جو یاں سے چلا غمگیں ہو کر
جاتے ہی آنکھیں مند گئیں شب کو کیا نہ اٹھنا تھا تو سو کر
ایک نکاح حسرت ہی کیا ٹھہر گئی میری بدھائی ہوئی

کوئی کہے تھی شبیہہ اکبر آنکھوں میں کیوں کر اب آوے
نقشہ اس کا نقش جو ہے خاطر صفحہ سے کیا جاوے

دل کی تڑپ اب جاتی رکی ہے جاں تسلی کیا پاوے
جلوہ کرے، پھر کرتی تھی کوئی صورت ایسی مٹائی ہوئی

ظلم اٹھایا جی بھی کھپایا سر کو کٹایا چھاتی جلی
پیاسا جیسے گیا دریا پر منت پھر اک اس کی نہ لی
شہ جو غیور تھا جی میں سمجھا اس جینے سے موت بھلی
ہاتھ پسارے کرن کسی سے بھائی نہیں ہے گدائی ہوئی

ایک کہے تھی ہماری چھٹکاری کسی طرح نہیں
ظلم و ستم ہے جور و جفا ہے رحم کو میں بھی تھی مسکیں
ظاہر ہے رفتار فلک سے رکھا ہم کو اسیر یہیں
قید حیات سے نکلا جو کوئی بارے اس کو رہائی ہوئی

کوئی کہے تھی تو نہ تھا شاہا جن نے ایسے جور سہے
یارو یاور خویش و برادر سارے آکر سو ہیں رہے
خاک تھے جو کہ انہوں نے آنکھ کو منہ پر کیا کیا حسرت کیے
ہائے رے کیوں کر دل میں ترے ایسی غم کی سمائی ہوئی

کوئی کسو ملت میں یارو ایسا ستم بھی کرتا ہے
سبط نبی فرزند علی کا ناچاری سے مرتا ہے
دل تو چاہے ہے جینے کو پر موت پہ جی کو دھرتا ہے
کیا سمجھے تھے شامی کوئی ایسی حق سے برائی ہوئی

کہا سمجھا یہ قوم سیہ رو کیا ان نے یہ حال کیا
زہر حسن کو دے کر مارا حیدر کا وہ حال کیا
اب جو حسین رہا تنہا بے کس تس کو یوں پامال کیا
اول سے لے آخر تک کیا ان لوگوں سے بھلائی ہوئی

حال عابد کیا کہوں مت پوچھو ایک تو تھا بیمار و نزار
دوسرے دکھ اُس کا سارا جور و ستم سے تھا لاچار
تیسرے آفت آکر ایسی ٹوٹ پڑی ہے ایک ہی بار
چوتھے ایسے حال میں اُس کو ویسے پدر سے جدائی ہوئی

قصہ کوتہ مہر، کہاں تک آل عبا (رض) کے دکھ سنئے
روئیے ماتم کرئیے کوٹئے سر اور چھاتی کو دھنئے !!
جیسے کباب برنئے آتش جلئے شام و سحر بھنئے
چپ رہ ظالم خوب نہیں اب آگے بات بڑھائی ہوئی

—(*)—

سزائے

حسین (رض) ابن علی (رض) عالی نسب تھا — سزائے عزت و باب ادب تھا
جفا و جور کا شایستہ کب تھا — سلوک اسلامیاں سے یہ عجب تھا
کہ اس مہمان کی عزت نہ کیجے
ضیافت یک طرف پانی نہ دیجے

کسو کافر سے ایسا ہو نہ کردار　　ہوا اسلامیوں سے جو باصرار
کبھی رفتار کی ظالم گفتار　　اس اوپر توبیچ کر ہو اک نے تلوار

بہت بیدرد اس پر آزمائی ! !
علی کے منہ سے کچھ بھی شرم آئی ! !

محمد جس کی سب امت کہاریں !　　اسی کے آل لوہو میں ڈوبا ویں
ہائی سن کر جتے سب سو چکا ویں　　سبھی کو بن پانی رولا ویں

زہے اسلام ندر ترک خوش دور
عجب آدین عجب ایمان عجب طور

کرے عابد کہاں تک غمگساری　　جسے بیماری و تن کی نزاری
کھینچی ہے دور تک اپنی یہ خواری　　اٹھانا پاؤں کا اس پر ہے بھاری

ہو ایسے حال میں کیونکر دلاسا !
کرے کس کس کی دلداری وہ پیاسا

ہوئیں بازار میں لاکر بٹھایا　　کیا پامال ایسا سر اٹھایا !
تسلی کو بھی کوئی تک نہ آیا　　نفس جی سے آنسو نے بھی اپنایا

ستم پر ہے ستم یہ جور پر جور
زمانہ ہو گیا پل مارتے اور

کہیں زینب بہن زہرا سے مادر　　کرے گا کون اب ہم سوں کا آدر
پڑا ہے خاک میں بے سر برادر　　لٹے جاتے ہیں چھینے سر کی چادر

کہاں لے جاؤں بھائی کو اٹھا کر
اڑاؤں خاک کس کے آگے جا کر

سکینہ جب کرے ہے باپ کو یاد !　　قیامت ایک ہو جاتی توی بنیاد
اٹھے ہے ہم اسیروں پر جو فریاد !　　تو یہ کرتے ہیں ظالم اور ایجاد

کہاں مقدور یہ اس ناتواں کا
کہ ہووے پیش رو اس کارواں کا

ریاست کے لئے شبیر مارا   بلا یوں اُس کی تھی تقدیر مارا
سبھوں کو کیوں ہے بے تقصیر مارا   علی اصغر کے کیوں پھر تیر مارا

چھنڈیں عورتوں کی کیوں ردائیں
ردا کا ذکر و رکھیں ، یہ جفائیں

چلا سوکت کے اس آن جہاں کا   گرا ہے خاک پر خوں ہر جواں کا
ہوا ستھراؤ یوں خورد و کلاں کا   مقرر لوٹنا ہے خانماں کا

کسو ملت میں ایسا بھی ہوا ہے
کیا وارث ہمارا ہی موا ہے

سکینہ کا گنہ کیا ہے بتاویں   پدر مردہ کو کس خاطر کڑھاویں
کہاں فریاد لے کر آہ جاویں   کسے یہ ماجرا سارا سناویں

جفا ہر لحظہ ہم سب پر نئی ہے
دیا اک رسم تھی سو اُٹھ گئی ہے

حسن تو تھا خلیفہ جس کو مارا !   گنہ قاسم کا کیا جو اس کو مارا
کہوں میں کب تلک کس کس کو مارا   ستم سے جور سے جس جس کو مارا

رہا وارث نہ غیر از عابدین کے
پڑے ہیں خاک میں ارکان دین کے

علیؑ کے تئیں موا جانا سبھوں نے   محمد کو نہ کچھ مانا سبھوں نے
پرا شبیر کا تھانا سبھوں نے   کیا اُس گھر کو ویرانا سبھوں نے

رہا تنہا سا عابد کشمکش میں
حرم کے لوگ بے خانے تھے غش میں

وہاں اکبر کہ تھا شکل محمد ا طرف اُن ایک کے ہوتے تھے صد صد
اُٹھائے اُس نے جس دن زخم بے حد لگا سنے کر دجف کو کہنے کاے جد
ستم ہے شور ہے جور و جفا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہے

پڑی تھی دھوپ میں وہ نعش مظلوم کسی کا دل تلک ہوتا نہ تھا معلوم
اسیری اور غارت کی مچی دھوم ترددہ شہ کے لے جانے کا معلوم
رہا تنہا عابدین سو زار و بیمار
نہ جس کے کچھ ہوا نے جس کا سمجھہدار

زنان نوحہ کناں سب خاک سنہ پر کہیں تھیں رو مدینے کی طرف کر
کہ منصف ہو تو اے ختم پیمبر! مصیبت کس قدر ہے آل اوپر
کہیں کس سے کوئی حاکم نہیں ہے
نہ تو ہے نہ امیرالمومنین ہے

اُسے ماریں جسے دیں کی امامت نہ ہووے پھر کسو کو کچھہ ندامت
کریں برپا ستم ہے اک قیامت علاوہ اس پہ تشنیع و ملامت
دیا مطلق نہ غارت سے کسی کو
نہ بہرہ کچھہ مروت سے کسو کو

اُسے بے کس جو پایا مار ڈالا! رکھا میدان میں سر کو نیزہ بالا
پسر کو کانپتا گھر سے نکالا! بٹھائیں عورتیں رستے پہ لا لا
نہ کچھہ کی دلدہی زین العبا کی
نہ کچھہ روئے محمد سے حیا کی

نظر میں باپ کا سر ہے سناں پر پڑی ہے آنکھہ سوئے کاروان پر
بلا ہے آن کر ہر کام جان پر مصائب ہیں غرض اُس ناتواں پر

اڑی میدان میں جس جا کی گرد ہے
چلا جاتا ہے تیزی سے سر رہ گزرا ہے

جو رکتا ہے بہت تو روح آتی ہے　　جو کرتا ہے تو طاقت کہو آتی ہے
کہے ہے یوں تو شور اک ہو اٹھے ہے　　کہ ... کب تک سو اٹھے ہے

سر رہ قافلہ ہے کوئی بولو !!!
کہ دو ... تک آنکھ کھولو

ہوئے سب شام کو آخر روانہ　　... تیور ہے لے کچھ ترکانا
بہت بے دردیوں پر تھا زمانہ　　کچھ آگے شرم و بسط اچھا نہ جانا

قلم کو ... نے اب توڑ ڈالا
سر اپنا پتھر ... پھوڑ ڈالا

روسی ادب

تیسرا باب

روسی شاعری

از

جناب محمد محبوب صاحب - بی - اے - آنرز (آکسن)

لیرمنتوف (۱۸۱۱ - ۱۸۴۱)

جب پیٹربرگ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پشکن کے ایک ڈیوئل میں کاری زخم لگا ہے اور اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تو ایک ماتمی نظم بھی شہر کے گلی کوچے میں سنائی جانے لگی جو ایک نوجوان شاعر لیرمنتوف نے اس موقع پر لکھی تھی. نوجوان شاعر اس واقع سے بہت پہلے سے طبع آزمائی کرتا رہا تھا' مگر اس نظم کی بدولت ایک بارگی ہر شخص کی نظر اُس پر پڑنے لگی اور عام رائے نے اسے فوراً پشکن کا جا نشین تسلیم کر لیا.

میخائل یُرییوچ لیرمنتوف ۱۸۱۱ ء میں صوبۂ تولا میں پیدا ہوا. مورخوں کا بیان ہے کہ اس کا جد اعلیٰ سترھویں صدی میں اسکاٹستان سے ھجرت کرکے روس میں آبسا تھا. یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو' لیرمنتوف مزاج' طبیعت اور خیالات کے لحاظ سے سچا روسی تھا' گو اس کی تعلیم اور تربیت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جو خود شناسی یا قومیت کے احساس

کو بیدار کرتی ۔ اس کے لئے پہلے ایک جرمن کھلائی رکھی گئی ' اور پھر ایک فرانسیسی استاد ' جس نے اسے نپولین اور فرانسیسی ادب کی پرستش کرنا سکھایا ۔ بعد کو لیر منتوت ہمیشہ افسوس کرتا رہا کہ اسے پشکن کی طرح ایسی کھلائی نہیں ملی جو اسے روسی عوام کے قصے کہانیاں سناتی ' " جن میں تمام فرانسیسی ادب سے زیادہ شاعرانہ خوبیاں ہیں " . گھر پر تعلیم ختم کر کے لیر منتوت ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا ' مگر سند لینے سے پہلے ہی یونیورسٹی چھوڑ کر پیٹربرگ کے فوجی اسکول میں چلا گیا ۔ اسکول میں اس کی زندگی معمولی کیڈٹوں * کی سی تھی ' سوا اس کے کہ وہ " شراب میں شاعری بھی ملا کر پیتا تھا ۔ " یہاں اس کی تعلیم مکمل ہوئی تھی کہ پشکن کے قتل کی خبر مشہور ہوئی ' اور لیر منتوت نے وہ ماتمی نظم لکھی جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے ۔ نظم نے پیٹربرگ میں تہلکہ مچا دیا ۔ زار نکولائی اول نے اسے پڑھا اور بہت پسند کیا ' مگر ساتھ ہی شاعر کو شورش انگیزی کی قانونی سزا دینے کا حکم بھی جاری کر دیا ۔ دوستوں اور سرپرستوں کی کوششوں نے لیر منتوت کو بچا لیا ' اور اسے صرف پیٹربرگ چھوڑ کر قفقاز کی فوج میں ملازمت اختیار کرنی پڑی ۔ قفقاز میں وہ ایک سال بھی نہیں رہا تھا کہ اس کی خطا معاف ہو گئی اور پیٹربرگ واپس آنے کی اجازت مل گئی ۔ لیر منتوت واپس آیا ' اور ایک اعلیٰ درجے کے ادیب کی شان سے آیا ۔ شہر کی تمام محفلوں اور معزز خاندانوں میں اس کی بہت آؤ بھگت اور عزت کی گئی ' لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی طبیعت شہری زندگی سے اکتا گئی ۔ وہ قفقاز کی فوج میں منتقل کئے جانے کی درخواست دینے والا تھا کہ فرانسیسی سفیر کے لڑکے سے ڈیوئل لڑنے کی بنا پر حکومت نے خود

---

* فوجی اسکولوں کے طالب علم جنھیں تنخواھیں دی جاتی ھیں ۔

ھی اسے دوبارہ قفقاز روانہ کر دیا - اس مرتبہ وہ کئی لڑائیوں میں شریک ہوا ' اور ایسی بیباکی جواں مردی دکھائی کہ فوج میں بھی اس کا سکہ بیٹھہ گیا لیکن وہ دنیا میں اب صرف چند روز کا مہماں تھا - پیٹرز برگ سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے تمام دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ زندہ واپس آنے والا نہیں ' اور یہی وہ قفقاز کے رستے میں سب جان پہچان والوں سے کہتا ہوا گیا - قفقاز میں اسے تین سال نہیں گذرے تھے کہ ایک ڈیوئل میں مارا گیا (۱۵ جولائی ۱۸۴۱) -

لیر منتوف نے عجیب و غریب طبیعت پائی تھی - اس کی ماں ایک شاعرانہ مزاج کی عورت تھی جس نے بد قسمتی سے ایسا شوہر منتخب کیا اور ایسی زندگی بسر کی جس سے اس کی ساری امیدیں اور حوصلے خاک میں مل گئے ' اور وہ بیچاری مایوسی اور حزن میں ایسی مبتلا ہوئی کہ آخر کار تپ دق کا شکار ہو گئی - لیر منتوف کی ماں کے بعد خاندان میں غم اور افسردگی کی فضا اس کی نانی کی ذات سے قائم رھی اور لیر منتوف ' جس کے دل پر ماں کے حزن کا گہرا نقش موجود تھا ' غمگین جذبات میں اور زیادہ ڈوب گیا - پیٹرزبرگ کے فوجی اسکول میں داخل ہونے پر اسے ان جذبات کی قید سے رھائی ملی ' لیکن یہ دوا امراض سے بھی بد تر ثابت ہوئی - لیر منتوف نہ صرف " شراب کے ساتھہ شاعری ملا کر پیتا تھا " بلکہ عیاشی اور اوباشی بھی . یہ علاج نہیں تھا ' صرف ایک قسم کی مدھوشی جس نے اسے اپنے جوھر سے بے خبر کر دیا ' ایک نشہ جس سے نجات پانے کی وہ خود دعائیں مانگا کرتا تھا - یہ عرصہ جو اس نے فوجی اسکول میں گزارا ہر لحاظ سے اس کی عمر کا بد ترین حصہ تھا - انہیں عادتوں کی وجہ

سے جو اس نے یہاں سیکھیں اسے بعد کو " زھریلے کیڑے " کا نا قابل رشک خطاب ملا ، اور بہت سے شریف آدمیوں کو یقین ھوگیا کہ گو اس کا کلام دوسروں کے لئے تریاق کا اثر ضرور رکھتا ھے - لیکن اس کی شخصیت نہایت زھریلی ھے ۔

بچپن کا ماحول اور فوجی اسکول کی زندگی کا طریقہ بیان کردینے سے در اصل لیر منتوف کی سیرت کا معمہ حل نہیں ھوتا - اس کی شخصیت ایک مظہر تھی جسے نفسیات میں " دھری شخصیت " کہتے ھیں - اس مظہر کی خاص پہچان یہ ھے کہ ایک ھی شخص کی سیرت کے دو متضاد پہلو ھوتے ھیں جن کے متضاد ھونے کا اسے مطلق احساس نہیں ھوتا ، اس کی دونوں " شخصیتوں " میں سے ھر ایک کی الگ اور مخصوص طبیعت ، مزاج ، عادتیں اور رجحانات ھوتے ھیں ، اور جب وہ ایک " شخصیت " سے دوسری میں منتقل ھوتا ھے تو پہلی کی ذھنی اور مزاجی خصوصیات صرف ترک نہیں کر دیتا بلکہ ان سے بالکل بیگانہ ھوجاتا ھے ، اور انہیں اس طرح بھول جاتا ھے گویا وہ اس کی طبیعت میں کبھی پائی ھی نہیں جاتی تھیں - لیر منتوف کی ظاھری زندگی پر نظر ڈالی جاے تو یقین نہیں آتا کہ اس کا کلام پاکیزہ ھوسکتا ھے ، اور اس کا کلام پڑھ کر سخت حیرت ھوتی ھے کہ اس نے اپنی عمر کی قلیل مدت زیادہ ترکمینی اور ظالمانہ حرکتوں میں کیونکر ضائع کی - لیکن ھم نہ اس کے کلام کی پاکیزگی سے انکار کرسکتے ھیں اور نہ اس کا دامن ان الزاموں سے پاک کرسکتے ھیں جو معاصرین اس پر لگاتے تھے - لیر منتوف کچھ دنوں بدمعاشوں کی زندگی بسر کر کے دفعتاً ایک معصوم شاعر بن جاتا تھا ، اور پھر اسی طرح دفعتاً ایک پختہ کار بدمعاش : اسی سے خیال ھوتا ھے کہ اس کی شخصیت دھری تھی ، ایک تو بدمعاش کی اوردوسری شاعر کی ، اور

دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور بھلا نہ تھیں ۔

لیرمنتوف نے اپنی " بدمعاش " شخصیت کا خاکہ ایک ناول میں کھینچا ہے جس کا عنوان " ہمارے زمانے کا ایک جواں مرد " ہے ۔ ناول کا ہیرو پچورن سیرت کے لحاظ سے پشکن کے آونیگن سے بہت ملتا جلتا ہے ۔ اس کا دل بھی محبت اور وفاداری کی لذتوں سے نا آشنا ہے ' اور اس کی سرگذشت کا جو حصہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اس میں اول سے آخر تک عورتوں کے دل لبھانے اور دکھانے کے قصے ہیں ' گویا پچورن کو عورتوں سے کوئی عداوت ہے اور انہیں ستانے کا خاص شوق ۔ ایک مرتبہ اسے ایک نواب کی لڑکی سے اسی قسم کی عداوت ہوجاتی ہے ۔ ہر جگہ ' خواہ محفل ہو یا شہر کا باغ ' پچورن جہاں اس لڑکی کو دیکھ لیتا ہے اسے طرح طرح سے گرویدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ' اور جب اس بیچاری کے دل میں محبت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو پچورن اسے ایک لمبی چوڑی تقریر میں سمجھاتا ہے کہ وہ عورتوں کو اپنا گرویدہ کرنے پر فطرتاً مجبور ہے ' مگر محبت کی راہ و رسم برتنے کا حوصلہ نہیں کرسکتا کیونکہ اسے آزادی ہر نعمت سے زیادہ عزیز ہے ' اور اسے وہ محبت کے مول بھی دینے پر کبھی راضی نہیں ہوسکتا ۔ اس کے دل میں وفاداری اور ایثار کا مادہ نہیں ' لیکن اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ سب مرد اس سے مرعوب رہیں اور سب عورتیں اس پر فدا ۔

لیرمنتوف نے خود بھی کئی شریف عورتوں کے ساتھ پچورن کا سا سلوک کیا ! اور مردوں عورتوں کے تعلقات اس کے نزدیک اور کچھ ہو بھی نہیں سکتے تھے ۔ مگر پچورن اور لیرمنتوف کی مشابہت بس یہیں پر ختم ہوجاتی ہے ۔ لیرمنتوف کی طبیعت میں بہت سے جوہر تھے جن کا اسے اس

وقت مطلق احساس نہیں ہوتا تھا جب اس کی عیاش اور بدمعاش شخصیت حاوی ہوتی، اور پچورن کی صورت میں اپنا عکس اتارتے ہوئے اس نے انہیں کا خیال نہیں رکھا. اس کے اخلاق تو آخر عمر تک ایک تیرہ دل عیاش کے سے رہے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر لیرمنتوت کو موت نے نہ آگھیرا ہوتا تو اس کی شاعر شخصیت اپنی حریف شخصیت پر رفتہ رفتہ غالب آجاتی. اب صرف چند بلند پایہ نظمیں ہیں جن سے ہم اس روحانی عظمت کا اندازہ لگاسکتے ہیں جو لیرمنتوت کو حاصل ہوتی اگر اسے کچھ دن اور جینا نصیب ہوتا. قبل از وقت موت نے صرف اسے اس عظمت سے محروم نہیں رکھا بلکہ ان گناہوں کی تلافی کا بھی موقع نہیں دیا جو اس کی عیاش اور بدمعاش "شخصیت" سے سرزد ہوئے، اور جنہیں بہت سے قوم پرست روسی اس کا کلام پڑھ کر بھی معاف نہ کرسکے.

لیرمنتوت نے جب لکھنے کو قلم اٹھایا تو وہ اپنی خاندانی زندگی کی مایوسی بھری فضا سے گھرا ہوا تھا، اور اس کی شروع جوانی کی نظمیں اسی رنگ میں ڈوبی ہیں. مایوسی نے تو آخر عمر تک اس کا دامن نہیں چھوڑا، مگر اس میں نئے جذبات کی آمیزش ہوتی رہی. سب سے پہلے لیرمنتوت پر اس وحشت اور "طوفانوں کی آرزو" کا غلبہ ہوا جو بائرن کے کلام نے یورپ میں ایک وبا کی طرح پھیلا دی تھی. لیرمنتوت کی ابتدائی نظموں میں اس کا اثر بہت نمایاں ہے، اور اس میں شک نہیں کہ وہ زیادہ تر بائرن کی نقل میں لکھی گئی تھیں. لیکن رفتہ رفتہ لیرمنتوت کی طبیعت نے بائرن اور رومانی تحریک کے اثرات جذب کرکے اس طرح اپنا لئے کہ ان میں اپچ اور جدت کی شان پیدا ہوگئی. وحشت اور "طوفانوں کی آرزو" جس انداز سے "بادبانی کشتی" میں دکھائی گئی ہے

بائرن کی نقل نہیں، لیرمنتوف کے اپنے دل کی کیفیت ہے:

ایک تنہا بادبانی کشتی، کُہرے میں اپٹی ہوئی
لاجوردی سمندر کی سطح پر چمک رہی ہے۔
وہ دور دراز ملکوں میں کیا تلاش کرنے نکلی ہے؟
اپنے وطن میں کیا چھوڑ چلی ہے؟
موجیں کھیلتی ہیں، ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں،
مستول جھکتا ہے، چرّاتا ہے...
افسوس، اسے نہ خوشی کی تلاش ہے
اور نہ وہ خوشی سے بھاگتی ہے۔
نیچے موجیں بہ رہی ہیں
اوپر سنہری کرنیں بکھری ہیں،
لیکن اُس دیوانی کو آرزو ہے طوفانوں کی،
گویا سکون طوفانوں ہی میں ملتا ہے۔

لیرمنتوف اور بائرن کی مشابہت دراصل محض سطحی ہے۔ وحشت، بے چینی، غرور اور اہل دنیا سے بیزاری نے لیرمنتوف کی روز مرہ زندگی میں چاہے جتنی ناگوار شکل اختیار کی ہو، شعر بنتے بنتے ان خصوصیتوں میں مایوسی درد اور کبھی کبھی ایک لطیف مذہبیت کی ایسی آمیزش ہوجاتی ہے جو ان کی تاثیر بالکل بدل دیتی ہے۔ وہ زندگی سے سے بیزاری ظاہر کرتا ہے:

طبیعت اکتا گئی، دل غمگین ہے، اور ایسا کوئی بھی نہیں
جس کا روحانی پریشانیوں میں سہارا لوں...
خواہشیں کروں؟... کیا فائدہ خواہشیں کرنے سے جب وہ کبھی پوری نہ ہوں،

اور زمانہ گذرتا جائے، عمر کا بہترین زمانہ ؟
محبت کروں؟... مگر کس سے ؟... چند روز کے لئے؟ بیکار کی دردسری ہے،
اور ہمیشہ کے لئے کسی سے محبت کرنا ممکن نہیں .
اپنے دل پر نظر ڈالوں ؟ وہاں گذشتہ زندگی کا نام و نشاں بھی نہیں ،
گذری ہوئی خوشیاں اور رنج سبھی مٹ گئے ہیں .
جذبات کی ہستی کیا ہے ؟ کبھی نہ کبھی عقل کے سمجھانے سے
ان کا خوشگوار بخار جاتا رہتا ہے ...
زندگی، اگر کوئی ٹھنڈے دل سے غور کرے
محض ایک بے معنی اور بیہودہ دل لگی ہے —

خدا کا طنزاً شکریہ ادا کرتا ہے :

میں ہر چیز، ہر نعمت کے لئے تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں :
جذبات کی پنہاں اذیتوں کا،
آنسوؤں کی سوزش، بوسے کے زہر کا،
دشمنوں کے کینے، دوستوں کی تہمت کا،
اپنی روح کی بے تابی کا، جو ایک ویرانے میں مُرجھا رہی ہے،
ان سب امیدوں کا جو مجھے دھوکا دے گئی ہیں۔
بس اب ایسا کر کہ مجھے تیرا شکریہ
بہت دنوں تک نہ ادا کرنا ہو۔

اور ان دونوں حالتوں میں اس کا خلوص ایسا نمایاں، اس کا جذبہ اتنا شدید ہے کہ بائرن کا سارا جوش اس کے مقابلے میں سرد اور بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شکوہ سنجی، غرور، بنی نوع انسان کی تحقیر اور زندگی سے بیزاری کے موضوع پر لیرمنتوف نے جو نظمیں لکھیں وہ اس اس

کی اصلی صورت میں نہیں دکھاتی ہیں۔ ذیل کی نظم اس کی روحانی کیفیات کی پردہ دری کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے:

آدھی رات کو آسمان پر ایک فرشتہ اڑتا ہوا
دھیمی اور میٹھی آواز سے ایک گیت گا رہا تھا،
اور چاند اور بادلوں اور ستاروں کا ہجوم
اس کا پاک گیت سننے کو ہمہ تن گوش تھا۔
اس کا گیت معصوم روحوں کی شادمانی پر تھا
جب وہ جنت کے باغوں میں آرام کرتی ہوں گی،
اور خدا کی بزرگی پر، اور اس کی حمد میں کوئی ریاکاری نہ تھی۔
فرشتہ ایک ننھی روح اپنی گود میں
دنیا کے غم اور آنسوؤں کے لئے لا رہا تھا۔
ننھی روح میں اس کے گیت کی صدا
زندہ رہی، اگرچہ گیت یاد نہ رہا،
دنیا میں بہت دنوں تک وہ بے چین رہی
اور ایک عجیب آرزو میں محو،
کیونکہ دنیا کے سیٹھے گیت اس کے دل میں
جنت کے نغموں کی قائم مقامی نہیں کر سکتے تھے۔

ایک روسی نقاد، مرژکوت سکی، کا خیال ہے کہ لیرمنترت خود بھی ایک ایسی ہی ننھی روح تھا جسے دنیا کی تمام نعمتیں نہایت درجہ حقیر معلوم ہوتی تھیں، اس لئے کہ پیدائش سے قبل کی "جنتی" زندگی کی یاد اس کے دل میں تازہ تھی، اور دونوں زندگیوں کا فرق محسوس کرنے سے اس کی طبیعت میں وہ دلگداز غم اور وحشت اور دیوانگی

پیدا ہوگئی جو اس کے کلام میں آتی نمایاں ہے - لیکن "جنتی" زندگی کا دروازہ پھر اس پر رفتہ رفتہ کھل رہا تھا - اپنی کمینی حرکتوں کے باوجود وہ ایسی نظم بھی لکھ سکتا تھا:

دل پر جب کوئی لمحہ گراں گذرتا ہے
اور غمگیں جذبات ہجوم کرتے ہیں،
تو میں ایک اعجاز نما دعا
دل ہی دل میں پڑھ لیتا ہوں.
زندہ الفاظ کی ہم آہنگی میں
ایک جاں فزا تاثیر ہوتی ہے
اور ایک پاک قوت، جو فہم و ادراک سے بالا تر ہے،
اس میں مضمر ہوتی ہے.
دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے
شک کا نام و نشان باقی نہیں رہتا،
تب میں ایمان لاتا ہوں، روتا ہوں،
اور یوں ہی، آہستہ آہستہ ...

اس میں شک نہیں کہ لیرمنتوف کا دل کبھی کبھی اس قدر پاک ہوجاتا تھا کہ لطیف ترین مذہبیت کے جذبے کی جولانگاہ بن سکے، لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ اس جنس کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں- اپنی نظم "پیغمبر" میں اس نے اہل دنیا کی اس بے حسی، خود پسندی، اور سنگ دلی کی شکایت کی ہے جو انہیں حقیقت سے بے خبر رکھتی ہے:

جس وقت سے کہ منصف ازلی نے
مجھے پیغمبری کا علم غیب عطا فرمایا،

میں لوگوں کی پیشانیوں پر بدی اور گناہوں کی
انمٹی داستانیں پڑھنے لگا ہوں،
میں محبت اور راست بازی کے پاک اُصول
بے باکی سے بیان کرنے لگا،
مگر وہی جو عزیز اور قریب تھے
مجھ پر دیوانوں کی طرح پتھر پھینکنے لگے،
میں نے سر پر راکھ ملی
اور آبادیوں کو چھوڑ کر خالی ہاتھ چل بسا،
اب ویرانوں میں رہتا ہوں، اور خدا مجھے بھی
رزق پہنچاتا ہے، جیسے چرند و پرند کو۔
میرے دل میں خدا کی دی ہوئی امانت ہے،
ساری مخلوق میری تابعدار ہے،
ستارے اپنی شعاعوں سے کھیلتے ہوے
مجھ سے ہم کلام ہوتے ہیں،
لیکن جب کبھی میں پر شور شہر سے
قدم بڑھاتا گزرتا ہوں
تو بوڑھے خود پسندی سے مسکرا کر
بچوں سے کہتے ہیں:
" دیکھو، یہ تمہارے لئے ایک مثال ہے —
یہ مغرور تھا، اسے ہمارے ساتھ بسر کرنا ناگوار ہوا،
بےوقوف، ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا
کہ اس کی زبان سے حق کے پیغام نازل ہوتے ہیں۔

" بھو اسے غور سے دیکھو ،
یہ کیسا اُداس ہے ، دبلا اور پیلا ،
دیکھو یہ کیسا محتاج ہے اور ننگا ،
دیکھو سب اس کی کیسی تحقیر کرتے ھیں ! "

لیر منتوت کے دل میں مذہبیت کا جذبہ کبھی کبھی شدید ضرور ھو جاتا تھا ، اور اس کی تیز آگ " ماسوا " کے خس و خاشاک کو جلا کر خاک کردیتی تھی ، مگر شاعر کا ذھن عقیدے کی پابندیوں سے بہت گھبراتا تھا ، اس لئے وہ نہ دنیا کو سدھار سکا اور نہ اس نے اپنی نجات کی کوئی صورت نکالی ایک نظم میں اس نے خدا سے التجا کی ھے کہ اگر اسے گناھوں سے بچانا مقصود ھے تو اس کی شاعرانہ طبیعت اور شعر کہنے کی استعداد اس سے واپس لے لی جائے ، ورنہ اسے رند خراباتی کی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ھوگا ۔ لیکن نہ خدا نے اپنی دین واپس لی ، نہ لیر منتوت اپنی دامن کو دنیا کی آلائشوں سے پاک رکھہ سکا ۔ مایوسی نے آخر کار اسے دنیا اور ھستی سے ایسا بے تعلق کردیا کہ اس کی صرف ایک تمنا رہ گئی ۔ اس طرح سے فنا ھوجانا کہ ھستی کی مطلق خبر نہ رھے وہ اپنی ایک معشوقہ سے کہتا ھے :

تو وداعی الفاظ دھراتی ھے
اور تیرا دل امیدوں سے لبریز ھے :
تو کہتی ھے اس کے بعد بھی ایک زندگی ھوگی
اور دلیرانہ اس پر ایمان لائی ھے ۰۰۰۰۰۰ مگر میں ؟
جس شخص کے لئے اس عمر کی قلیل مدت ایک مصیبت ھے
وہ حیات جاوداں کی تمنا کیسے کرے ؟
میں دائمی زندگی کا بار کیونکر سنبھال سکوں گا ،

جب مجھے اس زندگی میں ہم پور فنا کا سکون نہ ملنے سے تکلیف ہوتی ہے ......

فنا کی آرزو لیر منتوف کے دل میں اور بھی تیز اس وجہ سے ہوگئی کہ وہ اپنی "شاعر" شخصیت سے محبت کرنے لگا تھا، مگر اُسے اپنی "عیاش اور بد معاش" شخصیت پر قابو پانے کی کوئی اُمید نہ تھی. اس احساس نے کہ وہ ان دونوں کی جنگ میں حصہ لینے سے محروم، اور جنگ کا جو فیصلہ ہو اُسے تسلیم کرنے پر مجبور ہے اس کے روحانی توازن کو قائم نہ رہنے دیا اور اس کے سکون کے لمحے بھی "بد معاش" شخصیت کی فتح کے خوف کے نذر ہونے لگے . جیسا کہ وہ اپنے ایک مرغوب استعارے میں کہتا ہے:

.... میرا یہ سکون
شیطانوں کے ننداسے گروہ کو خاموش رکھنے کے لئے
ایک اُڑتے ہوئے فرشتے کی لوری ہے۔

فرشتہ اُڑتا ہوا چلا جائے گا اور شیطان بیدار ہوکر پھر قیامت برپا کریں گے. لیرمنتوف کے دل میں یہ اندیشہ وحشت پیدا کرتا ہے، لیکن مایوسی اسے یقین دلاتی ہے کہ اس آفت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں. اسی کیفیت، یعنی حق اور باطل کی اس جنگ کو جو اس کی روح پر قابضہ کرنے کے لئے ہورہی تھی لیر منتوف نے اپنی سب سے لمبی نظم "شیطان" میں بیان کیا ہے ۔ یہ شیطان ایک راندۂ درگاہ فرشتہ ہے جو بہشت سے نکلنے کے بعد دنیا میں مارا مارا پھرتا رہا ہے:

اِس حقیر دنیا پر راج کرتے ہوے
اس نے بغیر کسی خواہش یا خوشی کے برائی کے بیج بوئے .
کہیں اسے اس فن کی مشق میں
کسی مخالفت سے سابقہ نہیں پڑا۔
اور برائی کرتے کرتے بھی اس کی طبیعت اُکتا گئی .

یوں ھی آوارہ گردی میں وہ ایک بار قفقاز پہنچا، اور گرجستا
کی کسی وادی میں اسے ایک لڑکی جس کا نام تمارا تھا، نظر آئی
شیطان کے افسردہ دل پر تمارا کے حسن نے بہت اثر کیا ۔ وہ ایک رئیس
کی بیٹی تھی، شیطان نے جب اسے دیکھا تو اس کی شادی کی تیاریاں ھو رھی
تھیں، اور شام ھی کو اس کا دولہا اسے لینے کو آنے والا تھا. شیطان کی
سازش سے کچھ ترک ڈاکوؤں نے اس قافلے پر جو دولہا اپنے ساتھ لا رھا
تھا، حملہ کیا، قافلے والے سب بھاگ گئے اور ڈاکوؤں سے مقابلے میں دولہا
کے بہت کاری زخم لگے - اپنے وعدے کے مطابق وہ شام کو دلہن کے گھر تو
پہنچ گیا، مگر پہنچنے سے پہلے اس کا دم نکل چکا تھا اور وہ اپنے گھوڑے
کی ایال پکڑے لٹکا تھا. تمارا کو جب اس کی خبر ھوئی تو وہ اپنی قسمت
پر رونے لگی، اور چاھتی تھی کہ روتے روتے اپنی جان دیدے کہ اس کے کان
میں کسی کی سریلی پر درد آواز آئی جس نے دم بھر میں اس کے دل
سے سارا غم دور کردیا- یہ آواز شیطان کی تھی، جو تمارا کو تسلی دینے
آیا تھا. تمارا نے گھبراکر اِدھر اُدھر دیکھا، مگر اسے کوئی نظر نہ آیا . وہ
اسی کشمکش میں تھی کہ اس سریلی آواز کو سنتی رھے جس نے اس پر
جادو سا کردیا تھا یا اپنے دولہا کا ماتم کرے کہ نیند نے اس کی آنکھیں
بند کردیں. اس کے بعد شیطان کی آواز، غمگین مگر تسلی بخش، اسے
اکثر سنائی دیتی رھی، اور اس اندیشے کے باوجود کہ وہ کسی باغی یا
مجرم فرشتے کی آواز ہے، تمارا اس پر ایسی فریفتہ ھوگئی کہ وہ باپ
کے اصرار پر بھی شادی سے انکار کرتی رھی، اور جب باپ کو بہت
مصر پایا تو عورتوں کی ایک خانقاہ میں چلی گئی. باپ کی خفگی سے
بچنے کے علاوہ تمارا کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ شیطان سے پیچھا چھڑالے،

کیونکہ اسے یقین تھا کہ خانقاہ کے آس پاس بھی شیطان کا گذرنا ناممکن ہوگا. لیکن وہ یہ بھول گئی کہ اس کے دل میں شیطان کی طرف جو رغبت پیدا ہو گئی تھی اس سے شیطان کو خانقاہ میں بھی داخل ہونے کا حق مل گیا تھا، وہاں پہنچتے ہی تمارا کو اس کی افسردہ آواز پھر سنائی دی. شیطان اب زیادہ خوش ہو گیا تھا. اس نے اپنا تعارف کرایا:

میں وہ ہوں جس کی صدا تو نے
رات کی خاموشی میں سنی تھی...
میں وہ ہوں جس سے کوئی محبت نہیں کرتا،
وہ جس کے سامنے ساری مخلوق سر جھکاتی ہے...
میں اہل دنیا کا دیوتا ہوں،
علم اور آزادی کا بادشاہ ہوں،
آسمان کا دشمن، فطرت کا باطل عنصر ہوں،
اور تو دیکھتی ہے، میں تیرے قدموں پر ہوں...

تمارا کے سوال پر اس نے اپنا سارا ماجرا سنایا، اور ایسے پر درد انداز سے کہ بیچاری کا دل بھر آیا. اس نے شیطان سے محبت کرنے کا وعدہ کیا، اس شرط پر کہ وہ توبہ کرے اور خدا کو سجدہ کرے. شیطان نے بہت سی قسمیں کھائیں اور تمارا کو یقین دلایا کہ

"میں چاہتا ہوں آسمان والوں سے صلح کرنا،
محبت کرنا، سر بسجدہ ہونا،
حق پر ایمان لانا...

اور اس بھروسے پر کہ شیطان راہ راست پر آجائے گا حسین تمارا نے دل و جان سے اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا. شیطان کے پیار کا قاتل

رمز بجلی کی طرح اس کے سینے میں سرایت کر گیا ' اس نے ایک چیخ ماری

جس میں سب کچھہ تھا : محبت ' درد '
معافانہ شکایت اور التجا '
جدائی کی جاں گداز مایوسی '
بہار زندگی سے رخصت ...

لیکن تمارا کی جاں لینے سے شیطاں کی آرزو پوری نہ ہو سکی . قبل اس کے کہ وہ تمارا کی روح پر قبضہ کرے اس کا ایک اور دعوے دار پہنچ گیا ' ایک فرشتہ جو بیچاری گمراہ تمارا کی روح کو نجات کی خوش خبری سنا کر اپنی گود میں جنت کی طرف لے چلا . شیطان نے رستہ روکنا چاہا ' مگر فرشتے نے ایک قہر آلود نظر سے اسے سامنے سے ہٹا دیا اور تمارا کی تعریف میں یہ کہتا ہوا چلا گیا :

صناع قدرت نے ایسی روحوں کو
لطیف ترین جوہر سے بنایا ہے .
یہ دنیا کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہیں
نہ دنیا ان کے لئے .
اس نے محبت کی ہے ' مصیبتیں اٹھائی ہیں
اور محبت کرنے والوں پر جنت کا دروازہ کھلا ہے .

شکوہ سنجی ' اطاعت اور سرکشی ' نجات اور عذاب کے مسائل نے لیرمنتوف کو بہت مصروف رکھا ' پھر بھی اس کے کلام کا ایک خاصا حصہ ایسا ہے جس میں شاعری کے سوا اور کچھہ مقصود نہیں . اس حصے میں رومانیت کا کچھہ ہلکا سا رنگ نظر آتا ہے ' مگر لیرمنتوف کی سادگی

اور حقیقت نگاری نے اس میں اور ھی کیفیت پیدا کردی ھے - " وصیت " میں ایک سپاھی جو مرنے کے قریب ھے اپنے ایک دوست سے کہتا ھے :

میرے دوست ' میں تمھارے ساتھ
کچھ دیر تنہا رھنا چاھتا ھوں :
کہتے ھیں اس دنیا میں
مجھے صرف چند دن رھنا نصیب ھوگا .
تم وطن جانے والے ھو '
دیکھو ... مگر اس سے فائدہ کیا '
سچ پوچھو تو وھاں کسی کو
میرے انجام کی فکر ھی نہیں -
خیر ' اگر کوئی پوچھے '
یا جو کوئی بھی پوچھے —
اس سے کہہ دینا کہ ایک لڑائی میں
میرے سینے پر گولی لگی '
اور میں نے عزت سے اپنے بادشاہ کے لئے جان دی '
کہہ دینا کہ یہاں کے ڈاکٹر بالکل اناڑی ھیں '
اور میں نے اپنے وطن کو
سلام بھیجا ھے .
میرے ماں باپ تمھیں
شاید ھی زندہ ملیں ...
مجھے افسوس ھے تو بس اس بات کا
کہ ان کے دل پر چوٹ لگے گی .

لیکن اگر دونوں میں سے کوئی زندہ ہو
تو کہہ دینا میں خط لکھنے میں بہت سستی کرتا ہوں'
کہہ دینا ہمارا دستہ لڑائی پر بھیجا گیا ہے
اور میری واپسی کا ابھی انتظار نہ کریں۔
انھیں کی ایک ہمسائی ہے...
تمھیں یاد ہوگا' ہم کو جدا ہوے
ایک مدت گذر گئی... وہ تم سے میری نسبت
کچھ نہ پوچھے گی ... کوئی پروا نہیں'
تم اسے سارا حال ٹھیک ٹھیک سنا دینا'
اس کے درد سے ناآشنا دل پر رحم نہ کھانا —
اچھا ہے اگر وہ چند آنسو بہا ڈالے...
اس کا کیا بگڑ جاے گا۔

اس قسم کی نظم میں یہ لکھنا کہ "یہاں کے ڈاکٹر بالکل اناڑی ہیں" کہہ دینا کہ میں خط لکھنے میں بہت سستی کرتا ہوں" اور "وہ تم سے میری نسبت کچھ نہ پوچھے گی" رومانی اصولوں کے خلاف ہے' مگر غور کیا جاے تو یہی تین مصرعے اس نظم کی جان ہیں' اور اسے واقعی ایک زندہ' درد بھرے دل کا آخری پیغام بنا دیتے ہیں جو اپنی عاجزی اور مسکینی سے اور بھی پر تاثیر ہو جاتا ہے۔ یہی عجز' یہی تسلیم' یہی بیچارگی اور زندگی کے انجام سے واقف ہونے کا میٹھا میٹھا غم اُس کزاک ماں کے گیت میں بھی ہے جو اپنے ننھے بچے کو سلا رہی ہے:

بڑا ہوکر تو صورت سے سورما ہوگا'
اور دل میں سچا کزاک —

میں تجھے رخصت کرنے کو باہر نکلوں گی
اور تو دور سے ہاتھ ہلائے گا .
اس رات کو میں چھپ کر
کتنے گرم آنسو بہاؤں گی !
سو ' میرے فرشتے ' آرام سے ' نیند کا مزہ لے کر
سو ' میرے بچے ' سو .
جدائی میں میرا دل پریشان ہوگا '
تیرے انتظار میں تڑپتی رہوں گی ؛
سارے دن دعائیں مانگوں گی '
اور رات کو فال دیکھوں گی .
میں سمجھنے لگوں گی کہ پردیس میں
تیرا دل گھبراتا ہے '
سو ' جب تک تو ہر فکر سے آزاد ہے '
سو ' میرے بچے ' سو .
میں تجھے سفر کے لئے
ایک مقدس شبیہ دوں گی ،
تو اسے دعا مانگتے وقت
اپنے سامنے رکھنا .
خطرناک لڑائی کے لئے تیار ہوتے ہوے
اپنی ماں کو یاد کرنا ...
سو ' میرے پیارے چاند کے ٹکڑے '

ہو' میرے بچے ' ہو۔

یاد وطن کے موضوع پر لیرمنتوف کی ایک نہایت عمدہ اور دلگداز نظم ہے جس کا عنوان "سبتدی راہب" ہے۔ یہ راہب ایک نوجوان ہے جس کی بچپن سے ایک خانقاہ میں پرورش ہوئی ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کے ماں باپ کون تھے اور کہاں ہیں' راہب اس پر بہت مہربان ہیں' لیکن یہ خیال کہ وہ اپنوں سے دور پردیس میں پڑا ہے اور ممکن ہے اس کی ساری عمر غریب الوطنی ہی میں گذر جائے اسے ہر وقت ستاتا رہتا ہے۔ آخر میں اس کی بے چینی اس قدر شدید ہوجاتی ہے کہ وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا اور ایک رات کو خانقاہ سے بھاگ نکلتا ہے۔ اسے رستے کی مطلق خبر نہیں' ساری رات وہ جنگل میں بھٹکتا ہے' اس کی ایک درندے سے لڑائی ہوتی ہے جس میں وہ بہت زخمی ہوجاتا ہے اور سویرے جب راہب بہت تلاش کرنے کے بعد اسے پاتے ہیں تو وہ قریب مرگ ہے' مگر وطن کی یاد میں اسی طرح بے چین۔ اسی نظم کی خاص خوبی کا جوہر مناظر قدرت کی تصویریں ہیں جنہیں شاعر نے اس خوبی سے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے کہ نوجوان راہب کی بے چینی اور تڑپ صرف بہت زیادہ شدید اور دل سوز ہی نہیں بلکہ پر معنی بھی ہو جاتی ہے۔

لیرمنتوف کا قلم فقط مناظر قدرت اور انسانی جذبات ہی کے بیان کرنے میں مشاق نہیں۔ اس نے جنگ بورو دینو کی اسی عنوان کی ایک نظم میں تصویر کھینچی ہے' اور لڑائی کی ساری کیفیت ایک سپاہی کی زبانی سنائی ہے جو اس میں شریک تھا۔ یہ نظم ثابت کردیتی ہے کہ لیرمنتوف لڑائی کے کشت خون اور لڑنے والوں کے دل کی حالت دکھانے میں تالستائی سے کچھ کم نہ تھا' اور تالستائی اس فن میں استاد مانا گیا

ہے۔ "بورودی نو" سے زیادہ دلچسپ ایک اور جنگ کا بیان ہے جو اس کی نظم "والے ریک*" میں ملتا ہے۔ لیر منتوت اپنی ذاتی زندگی میں من چلا، ظالم اور سنگ دل ہونے کے باوجود اس فلسفۂ حیات کی طرف سے بے حس نہیں تھا جس کی تبلیغ نے تالستائی کو اتنا مشہور کردیا۔ والے ریک" کے آخر میں وہ کہتا ہے:

. . . حقیر انسان
آخر چاہتا کیا ہے؟ آسمان صاف ہے،
اور اس کے نیچے ہر ایک کے واسطے کافی زمین پڑی ہے،
مگر وہ لا حاصل جنگ و جدال سے ایک دم بھر باز نہیں رہ سکتا
اور کیوں؟ ...

لیر منتوت اپنے سوال کا جواب نہیں دیتا، اور اس سوال کا جواب کوئی دے بھی نہیں سکتا۔ لیکن جس انداز سے اور جس حالت اور فضا میں یہ سوال کیا گیا ہے وہ لیر منتوت کے درد اور انسانی ہمدردی کو خوب ظاہر کردیتی ہے۔

انشا پردازی اور جدت اسلوب کے لحاظ سے لیر منتوت کا ادبی کارنامہ ایک نظم "کھتہ" ہے۔ اس نظم میں لیر منتوت نے وہ خاص بحر اور قصہ سنانے کا بھولا طرز اختیار کیا ہے جو روسی عوام کے گیتوں اور رزمیہ شاعری میں اس قدر لطافت پیدا کردیتا ہے، اور وہ نقل اتارنے میں ایسا کامیاب ہوا ہے کہ نظم پڑھتے ہوئے کبھی شبہہ تک نہیں ہوتا کہ وہ ایک تربیت یافتہ مذاق کی تصنیف ہے۔ نظم کا موضوع زار ایوان چہارم کے عہد کا ایک دردناک واقعہ ہے، اور لیر منتوت اسے بالکل اسی طرح شروع کرتا ہے

---

* ایک دریا کا نام ہے۔

جیسے روس کے پیشه ور رزمیه داستانوں کے گانے والے * اپنے قصے:

ارے هاں هاں زار ایوان وسیل یوچ!
هم نے تجهه پر اپنا گیت بنایا هے،
تجهه پر اور تیرے چهیتے بوتی گارد کے سپاهی پر،
اور بهادر تاجر، کلاش نی کوف پر۔
هم نے اسے پرانے طرز پر بنایا هے
اور اس کے ساتهه سرود کا سر ملاتے هیں۔
اور هم اسے سناتے هیں اور سناکر روتے هیں۔
پراوو سلاف نسل کو اس سے تسلی هوتی هے۔
اور نواب ماتویئی رومودانوف سکی
همارے واسطے پینے داو شهد کا ایک پیاله لائے
اور ان کی گورے مکهڑے کی بیگم
چاندی کے طشت میں همارے لئے
کاڑها هوا ریشم کا نیا رومال لائیں۔
هم کو تین دن تین رات مهمان رکها، هماری خاطر کی
سارا قصه سنا، اور سننے سے ان کی طبیعت سیر نه هوئی۔

اس تمهید کے بعد اصل قصه شروع هوتا:

آسمان پر آفتاب نهیں چمک رها هے،
نیلے بادل اس سے آنکهیں نهیں اڑا رهے هیں
بلکه زار ایوان اپنے دربار میں رونق افروز هے، اور چاروں طرف اس کے درباری اور خاص مصاحب کهڑے هیں - زار ایوان اپنے بوتی گارد کے سپاهیوں کو

* هندوستان میں انهیں بهاٹ کهتے هیں —۔

خاص اُلفت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ان میں سب خوش اور مطمئن معلوم ہوتے ہیں، سوا ایک کے۔ یہ اس کا چہیتا کرب بے یوچ ہے۔ اوان اس سے افسردگی کی وجہ دریافت کرتا ہے، اس خیال سے کے شاید کسی چیز کی ضرورت ہو۔ لیکن پوچھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل وہ ایک عورت پر عاشق ہوگیا ہے:

اس کی چال سبک، جیسے ہنس کا تیرنا،
اس کی آنکھہ رسیلی، جیسے فاختہ کی،
بات کرے، جانو بلبل گارہی ہے،
اس کے گالوں پر صبح کی سی سرخی ہے،
اس کے سنہرے بال، جن میں سونے کی چمک ہے،
رنگین فیتوں سے چوٹیوں میں بندھے ہیں،
وہ اس کے کندھوں پر رہنگتی ہیں، دوڑتی پھرتی ہیں،
گورے سینے کو بوسے دیتی ہیں۔
وہ ایک تاجر کے گھرانے میں پیدا ہوئی ہے،
نام اس کا الینا دمیترفنا ہے۔

بادشاہ اسے ایک معمولی دل کا ماجرا سمجھہ کر کرب بے یوچ کو زیور اور جواہرات دینے کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنی معشوقہ کو شادی کرنے پر راضی کرلے۔ لیکن واقعہ کچھہ اور ہی تھا:

ارے ہاں ہاں زار اوان وسیلی یوچ!
تیرے چالاک غلام نے تجھے دھوکا دیا،
تجھے سچی بات نہیں بتائی۔
تجھے یہ نہیں بتایا کہ حسینہ کا

خدا کے گرجا میں نکاح ہوچکا ہے '
اس کا ایک جوان تاجر سے نکاح ہوچکا ہے
ہمارے عیسائی مذہب کے مطابق . *
ہاں جوانو گاؤ '
مگر مرود کے سر ملا لو .
ہاں جوانو ' گاؤ '
مگر بات سمجھہ لو .
ایک خلیق نواب کو خوش کرنا ہے
اور ان کی گوری بیگم کو .

ایک دن جب الیونا ہ میترونا گرجا سے شام کو گھر واپس آرہی تھی تو کرب یے یوچ نے سر راہ اس کو زبردستی پیار کیا اور ہمسایوں کی نظروں میں اسے ذلیل کیا . اس حادثے کی وجہ سے اسے گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی ' اور اس کا شوہر کلاش نی کوت جو انتظار کر رہا تھا ' اس پر بہت خفا ہوا . اس بیچاری نے معافی مانگی ، اور کرب یے یوچ کی شرارت کا سارا قصہ سنایا . دوسرے دن بادشاہ کے سامنے گھونسے بازی کا عام مقابلہ ہونے والا تھا ' اور کلاش نی کوت نے تہیہ کیا کہ اس بدمعاشی کی سزا میں کرب یے یوچ سے مقابلہ کرکے اسے جان سے مار ڈالے گا ' لڑائی میں اس کی آرزو پوری ہوئی . کرب یے یوچ ' جس نے مقابلے کے لئے عام چیلنج دیا تھا اس کا گھونسا کھا کر مرگیا . لیکن بادشاہ کو اپنے چہیتے کے مارے جانے پر سخت غصہ آیا ' اور اس نے کلاش نی کوت سے پوچھا کہ اس نے کرب یے یوچ

---

* یہاں پر نظم کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے . اس کے بعد کے چھہ مصرعوں سے گوئیوں کے گیت ختم کرنے کا طرز معلوم ہوتا ہے .

کو قصداً جان سے مارا ہے یا محض اتفاق سے ۔ کلاش نی کوف نے بے دھڑک جواب دیا کہ اس نے قصداً مارا ہے اس کی وجہ وہ سوا اپنے خدا کے اور کسی کو بتانے پر تیار نہیں ۔ بادشاہ کا ارشاد ہوا :

اچھا ہوا، میرے بیٹے،
دلیر جوان مرد، تاجر کے لڑکے،
جو تونے مجھے سچا جواب دیا ۔
تیری جوان بیوہ اور تیرے یتیموں کو
میں خزانے سے گذارا دلوادوں گا،
تیرے بھائیوں کے لئے آج سے حکم جاری کرتا ہوں
کہ وہ تمام ملک روس میں
بے محصول ڈیوٹی تجارت کرسکیں ۔
لیکن تو میرے بیٹے، تو جا،
اس اونچی قتل گاہ پر
اور جلاد کے سامنے اپنا شوریدہ سر جھکا دے ۔
میں حکم دوں گا کہ تبر تیز کرلیا جائے،
جلاد سے کہوں گا کہ شاندار وردی پہن لے،
بڑے گھنٹے گھر کا گھنٹا بجواؤں گا،
جس سے سب کو معلوم ہوجائے
کہ تو بھی میری عنایتوں سے محروم نہیں رہا ۔

چنانچہ کلاش نی کوف معمولی مجرموں کی طرح قتل کرکے دریائے موسکوا کے اس پار ایک مقام پر دفن کردیا گیا جہاں تین سڑکیں آکر ملتی تھیں ۔

اس کی قبر کے پاس سے خلق خدا گذرتی ہے ۔

کوئی بوڑھا ہوا، تو سیلے پر صاحب کا نشان بنا تا ہے،
کوئی بانکا ہوا تو اکڑ کر چلنے لگتا ہے،
کوئی لڑکی ہوئی تو اس کی آنکھیں نم ہوجاتی ہیں،
اور کوئی سرود بجانے والا، تو وہ گا اٹھتا ہے۔
ہاں، بہادر جوانو،
سرود بجانے والو،
بات دار آواز والو،
شان سے شروع کیا تھا، شان سے ختم کرو،
خوش بخت نواب کی جے!
ان کی گوری بیگم کی جے!
عیسائی ملت کی جے!

تعریف سے ہر شخص خوش ہوتا ہے، اور وہ شاعر جو ہر دل عزیزی کی منزل تک سب سے چھوٹے اور آسان رستے سے پہنچنا چاہتے ہیں۔ عموماً اپنے وطن اور ہم وطنوں کی مدح سرائی سے یہ آرزو پوری کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر جہاں کہیں نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اس خاص ملک کے کٹر اور تنگ نظر وطن پرستوں کے سوا کبھی کسی کو پسند نہیں آسکتی ہاں، کیونکہ یہ موضوع کبھی کسی سچے شاعر کے شایان شان ہو نہیں سکتا۔ روسی ادب میں ایسی نظمیں بہت کم ملتی ہیں کچھ اس وجہ سے کہ روسی ذہنیت کبھی یورپ کی مروجہ وطن پرستی کی تعلیم پورے طور پر قبول نہیں کر سکی، کچھ اس لئے کہ ریاست کے جبر نے وطن میں زندگی بسر کرنا ہی دوبھر کر دیا تھا۔ روس میں ضرورت در اصل ایسے شاعر کی تھی جو لوگوں کی پست ہمتوں کو بلند کرے، انہیں ریاست کے جبر اور تشدد

کی مخالفت پر آمادہ کرے، اور ان میں آزادی کا حوصلہ بڑھائے۔ مگر اس راہ پر پہلا قدم رکھنا گویا سائبیریا کے کسی قید خانے میں عمر کے چند سال گذار نے کا ارادہ کرنا تھا ' اور کوئی تعجب نہیں کہ اس ہیبت ناک سزا کے خوف نے روسی شاعروں کو اس نوعیت کے قومی کلام سے باز رکھا۔ ریل یے یف، پشکن کے دوست اور دکا برست بغاوت کے رہبر نے اس قسم کی شاعری شروع کی ' اور اس کی سزا بھگتی، لیکن اس کا نہ تو کوئی اُستاد تھا نہ اسے کوئی شاگرد ملا۔ اس کے بعد اگر کسی شاعر نے ریاست کے جبر و تشدد کا خاکہ اُڑایا تو لیرمنتوف نے۔ وہ اس قدر مغرور، بیباک اور من چلا تھا کہ اسے سزا کی مطلق پروا نہ تھی، مگر انہیں صفتوں نے اسے ہم وطنوں سے ایسا بیزار کردیا کہ اُسے ان میں آزادی کے ولولے پیدا کرنے کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ پشکن کے ماتم میں اس نے جو نظم لکھی وہ روسی دربار اور سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کی بہت سخت ہجو ہے، لیکن اس میں لیرمنتوف نے اپنا غصہ اُتارا تھا ' قوم میں شورش پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، اسی وجہ سے اسے سزا بھی معمولی ملی۔ اس نظم کے بعد لیر منتوف نے نہ پشکن کی طرح زار کی مدح سرائی کر کے اپنی صفائی کی ' نہ مہمل قوم پرستی کے جذبے سے دل کے داغ مٹانا یا ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ اس کی بے نیازی اور بے پروائی کا رنگ وہی رہا جو پہلے تھا ' اور افسوس ہے قوم کے مستقبل سے وہی بے تعلقی رہی جو پہلے تھی۔ اس نے ایک دو نظموں میں سر زمین روس سے لگاؤ ظاہر کیا ہے ' کہیں کہیں مثلاً ذیل کے اقتباس • میں روسیوں پر اعتراض کئے ہیں جن کا کوئی سننے اور تسلیم کرنے والا ہوتا تو بہت فائدہ حاصل کر سکتا تھا :

• نظم کا عنوان "ایک خیال" ہے —

شاعرانہ خواب، ارٹ کے کار نامے،
ہمارے ذہن کو کسی شیریں نشے سے مست نہیں کرتے
جو ذرا سی حس ہم میں باقی ہے اُسے کنجوسی سے جمع کئے ہوے بیکار خزانے کی طرح
ہم بڑے لالچ سے سینے میں محفوظ رکھتے ہیں۔
ہماری محبت اور نفرت دونوں اتفاقی ہوتی ہیں۔
ہم نہ محبت کا کچھ صدقہ دیتے ہیں اور نہ نفرت کا
اور اس وقت جب خون اُبل اُٹھتا ہے
ہماری روح عجیب سردی سے ٹھٹھری رہتی ہے۔
ہمارے آبا و اجداد نے دل بہلانے کے جو پر تکلف طریقے سوچے تھے،
اوراُن کی سیدھی سادی بچوں کی سی شہوت پرستی ہمیں سیٹھی لگتی ہے،
ہم بغیر کوئی یادگار چھوڑے، بغیر کوئی لطف حاصل کئے
اپنے آپ پر ہنستے ہوے قبر کا راستہ لیتے ہیں۔

لیرمنتوت یقیناً اس کی قابلیت رکھتا تھا کہ روسی قومیت میں روح پھونک دے اور روسی وطن پرستوں کے لئے خیالات اور جذبات کا وہ سرمایہ فراہم کردے جو ان کے عقاید کی تبلیغ کے واسطے بہت ضروری تھا، اور جس کے نہ ہونے سے روس کی ہر قومی تحریک کو صدمہ پہنچا۔ تقدیر کومگر کچھ اور منظور تھا۔ آخر بارقفقاز جاتے ہوئے لیر منتوت اپنے وطن سے یوں رخصت ہوا۔
الوداع گندے روس،
اے غلاموں اور آقاؤں کے مالک!
الوداع، آسمانی وردیو*،
الوداع، وردیوں کی تابعدار قوم!

---

* روس کے فوجی افسروں کی وردیاں آسمانی ہوا کرتی تھیں—

تبصرے

ادب

اُردو کے جدید رسالے

اردو رسالوں کے خاص نمبر

تبصرے

ادب

مراثی انیس جلد سوم

(مرتبہ نواب حیدر یار جنگ بہادر مولانا علی حیدر طبا طبائی -
نظامی پریس بدایوں - مجلد قسم اول آٹھ روپے قسم دوم چھ روپے)

نواب مسعود جنگ بہادر کی ایک تجویز یہ تھی کہ اردو کے نامور شعرا کا کلام صحت و نفاست کے ساتھ طبع کیا جائے اس کا اہتمام انہوں نے نظامی پریس بدایوں کے تفویض کیا - اس سلسلے کو اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے - چنانچہ اس سلسلے کی کئی کتابیں شایع ہوچکی ہیں - مراثی انیس بھی اسی سلسلے میں ہیں - ان کی پہلی اور دوسری جلد اس سے قبل شایع ہوچکی ہے - پہلی جلد میں میر صاحب کی آخری عمر کا استادانہ کلام ہے' دوسری جلد میں زمانۂ متوسط کا مشاقانہ کلام اور اس تیسری جلد میں زمانہ شباب کا ابتدائی کلام جمع کیا گیا ہے - اس کی تصحیح و ترتیب مولانا علی حیدر صاحب نظم (نواب حیدر یار جنگ بہادر) نے فرمائی ہے اور ان سے بہتر اس کام کے لئے کوئی دوسرا شخص اہل اور

موزوں نہیں ہو سکتا - اس تیسری جلد کے ساتھہ میر صاحب کا کلام مکمل ہوگیا ہے - کتاب کے شروع میں مولوی نظام‌الدین حسن نظامی مالک مطبع نے اس ابتدائی کلام کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا ہے - اور جیسا کہ نواب مسعود جنگ بہادر کا منشا تھا کتاب بہت نفیس چھپی ہے - نظامی صاحب کا یہ کام قابل مبارک باد ہے —

منتخبات کلام ہندی

(مرتبہ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ - ڈی - استاد معاشیات و عمرانیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن - ناشر حیدرآباد بک ڈپو قیمت دو روپے آتھہ آنے مجلد) —

اس کتاب میں ہندی کے مختلف شاعروں کے ۹۹ دوہے درج ہیں جو اخلاق، فلسفہ اور عاشقانہ تخیل پر مشتمل ہیں - ہر دوہے کو اصل ہندی حروف میں اور اس کے نیچے اردو میں لکھا ہے - مشکل الفاظ کے معنے بھی دے ہیں - پھر دوہے کا مطلب بیان کیا ہے اور اس کے بعد تفصیل کے ساتھہ تشریح بھی کی ہے - انتخاب میں لایق مرتب نے ذوق سلیم سے کام لیا ہے - شروع میں ایک تمہید ہے جس میں ہندی کی خصوصیات اور ہندی بھاشا اور مسلمانوں کے تعلقات پر بحث کی ہے - آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں ان چند کتابوں کے نام اور ان کی کیفیت درج ہے جن کا مطالعہ ہندی زبان کی تاریخ اور ہندی ادب کے لئے مفید ہوگا - اس کتاب سے اردو داں اصحاب ہندی کلام کا لطف حاصل کر سکتے ہیں - فاضل مرتب کی سعی اور تلاش قابل تحسین ہے اکثر دوہے اس میں ایسے ملیں گے جو زبان زد اور بہت مقبول ہیں اور زبان کی شیرینی اور خیالات کی خوبی اور نزاکت کی وجہ سے ضرب‌المثل ہو گئے ہیں - ''منتخبات کلام ہندی'' کا نام کچھہ موزوں نہیں معلوم ہوتا - یہ سارے دوہے چند صفحوں میں آسکتے ہیں —

پطرس کے مضامین

(یعنی مضامین اے - ایس بخاری بی - اے (کنٹب) ایم - اے ،
گورنمنٹ کالج لاہور - دارالاشاعت پنجاب لاہور) —

پطرس صاحب کے ظریفانہ مضامین اکثر رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں اور پسند کئے گئے ہیں - یہ دس مضامین انھیں رسالوں سے جمع کر کے مرتب کئے گئے ہیں - بعض مضمون فی الحقیقت پر لطف ہیں - اگرچہ کہیں کہیں بھونڈا پن آگیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ حضرت پطرس ظریف الطبع انسان ہیں اور بعض نکتے اپنی خاص طرز میں بڑی خوبی سے بیان کر گئے ہیں - اگرچہ ان کا ادعا ہے کہ ان مضامین کے سب اشخاص خیالی ہیں اور یہ سچ بھی ہے لیکن جو باتیں وہ لکھ گئے ہیں ، حقیقت سے دور نہیں ہیں —

مثنویات میر

مرتبہ آنریبل جسٹس ڈاکٹر سرشاہ محمد سلیمان ایم - اے ، ایل - ایل - ڈی ، بیرسٹر ایٹ لا جج ہائی کورٹ الہ آباد ، صفحات ۱۳۲ بڑی تقطیع لکھائی چھپائی اچھی ، کاغذ عمدہ ، قیمت ۱ روپیہ ۸ آنے ملنے کا پتہ - نظامی پریس بدایون -

سرشاہ محمد سلیمان نے اساتذہ اردو کے کلام کے انتخاب کا ایک سلسلہ جاری کیا ہے اس سے قبل کلام ذوق کے دو انتخاب شایع ہوچکے ہیں یہ کتاب اسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے اس میں میر کی مثنویوں کا انتخاب ہے - مثنویوں سے اکثر ایسے اشعار جو بزعم مرتب بھرتی کے تھے اور جن میں نحش اور ابتذال پایا جاتا تھا حذف کردیے گئے - اس سے یہ ہوا کہ مثنویوں کی روئداد بگڑ گئی ، اکثر قصے پورے طور سے بیان نہ ہوسکے

لیکن چونکہ لایق مرتب کا مقصد صرف عمدہ اور معیاری کلام کو پیش کرناہے اس لئے یہ نقص گوارا کیا گیا —

مہر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ھے - فاضل ادیبوں نے مہر کی حیات اور شاعری پر بڑے معرکۃالآرا مضامین لکھے ھیں - اب اس باب میں کچھ کہنا بے سود ھے -

فاضل مرتب نے شروع میں ۳۲ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ھے جس میں مہر کے سوانح پر سیر حاصل بحث کی ھے اب تک مہر پر جو کچھ لکھا گیا ھے اس سے انھوں نے مدد لی ھے- مختلف تحریروں سے استفادہ کرکے اسے نئی ترتیب سے اپنے الفاظ میں بیان کیا ھے- مقدمہ میں دو تین باتوں پر خاص طور پر بحث کی ھے جن سے فاضل مرتب کے ذوق تلاش و تحقیق کا ثبوت ملتا ھے مہر کے نام، سنہ ولادت اور ذکر مہر کے متعلق انھوں نے کافی تجسس سے کام لیا ھے -

مہر کے کلام پر بھی مختصر سا تبصرہ ھے - لیکن اس میں بھی جابجا دوسرے نقادوں کی تنقیدوں کے حوالے اور اقتباسات ھیں —

فاضل مرتب نے محمد حسین آزاد کی حمایت کسی قدر دبی زبان سے کی ھے - مختلف شہادتوں سے یہ روشن ھے - کہ آزاد کی نظر سے کتاب ذکر مہر نہیں گزری تھی - اب آزاد کی حمایت میں تاویلیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں - حاشیہ پر مشکل اور متروک الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ھیں —

(چ)

افادات مہدی

از ایم مہدی حسن مرحوم- مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈہ.
قیمت ۳ روپیہ ۸ آنہ -

مہدی حسن مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ دوسری مرتبہ طبع ھوکر شایع ھوا ھے - اردو داں پبلک سے امید ہے کہ وہ اس کی قدر افزائی میں کسی قسم کی کوتاھی نہیں کرے گی - مرحوم انشا پردازوں میں سے ھوے ھیں جنھیں اگر موت نے مہلت دی ھوتی تو ان کی ذات سے ھماری زبان کی وسعت اور ترقی میں بہت کچھ مدد ملتی ان میں

وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو ایک بڑے پایہ کے ادیب میں ہونی چاہئیں۔ اُن کا مذاق نہایت ستھرا تھا اور ان کی نظر میں ایسی وسعت تھی جو ہمارے ہاں اچھے اچھوں میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ باوجود تعلقداری کے انتظامی جھگڑوں میں پھنسے رہنے کے انہوں نے اپنی علمی اور ادبی دلچسپیوں کو برابر قایم رکھا۔ یہ سچ ہے کہ جن مسائل پر انہوں نے قلم اٹھایا ان میں سے بیشتر ہنگامی حیثیت رکھتے تھے مگر ان کا مخصوص اسلوب بیان ان تحریروں کو ادبی ابدیت عطا کرنے کا ضامن ہے۔ اصل میں خالص ادب زندگی کی تصویر کا وہ رنگ ہے جو ہر کہیں اور ہر وقت کھپ سکتا ہے۔ زندگی کی ہرچیز ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ قانون بدلتے رہیں گے، رسمیں بدلتی رہیں گی، مگر حسن تخیل سے لطف اندوز ہونا اور اسے عزیز رکھنا انسان کی ایک ایسی عادت ہے جو کبھی نہیں بدلے گی۔ ادب کی مثال اس مضراب کی سی ہے جو دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور جس کا نغمہ انسان کی خوابیدہ روح کو بیک وقت بیدار بھی کرتا ہے اور مست بھی ــ

مہدی حسن مرحوم میں وہ صلاحیتیں تھیں جو بڑے ادیب میں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا خوب لکھا اور ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ جیتے رہتے اور اپنے ادبی مشغلہ کو جاری رکھتے تو ان کے ادبی پایہ کی بلندی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ــ

ہنگامی علمی ادبی بحثوں کے علاوہ انہوں نے ادب عالیہ (Belles lettres) کا بڑے سلیقہ سے اردو میں رواج دیا چونکہ انہوں نے مغربی ادب کی اس صنف کا انگریزی زبان کے توسط سے مطالعہ کیا تھا اس لئے بعض موقعوں پر وہ بلا تکلف انگریزی ترکیبیں اور بندشیں اردو میں استعمال کرجاتے ہیں مگر اس سلیقہ کے ساتھ کہ مذاق سلیم پر گراں نہیں گذرتیں۔ ممکن ہے کہ یہ بندشیں انگریزی نہ جاننے والوں کو نامانوس سی معلوم ہوتی ہوں۔ یہ مجموعہ مضامین اس قابل ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے اس کا مطالعہ کریں ــ

(ی)

طائر خیال

(از سدرشن - سدرشن پبلشنگ ہاؤس - لاہور - قیمت ایک روپیہ ۴ آنے)

' سدرشن ' پنجاب کے مشہور فسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ حق یہ

ہے کہ ان کی کہانیاں عوام الناس کے لئے دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور سبق آموز بھی۔ طائر خیال اسی قسم کی بارہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ابھی حال میں شایع ہوا ہے۔ کہانیوں کی فہرست یہ ہے عروس شاعری؛ نورو ملتر؛ مصور کی زندگی؛ سدا سکھ؛ باپ؛ ایک نامکمل کہانی۔ دوسرو کی طرف دیکھ کر؛ دو خدا؛ جب لاش نے شہادت دی؛ شعلۂ مضطر؛ کایا پلٹ؛ بچپن کا ایک واقعہ —

ان سب کہانیوں کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ بعض جگہ زبان کو زیادہ رنگین بنانے کی کوشش میں لغزشیں ہوگئی ہیں جیسے صفحہ ۱۲ پر ہے: "آسمان پر خالی تھیلیوں لہراتی نہیں جیسے دل مایوس پر امید چھائی رہتی ہے"۔ یہ فقرہ سمجھ میں نہ آیا۔ اگر دل مایوس پر امید چھائی رہی تو ظاہر ہے مایوسی کوئی اور ڈھونڈنا تلاش کرے گی! اسی طرح ان کہانیوں میں ایک عیب یہ ہے کہ ان کے کیرکٹر اپنے اعمال زندگی کے معمول سے بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پر اسرار سے معلوم ہوتے ہیں حالانکہ دیباچے میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ ان کہانیوں کا مقصد زندگی کو اپنے اصلی خط و خال میں پیش کرتا ہے۔ پڑھنے والے کو بہت ساری اس قسم کی مثالیں مل جائیں گی۔ یہاں ان کی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی —

(ی)

اوراق پریشان

(از محمد صادق حسین صاحب بی اے علیگ۔ مطبع اسرار کریمی الہ آباد۔
قیمت ایک روپیہ چار آنے)

محمد صادق حسین بی اے علیگ نے اس نام سے اپنے متفرق مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے جو مختلف رسالوں میں نکل چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں چار افسانے ہیں اور دس مضامین۔ افسانوں کی فہرست یہ ہے: وصال؛ استانی کی بیٹی؛ انتقام؛ حاصل عمر —

مضامین کے عنوان یہ ہیں: مقصود فطرت؛ معلم اول؛ عورت ہندوستان میں؛

ہمہ دان ؛ اصلاح سخن ؛ تقسیم عالم ۔۔

مضامین اور افسانوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب کو صنف لطیف سے خاص شغف ہے۔ اور یہ کوئی عیب نہیں۔ مگر اس کے ساتھ بعض ذوقی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں جن سے وہی پورے طور پر عہدہ برا ہوسکتے ہیں جو اس نازک موضوع پر قلم اُٹھانے کے اہل ہیں ہر وہ شخص جسے دو حرف لکھنا آتے ہیں اس بات پر مصر معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر وہ کچھ کہے اور اس پر اس سے بڑی زیادہ اصرار ہے کہ دوسرے اسے سنیں بھی ضرور۔ اس نوع کے نام نہاد ادیبوں کو اطلاعاً بتلایا جاتا ہے کہ خدا را اب وہ بس کریں۔ یہ باتیں سنتے سنتے لوگوں کے کان پک گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اُکتا کر اردو زبان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں جس میں سوائے اس قسم کی مزخرفات کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ زندگی کی سنجیدگیاں اس بات کی متوقع ہیں کہ ہماری زبان اُس کے ان سب پہلوؤں کو روشن کرے جو ابھی تک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چھپے ہوئے ہیں جس سے باہر نکلنے کی اس وقت تک اُمید نہیں ہے جب تک کہ ہمارے نوخیز انشا پرداز محنت اور متانت سے اُن سب پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ جو دوسروں کو کچھ بتانا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ پہلے وہ خود اس چیز کو جانتا اور سمجھتا ہو ادب اور انشا پردازی کے میدان کو سہل العمل نہیں سمجھنا چاہئے۔ بغیر ریاض کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ یہ اصول عام زندگی کی طرح ادب میں بھی موثر ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے نوخیز "ادیبوں" اور "انشا پردازوں" کو اس کا احساس ہو ــ

ان افسانوں میں ایک فنی عیب یہ ہے، جو ہماری زبان کے اکثر فسانہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے، کہ انہیں پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فطرت کی ساری قوتیں 'ہیرو' یا 'ہیروئن' کی کاربرآری کے لئے بے تاب ہیں۔ پہلے افسانہ میں 'محمود' اور 'حمیدہ' کی جدائی کے بعد ملاقات ہمارے اس مطلب کی توضیح کرے گی۔ پھر یہ کہ اتفاقات زندگی کو اتنی اہمیت دینی چاہئے کہ وہ زندگی کے معمول سے کھلم کھلا ٹکراتے ہوئے نہ نظر آئیں۔ اور اس کی توقع اسی وقت کی جاسکتی ہے جب ہمارے فسانہ نگار کتب اور زندگی دونوں کے مطالعہ کو وسیع کریں ــ

(ی)

انقلاب افغانستان

(از ابرار حسین قادری ایم اے ال ٹی مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اس ڈرامے کا موضوع افغانستان کی حصول آزادی ، امیر امان اللہ خان کی سیاحت یورپ اور انکی اصلاحات ملکی ہیں ۔ مصنف کے پیش نظر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امیر امان اللہ خان کو اور ملکہ شاہ خانم ثریا کو حق بجانب ثابت کیا جائے ۔ زبان کے اعتبار سے بعض مقاموں میں اچھا خاصا زور موجود ہے لیکن شروع سے آخر تک یکسانیت اور روانی نہیں - انگریزی بندشیں بکثرت استعمال کی گئی ہیں جیسے صفحہ ۲۳ پر بادشاہ اعظم سے کارنل رالنس امیر صاحب کے متعلق کہتے ہیں :" دنیا کو اس ہستی میں نشاط و غم کے بہت سے تماشے دیکھنے ہیں" صفحہ ۲۰ پر ہے ." ہم علم تہی مایہ ملاؤں کی تعلیم کی بندش " بندش ' ممنوع کے لئے استعمال کیا گیا ہے ' یا مثلاً کمال پاشا امیر صاحب سے کہتے ہیں :- ہم " یورپ کو یورپ ہی کے سکوں میں خریدیں گے " - وغیرہ —

(ی)

حیات تبسم

(نظم) از جناب قاضی محمد رمضان صاحب تبسم - دارالعلم وزیرآباد (پنجاب) قیمت ڈیڑھ آنہ

رونِ جہاں

(نظم) از تبسم صاحب قیمت ڈیڑھ آنہ

محشر خیال

چند نظمیں اور غزلیں - نتیجۂ فکر جناب مرزا محمد عسکری صاحب مجازی لکھنوی اگرچہ چند ہی نظمیں ہیں مگر خوب ہیں - خیالات کے لحاظ سے بھی اور طرز بیان کے اعتبار سے - بھی ادب لکھنو سے دو آنے میں مل سکتی ہے —

خزینۂ تاریخ

(یعنی بزم تاریخ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا گلدستہ مضامین - شایع کردہ مجلس کا پہلۂ بزم واقع کلیہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے —

عثمانیہ یونیورسٹی میں جہاں اور انجمنیں ہیں ' منجملہ ان کے ایک ممتاز انجمن بزم تاریخ بھی ہے - جس کے صدر ناظم پروفیسر ہارون خاں شیروانی صاحب اور نظما تاریخ کے باقی پروفیسر اور لکچرار ہیں - بزم کے صدر ' معتمد ' خازن اور اراکین سب طلبہ ہیں - جو مضامین اس بزم کے لئے لکھے جاتے یا اس کے جلسوں میں پڑھے جاتے ہیں ' وہ ہر سال کتاب کی صورت میں شایع کردیے جاتے ہیں - اس سے قبل خزینۂ تاریخ کا پہلا نمبر تقریباً اڑھائی سال ہوے جب شایع ہوا تھا اور یہ دوسرا نمبر ہے اِس میں چودہ تاریخی مضامین نظم و نثر کے ہیں - سات نثر کے مضمون ہیں اور سات نظمیں ہیں —

مضمون مختلف مدارج اور مختلف حیثیتوں کے ہیں لیکن کوئی خاص تحقیقی مضمون نہیں - ہندوستان کی تاریخ میں تحقیق کی بہت کچھ گنجائش ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ ہونہار بزم ضرور اس طرف توجہ کرے گی اور اگر سال دو سال میں بھی ایک آدھ ایسا مضمون نکل جاے جو محققانہ ہو تو یہ بزم بڑا کام کرے گی —

رومی اور اسلامی ادارۂ غلامی

(از محمد حمید اللہ ایم اے (عثمانیہ) سلسلۂ بزم قانون کلیہ جامعہ عثمانیہ - قیمت ۴ آنے)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس رسالہ میں محمد حمید اللہ صاحب ایم اے (عثمانیہ) نے اسلامی اور رومی غلامی کے اداروں کا ایک تقابلی جائزہ لیا ہے - وہ دوسرے اور محققین کی طرح ' اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلامی تمدن میں غلامی کی حالت اس سے کہیں بہتر تھی جسکا نقشہ momson نے اپنی مشہور تاریخ رومہ میں پیش کیا ہے - اسلام ابتدا ہی سے ایک عملی مذہب رہا ہے - اور خیال اور عمل کا بڑا فرق یہ ہے کہ خیال میں انسان انتہائی نقطۂ نظر اختیار کرسکتا ہے مگر عمل میں یہ ممکن نہیں - زندگی میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آتی ہیں - اس لئے عمل میں انسان انتہا پسندی سے بہت گھبراتا اور ہچکچاتا ہے - عملی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام نے بعض ایسے اداروں کو تبدیل اور اصلاح شدہ صورت میں باقی رہنے دیا جنھیں وہ دراصل مٹانا چاہتا تھا - غلامی بھی انھیں اداروں میں سے ایک ہے - اسلام نے مصلحت وقت اسی میں سمجھی کہ رومہ کی تہذیب کے اس ادارہ کو متادیلے کی بجائے اس میں اصلاح کردے - رہا یہ سوال کہ اسلامی قانون کہاں تک رومیوں کے قانون کا رہین منت ہے ' اس پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں

اس رسالے میں جو بحث کی گئی ہے اس میں اصل مسئلہ ایک حدتک تشنہ رہ جاتا ہے - ہمیں امید ہے کہ یہ سرسری مطالعہ اس مسئلہ پر مزید تحقیق کا پیش خیمہ ہوگا -

---

سفر انگلستان

(از منشی رشید احمد صاحب ' بی - اے - جی ' ٹی - آئی - ای - رہنمائے تعلیم ' رام گلی ' لاہور)

یہ ایک مستعد طالب علم کا سفر انگلستان ہے جو چلنگلت ولایت کی تعلیم

کی تکمیل کے لئے وہاں پہنچے اور اڈنبرا کے فارسٹ کالج میں داخل ہوے - قابل مولف نے ابتدائی سفر سے آخر قیام تک سارے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں - خاصکر لندن، اکسفورڈ، اڈنبرا وغیرہ کے حالات وہاں کے قیام و تعلیم، مقامات تفریح، رسوم و رواج، ملاقاتوں وغیرہ کا حال خوب لکھا ہے - جن کو کبھی انگلستان جانے کا اتفاق نہیں ہوا یا جو جانے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کے پڑھنے کے لئے اچھی کتاب ہے —

صحن عالم

[مولانا جناب سید اکبر علی صاحب ایم - اے، ال، ٹی، اسسٹنٹ ماسٹر شعبہ کالج لکھنؤ صفحات ۲۵۶، چھوٹی تقطیع، مؤلف کے پتہ سے ۱۲ آنے میں مل سکتی ہے]

لایق مولف نے جغرافیہ کی یہ کتاب مدارس فوقانیہ کے ان طلبہ کی سہولت اور آسانی کے لئے لکھی ہے جو انگریزی میں سمجھنے اور جوابات ادا کرنے کی استعداد نہیں رکھتے ہیں —

اس کی دو جلدیں ہیں - پہلی جلد چھپ چکی ہے جو ہمارے پاس تبصرے کی غرض سے بھیجی گئی ہے دوسری زیر طبع ہے اس جلد میں پانچ حصے ہیں - ریاضیات، علم الارض، طبیعات، نباتیات اور اقتصادیات اس میں جغرافیے کے سب مشکل مضامین اور مسایل درج ہیں - جن کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے - لیکن طرز بیان کچھ ایسا ہے کہ طلبہ آسانی سے نہیں سمجھ سکتے پہلے تو اس میں جغرافیے کی جس قدر اصطلاحات ہیں وہ تمام تر انگریزی میں ہیں، ان کے موزوں اور عام فہم ترجمے نہیں - پھر جگہ جگہ انگریزی اصطلاحات کی صرف توضیح و تشریح ہے - اس سے یہ ہوا کہ نفس مضمون پر عمدگی سے بحث نہ ہو سکی اور اسلوب بیان میں تسلسل اور دلنشینی بھی باقی نہیں رہی - مضامین تشنہ اور غیر واضح رہ گئے ہیں —

انگریزی میں کم استعداد رکھنے والے طلبہ کے لئے اب بھی وہی دقت باقی رہی جو پہلے تھی - اس لئے کہ اس میں تقریباً انگریزی کی وہ سب اصطلاحات للطبعی رسم الخط میں موجود ہیں جو انگریزی کتابوں میں ملتی ہیں - کہیں کہیں ان کی

صرف تعریف اور توضیح ہے جس سے ظاہر ہے کہ خاطر خواہ سہولت نصیب نہیں ہو سکتی —

مضامین کو سمجھانے کے لئے ۲۲ شکلیں اور ۱۳ نقشے بھی دے گئے ہیں جو بہت بھونڈے ہیں اور بے احتیاطی سے بنائے گئے ہیں —

کہیں کہیں لایق مولف نے بڑا دل چسپ استدلال کیا ہے ' زمین کے گول ہونے کو کس پر لطف طریقے سے ثابت کیا ہے :—

" زمین کا چونکہ بہت کم حصہ دکھائی دیتا ہے اس وجہ سے ہمیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ زمین چپٹی ہے' اس غلطی کا زیادہ تر سبب یہ ہے کہ ہماری نظر محدود ہے' ایک وقت میں ہم صرف تھوڑا سا حصہ زمین دیکھہ سکتے ہیں لہذا یہ ہم کو چپٹا نظر آتا ہے لہذا ثابت ہوتا ہے کہ زمین گول ہے "

لایق مرتب کی یہ کوشش لایق داد ہے کہ اُنھوں نے بہت مشکل اور اہم مضمون پر قلم اُٹھایا - اصطلاحات کے ترجموں کا مرحلہ بہت سنگلاخ ہے اس کو آسانی سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ تا ہم ایسے مضامین کو جہاں تک ممکن ہو عام فہم اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ طلبہ اور خصوصاً کم استعداد طلبہ آسانی اور سہولت کے ساتھہ مضامین اخذ کرسکیں —

آیندہ اگر اس کتاب کے طبع ہونے کی نوبت آے تو اُمید ہے کہ لایق مرتب ہمارے مشورے کو پیش نظر رکھینگے —

[چ]

تعلیم اِسلام

[مرتبہ مولوی سید معین‌الدین صاحب مترجم اصولین یونا پارٹ
صفحات ۵۲ ' چھوٹی تقطیع ' لکھائی چھپائی اوسط درجے کی
قیمت چار آنے ملنے کا پتہ : نظامی پریس بدایون]

اِس مختصر رسالے میں لائق مرتب نے اِسلامی تعلیمات کا ایک سرسری خاکہ

اس فہرست پر نظر کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ فلسفہ کی کوئی کتاب ہے ' لیکن ایسا نہیں ہے مصنف نے فلسفہ و منطق کے الجھیڑے میں پھنسنے کی بجائے شاعری سے کام لیا ہے - ہر مضمون میں اردو اور فارسی شعرا کے اشعار نقل کئے ہیں - کہیں ان پر استدلال کیا گیا ہے ' کہیں ان کی تشریح کی گئی ہے اور کہیں ان کو ثبوت میں پیش کیا گیا ہے ' کہیں کہیں آیات قرآنی اور احادیث سے بھی مدد لی گئی ہے —

اس میں کوئی خاص اور نئی بات نہیں ' عام حقایق اور صداقتیں ہیں جن کو دلچسپ پیرایہ میں لکھنے کی کوشش کی ہے - جو لوگ ایسے خشک مضامین کے پڑھنے سے گھبراتے ہیں وہ اسے دلچسپ پائیں گے —

کتاب کے شروع میں جناب عزیز حسن صاحب بقائی مدیر پیشوا دہلی کا ایک دیباچہ بھی ہے - یہ دیباچہ کیا ہے مصنف کی شان میں قصیدہ ہے - اس میں بعض ایسے غیر ذمہ دارانہ دعوے ہیں جن کا لایق دیباچہ نویس کے قلم سے نکلنا موجب حیرت ہے - مثال کے لئے ملاحظہ ہو :—

" زبان اُردو ابھی تک اس قسم کی کتابوں سے ایک بڑی حد تک نا آشنا تھی اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جہاں اس سے عوام الناس کے لئے غور و فکر کا میدان وسیع ہوگیا ہے وہاں ایک قابل قدر ادبی خدمت بھی انجام دی ہے اور اردو زبان کی ایک بہت بڑی کمی بوجوہ احسن پورا کردینے کی ضامن ہے " —

(ج)

سرگزشت وزیر خاں لنکراں

اصل مع ترجمہ اُردو و فرہنگ محاورات و لغات جدیدہ - شروع میں ڈرامے پر ایک مقدمہ ہے - طلبہ کے لئے کارآمد ہے - مولوی محمد عبدالقوی فانی ایم - اے (جامعۂ لکھنؤ) نے احتیاط اور محنت سے مرتب کیا ہے - آسی پریس

محمود نگر لکھنؤ سے ایک روپیہ چار آنے میں مل سکتی ہے —

الترجمة العربیه

مرتبہ جناب مسعود عالم صاحب ندوی - عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمے پر چھوٹی سی اچھی کتاب ہے سید مطیع الرحمن صاحب شبلی ہوسٹل لکھنؤ یا شبلی بک ڈپو سے چار آنے میں مل سکتی ہے —

اخلاق الاشرف موسوم بہ فروغ بزم

سید محمد اشرف صاحب اشرف الہ آبادی نے مختلف موضوع خصوصاً اخلاقی مسائل پر بڑی اچھی اچھی رباعیاں لکھی ہیں - اصحاب ذوق کے پڑھنے کے قابل ہیں - قیمت مجلد ایک روپیہ غیر مجلد بارہ آنے - مولف سے حیدر آباد کے پتے سے مل سکتی ہے —

اردو کے جدید رسالے

هندستانی

(ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ - الہ آباد - سالانہ چندہ آٹھ روپئے)

صوبۂ متحدہ الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈیمی کو قائم ہوے چوتھا سال ہے اور اُس وقت

سے یہ ہندی اور اردو کے لئے یکساں کام کررہی ہے - اکیڈیمی کے فاضل جنرل سکرٹری ڈاکٹر تاراچند نے جو مجلس مدیراں کے بھی صدر ہیں - اپنے اداریہ میں اس کا مقصد یہ بیان کیا ہے " مختلف علوم پر کتابیں تحریر کرانا ، ادب کی کمیوں کو پورا کرنا اور اس قسم کی تصانیف کا ملک کے سامنے پیش کرنا جو عوام کی تعلیم کا ذریعہ بن سکیں " - اس مقصد کی تکمیل کے لئے منجملہ دیگر ذرائع کے ایک یہ ماہی یا سہ ماہی رسالہ ہے جس کا پہلا نمبر ماہ جنوری میں شائع ہوا ہے —

قابل اڈیٹر نے اس رسالہ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ " رسالے میں جہاں ہر قسم کے علمی ، ادبی ، تنقیدی اور اسانیاتی مضامین کے نکالنے کا ارادہ کیا گیا ہے وہیں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ساتھ کے ساتھ تخلیقی لٹریچر کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی رہے —

اس نمبر میں " تخلیقی لٹریچر " کا کچھ پتا نہیں لیکن ہمیں امید ہے کہ آئندہ اکیڈیمی کی سعی سے ایسی چیزیں اس رسالے میں نظر آئیں گی جس کی کمی اردو کا ہر بہی خواہ محسوس کرتا ہے - اس نمبر میں لکھنے والے بہت قابل اور اچھے لوگ ہیں جو اپنے فن کے ماہر ہیں اور اپنی ذمہ داری کو خوب سمجھتے ہیں - مضامین مختلف نوعیت کے ہیں اور سب اچھے اور پڑھنے کے قابل ہیں لیکن تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اردو کا بہترین رسالہ ہے یا ایسا اعلی درجے کا ہے جیسا کہ اکیڈیمی کا ہونا چاہئے یا جیسا کہ خود اکیڈمی چاہتی ہے اس کے لئے ہمیں کچھ دنوں انتظار کرنا چاہئے اور صرف پہلا نمبر دیکھ کر رائے نہیں قائم کرلینی چاہئے - لیکن اس میں شک نہیں کہ اس وقت بھی یہ اردو رسالوں میں نہایت ممتاز اور قابل قدر ہے —

منجملہ دیگر مضامین کے پہلا مضمون " اردو املا " جو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کا لکھا ہوا ہے قابل غور بلکہ واجب العمل ہے - ڈاکٹر صاحب نے نہایت صاف اور سلیس زبان میں اردو املا کی اصلاح کے متعلق جو مشورے دیے ہیں وہ نہایت معقول اور قابل قبول ہیں - اور اس میں اسی قسم کی بعض اور ضروری باتیں بھی اضافہ کی جاسکتی ہیں - عربی جموع مثلاً امرا ، علما وغیرہ کے آخر میں نیز ایسے عربی مصادر جیسے ابتدا ، اقتضا وغیرہ کے آخر میں ہمزہ لکھنا بے ضرورت ہے —

اس کے علاوہ دوسرے مضامین یہ ہیں - پروفیسر محمد حبیب صاحب نے

,, قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تعلقات " پر اچھا مضمون لکھا ہے اگرچہ سرسری ہے سید مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا مضمون اردو زبان کے لغت " بہت اچھا ہے اس میں بہت سی ایسی کتابیں شریک کرلی گئی ہیں جو اردو لغت کہلانے کی مستحق نہیں ، البتہ مضمون کی تمہید کا کام دے سکتی ہیں یہ دعویٰ بھی درست نہیں کہ اس فہرست میں بعض ایسی کتابیں ہیں جن کا دیکھنا کیسا ، اب تک ان کا نام بھی نہ سنا گیا تھا۔ اب تک جتنی کتابوں کا ذکر انھوں نے کیا ہے وہ سب میرے پاس موجود ہیں یہ مضمون ناتمام ہے آئندہ نمبر میں پورا ہوگا - مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے ,, تذکرہ خسرو کے تمہیدی صفحات " اس رسالے کو عنایت فرمائے ہیں خواجہ غلام السیدین صاحب صدر شعبۂ تعلیم مسلم یونیورسٹی نے ,, قومی سیرت کی تکمیل ' پر خطیبانہ انداز میں اچھا مضمون لکھا ہے - آخر میں اداریہ اور تبصرے کے چند ورق ہیں ۔

چندن

ایڈیٹر سدرشن صاحب - ریلوے روڈ لاہور -

قیمت سالانہ پانچ روپے

یہ ماہانہ رسالہ پنجاب کے مشہور فسانہ نویس سدرشن صاحب کی ادارت میں شایع ہوا ہے - طباعت ' ترتیب وغیرہ سب بہت خوب ہے - بعض لکھنے والے بھی بہت اچھے ملے ہیں - منشی پریم چند اور پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کے بھی دو فسانے پہلے نمبر میں موجود ہیں سوائے ایک مضمون کے باقی سب مضامین یا تو دلچسپ ادبی ہیں یا نظمیں ہیں - آخر میں باغ و بہار کے عنوان سے چند صفحے ہیں جن میں دوسرے رسالوں سے اچھے اچھے اقتباس کئے ہیں - دل بہلانے اور ذوق ادب حاصل کرنے کے لئے بہترین رسالہ ہے ۔

سارنگ

ماہانہ - اڈیٹر ایس - ایل پرماشر ایم - اے

۳۱ لاج روڈ - لاہور ' چندہ چھ روپے سالانہ

لاہور سے یوں تو آے دن طرح طرح کے رسالے نکلتے رہتے ہیں لیکن یہ رسالہ

لاهور سے یوں تو آۓ دن طرح طرح کے رسالے نکلتے رهتے هیں لیکن یه رساله سب سے نرالا هے - پنجاب میں ایک جماعت ایسی بھی هے جو پنجابی زبان کی بہت بڑی حامی هے اور اس کی اشاعت اور ترقی کو حب وطن کا جز سمجھتی هے - یه رساله اسی خیال کا نتیجه هے - هندوستان اختلافات کا گهر هو گیا هے اور ان میں سب سے بڑا اختلاف زبان کا هے - ملک کے سچے بہی خواه اس بات کی کوشش کر رهے هیں که ملک کی کوئی ایک عام اور مشترک زبان هوجاۓ، ادهر هر صوبے والے اپنی اپنی زبان کی فکر میں هیں - پنجاب کی سرکاری زبان اب تک اردو هے اور حقیقت یه هے که اهل پنجاب نے اردو کی بڑی خدمت کی هے- اور اب اس کا قدم وهاں ایسا جم گیا هے که اس کا اکهاڑنا مشکل هے، تاهم جو لوگ اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کے لئے کوشش کررهے هیں انهیں الزام نهیں دے سکتے - وه شوق سے یه کوشش کریں لیکن اردو کے رسالے کا بھی خیال نه فرمائیں یه لاحاصل هی هوگا بلکه اس سے ایسا نقصان پهنچے گا جس کی تلافی ممکن نهیں- اردو کی بدولت ملک کے ایک بہت بڑے حصے سے جو ادبی اور علمی اتحاد پنجاب کو حاصل هے وه معمولی نهیں —

یه رساله بہت خوشنما هے اور بڑی خوبی سے مرتب کیا جاتا هے شروع سے آخر تک تمام مضامین اور نظمیں پنجابی زبان میں هیں - زبان صاف هے - مضامین دلچسپ هیں- تصویروں سے بھی رسالے کی رونق بڑھ گئی هے - جو اهل پنجاب اپنی زبان کا شوق رکھتے هیں اُن کے لئے یه ایک هی رساله هے —

رفیق

[مرتبه آغا رفیق بلند شهری - فراش خانه بلند شهر
قیمت سالانه ایک روپیه چار آنے]

یه چھوٹی سی تقطیع کا ماهانه رساله بہت هی دلچسپ هے - هرقسم کے مضمون موجود هیں- جهاں غزلیں اور ادبی مضامین هیں، وهاں اسی کے ساتھ، صنعتی تجربات، طبی مجربات، لطائف، معمے اور انتخابات هیں - کل صفحے ۶۴ هیں اور

اس کے علاوہ ۳۲ صفحے پر کتابوں کے اشتہارات ھیں۔ اس قدر کم قیمت میں یہ رسالہ بہت ھی غنیمت ھے —

میخانہ

[مدیر اسد انصاری - پارچہ والی گلی لکھنؤ -
سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے]

یہ ماہانہ رسالہ بھی چھوٹی تقطیع پر ھے اور فی الحقیقت میخانہ ھے - ۱۲ مضامین میں سے دس نظمیں اور ایک افسانہ ھے باقی مضامین جو نثر میں ھیں وہ بھی ایک قسم کی نظمیں ھی ھیں - شعر و شاعری اور خیالی مضامین کے دلدادہ اصحاب کے وقت گزاری کے لئے خوب ھے —

مسلم یونیورسٹی اسکول میگزین

(مدیر سید محمد - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اسکولوں کے رسالے بڑے کام کی چیز ہوتے ھیں - ان سے طلبہ میں ادب کا ذوق اور لکھنے کا شوق پیدا ھوتا ھے - لکھنا بڑا کٹھن کام ھے اور جب تک اس کی مسلسل مشق نہ کی جاے اور صبر اور غور سے کام نہ لیا جاے لکھنا کبھی آتا ھی نہیں - یہ رسالہ ایسا خوشنما چھپا اور اس خوبی سے مرتب کیا گیا ھے کہ بے اختیار پڑھنے کو جی چاھتا ھے - اسکولوں سے اب تک جتنے رسالے نکلے ھیں ان میں اس کا نمبر سب سے بڑھا ھوا ھے - تقریباً تمام مضامین طلبہ کے لئے لکھے ہوے ھیں - ادبی ھلکے مضامین کے علاوہ علمی اور سائنٹفک مضامین بھی ہوتے ھیں اور بعض مضامین کی تشریح کے لئے جو تصویریں اور نقشے دیے ھیں وہ بہت صاف اور اچھے ھیں - مسلم یونیورسٹی اسکول کے طلبہ کی یہ کوشش بہت

قابل مبارک باد ہے - ہمارا مشورہ یہ ہے کہ باہر سے مضامین حاصل کرنے کے بجائے وہ خود ہي لکھا کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اسکولوں کے رسالوں کا یہی شعار ہونا چاہئے —

حریم

(مالک نسیم انہونوی - اڈیٹر آنسۂ جمال - لکھنؤ چندہ سالانہ چار روپے)

یہ ماہانہ رسالہ اوسط تقطیع پر اسی سال سے نکلنا شروع ہوا ہے ۔ یہ رسالہ خاص طور پر عورتوں کے لئے شایع کیا گیا ہے جس میں اصلاح معاشرت اور امور خانہ داری کے مضامین کے علاوہ "عورت" پر بھی کئی مضمون لکھے گئے ہیں - معلومات میں اضافہ کرنے کي بھي کوشش کي گئي ہے - تصویریں بھي دي گئي ہیں - اور بہت سی کام کي باتیں ہیں - اس کے مقاصد میں ایک یہ بات بھی رکھي گئي ہے کہ بچوں کے لئے اس میں ایک الگ حصہ ہوگا جس میں مفید اور سہل زبان کے مضامین اور افسانے شایع ہوا کریں گے - حجم ۸۵ صفحے ہے - پڑھی لکھي خاتونوں کے لئے یہ نہایت اچھا اضافہ ہے —

اسلامی دنیا

(رئیس تحریر محمود احمد عرفاني - شارع محمد علي نمبر ۱۴۱، قاہرہ - مصر قیمت سالانہ پندرہ روپے)

یہ ہفتہ وار اخبار اردو زبان میں قاہرہ (مصر) سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - محمود احمد صاحب عرفانی کي ہمت پر آفریں ہے کہ انہوں نے باوجود

گونا گوں مشکلات کے باوجود نہایت پابندی اور خوبی سے برابر نکل رہے ہیں۔ جو لوگ اردو زبان کی ترقی اور اس کی بہبودی کے خواہاں ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی امداد کریں۔ اس کے مضامین اور مقاصد کا اندازہ خود اس کے نام سے ہوتا ہے اس لئے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اہل ہند اور خصوصاً مسلمان جن کے سہارے پر عرفانی صاحب نے اس مشکل کام کو اپنے سر لیا ہے، ضرور ان کی قدر کریں گے اور اشاعت میں مدد دیں گے —

اردو رسالوں کے خاص نمبر

چاند

چاند کا خاص نمبر اپنی جدت اور ندرت کے لحاظ سے خاص طور پر قابل قدر ہے۔ لائق اڈیٹر نے اردو رسالوں اور اخباروں کے ۱۷۵ اڈیٹروں سے مضامین اور نظمیں حاصل کی ہیں۔ بلکہ بعض بنگالی اور انگریزی اخبارات کے اڈیٹروں کو بھی نہیں چھوڑا۔ اور تو اور ان کی پرواز مصر تک پہنچی ہے اور قاہرہ کے رسالۂ امہات المستقبل کی اڈیٹر سے بھی مضمون لکھوا لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض مرحوم رسالوں کے اڈیٹروں اور زندہ رسالوں کے سابق اڈیٹروں کو بھی کھڑ کھڑایا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ۱۳۵ اڈیٹروں کے فوٹو بھی دئے ہیں۔ اس کے لئے انہیں کس قدر کد و کاوش اور محنت اور مراسلت کرنی پڑی ہوگی ہم چاند کے قابل اور جفا کش اڈیٹر کو دل سے داد دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے ۱۶ کارٹون اور چار سہ رنگی تصویریں بھی ہیں۔ کل مضامین وغیرہ پانسو صفحوں میں آئے ہیں۔ اکثر مضامین معمولی اور اوسط درجے کے ہیں اور محض اڈیٹر صاحب کے اصرار اور مروت سے لکھے ہیں۔ بہر حال اس سے ہمارے رسالوں کے اڈیٹروں کی ذہنیت

اور دماغی قابلیت کا خوب اندازہ ہو سکتا ہے اور کوئی لکھنے والا ہو تو اس مبحث پر بڑا پر لطف مضمون لکھہ سکتا ہے - تصویروں سے بھی صحیح ذوق نہیں پایا جاتا - رنگوں کی شوخی کسی قدر ناگوار معلوم ہوتی ہے - با وجود اس کے یہ بڑا کارنامہ ہے اور یاد گار چیز ہے —

رهنماے تعلیم (لاهور)

اس کا جوبلی نمبر ایک ضخیم کتاب ہے- کل صفحات ۷۳۴ اور مضامین کی تعداد ۱۹۹ ہے- اس رسالے کی حیرت ناک ضخامت اور مضامین کی کثرت کا اندازہ ہوسکتا ہے- اگرچہ اکثر مضامین تعلیمی ہیں لیکن رسالہ ادب و اخلاق کی چاشنی سے بھی خالی نہیں - تقریباً تمام تعلیمی مسائل پر بحث آگئی ہے اور اُن لوگوں کے لئے خاص کر بہت کارآمد ہے جنھیں تعلیمی امور سے دلچسپی ہے - اس کے علاوہ سائنس، حفظان صحت، صنعت و حرفت پر بھی کئی مضمون ہیں - آخر میں " گلدستۂ اطفال " کے عنوان سے ایک الگ حصہ ہے جس میں بچوں کے لئے سادہ زبان میں دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں ہیں - خوش قسمتی سے لکھنے والے بھی رسالے کو اچھے مل گئے ہیں - ان تمام خوبیوں کے علاوہ ۹۷ تصویریں بھی ہیں جن میں کئی سہ رنگی، اور دو رنگی ہیں - زیادہ تر مضمون نگاروں کے فوٹو ہیں - غرض اس رسالے کا یہ نمبر بھی عجائبات میں سے ہے اور قابل اڈیٹر ہر لحاظ سے قابل مبارک باد ہیں —

همایوں

همایوں نے بھی اپنا سالگرہ نمبر خاص اهتمام سے شایع کیا ہے - ضخامت معمولی نمبروں سے کہیں زیادہ ہے - سر ورق بھی خلاف معمول ایک پاکیزہ عمارتی

نقشے سے مزین ہے - ہمایوں نے اب دسویں سال میں قدم رکھا ہے اور جو روش اس نے شروع سے اختیار کی تھی اس پر قائم ہے اور علمی معلومات کے ساتھ دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتا رہتا ہے یہ اردو کے قابل قدر رسالوں میں سے ہے —

سر گزشت (علی گڈھ)

سرگذشت نے خاص اهتمام سے نظام نمبر شایع کیا ہے یہ اخبار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے قدیم طلبہ کی دلچسپی اور معلومات کے لئے نکالا گیا ہے - چونکہ اعلی حضرت حضور نظام یونیورسٹی کے بہت بڑے سر پرست ہیں اور حال میں شاہانہ عطیے اور مستقل اضافۂ امداد سے یونیورسٹی کو سرفراز فرمایا ہے اس لئے اس اخبار نے اس کی یادگار میں خاص نمبر شایع کیا ہے - سر ورق کے اندر ممالک محروسہ سرکار عالی کا نقشہ ہے اور اس کے بعد اعلی حضرت حضور نظام کی شبیہ ہے - پہلا مضمون ریاست حیدر آباد کی ابتدائی تاریخ پر ہے اس کے ضمن میں خاندان آصفیہ کے تمام فرمانرواؤں کے بہت اچھے فوٹو بھی آگئے ہیں - پھر حضور پرنور کے حالات اور اُن کے زمانے کی ترقیاں اور اصلاحات، محکمۂ تعلیم کا مفصل حال، مختصر حالات برار، ملک دکن کی جغرافی کیفیت، مشہور عمارتیں، اعلی عہدہ داروں کے فوٹو وغیرہ وغیرہ اس کے ساتھ اسی نمبر میں دوسرا حصہ بھی ہے جس میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مختصر تاریخ و مقاصد درج ہیں اور اب تک کانفرنس کے اجلاسوں کے جتنے پریزیڈنٹ ہوے ہیں اُن سب کے فوٹو دئے گئے ہیں —

(الف)

اعلان

اُردو زبان میں ایک کتاب " اسلام کی نظریات سیاسیہ " کے علوان سے لکھوانی منظور ہے۔ جس کا حجم تقریباً ایک ہزار صفحات کا ہوگا۔

کتاب کے اجزا حسب ذیل ہونگے۔

۱ - عہد نبوت و خلافت راشدہ۔

۲ - بنی امیہ مشترقی۔

۳ - بنی عباس۔

۴ - اندلس کا عہد اسلامی۔

۵ - بنی فاطمہ۔

۶ - ہندوستان کا عہد اسلامی۔

۷ - دولت ترکیہ۔

۸ - سلطنت صفویہ۔

ان اجزا میں سے ہر جزو مفصلۂ ذیل بیانات پر مشتمل ہوگا۔

الف - عہد متعلق کی سیاسی کیفیت کا مختصر خاکہ۔

ب - عہد متعلق کی عام سیاسی ذہنیت پر مختصر تبصرہ۔

ج - اس عہد کے اور حکما و فلاسفہ کا ذکر جنہوں نے اصول حکمرانی کا تجزیہ کیا ہے یا اسکی بابت اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اُن کی تحریروں کی توضیح و تنقید۔

(واضح ہوکہ ہرجزو کا یہی حصہ اہم ترین ہوگا اور اصل مقصد تالیف کتاب کا یہی سمجھنا چاہئے)

امور متزکرہ صدر کو پیش نظر رکھہ کر کسی ایک مفکر کے حالات نمونتاً پیش کئے جائیں اور یہ نمونہ یکم اپریل سنہ ۱۹۳۱ء تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں وصول ہوجانا چاہئے۔ ارباب جامعہ کو اختیار ہوگا کہ اس کتاب کا کوئی حصہ یا حصے یا کل کتاب محض اپنی صوابدید پر کسی امیدوار کے سپرد کردیں۔

جس کسی صاحب کو اس اشتہار کے سمجھنے میں کوئی بات مزید دریافت کرنی ہو وہ ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے خط وکتابت کرکے دریافت کرسکتے ہیں—

اُجرت تالیف فی مطبوعہ صفحہ دس روپیہ سکہ عثمانیہ تک ہوئی —

ناظم دارالترجمہ
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نظریۂ اضافیت

پیش کیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں وہ اسلامی تعلیم کے اس خاکے پر نظر ڈالیں ان کو اس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہدایت ملیگی - مرتب نے ناظرین کو فلسفہ و منطق سے قائل کرنا نہیں چاہا بلکہ صرف اسلامی تعلیم کو دکھا دیا ہے اور یہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود حقایق اور صداقتیں معلوم کرے اور یہ اطمینان کرلے کہ اسلام انسان کی پوری رہبری کرتا ہے یا نہیں—

رسالہ چونکہ مختصر ہے اس لئے کہیں کہیں مضمون تشنہ رہ گیا ہے، موضوع پر نظر کرتے ہوے رسالے کی زبان صاف ستھری ہے اور طرز بیان سلجھا ہوا ہے—

[چ]

حالات انبیا

[مولفہ جناب احمدالدین صاحب بدایونی، صفحات ۷۲، چھوٹی تقطیع، اوسط درجے کی لکھائی چھپائی - قیمت چار آنے - ملنے کا پتہ:- نظامی پریس بدایون]

مولف نے یہ رسالہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مرتب کیا ہے اس میں ۲۹ انبیا علیہم السلام کے مختصر حالات جمع کئے ہیں جو کہ مستند اور مشہور کتابوں سے ضروری اور مختصر واقعات اخذ کئے ہیں - اس رسالے سے کم وقت میں طلبہ کو انبیا علیہم السلام کے ضروری اور مختصر سوانح سے واقفیت ہوسکتی ہے ہرنبی کے سوانح کے آخر میں سوالات بھی دے گئے ہیں، آخر میں مشکل الفاظ کے معنی بھی درج ہیں، بچوں کے لئے یہ رسالہ مفید ہے—

عبادت اور اس کی غایت

یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ - مولفہ میرزا ابوالفضل صاحب - ٹائپ میں بہت اچھی چھپی ہے - کتابستان، بہلی روڈ الہ آباد سے آٹھ آنے میں مل سکتی ہے—

فوٹو گرافی

(مولفہ خواجہ محمد شجاع صاحب ملعمی، بی - ایس سی، آنرز، ایم - ایس سی، پروفیسر سائنس صادق ایجرٹن کالج بہاول پور صفحات ۲۰۰ - قیمت تین روپے آٹھ آنے)

اس فن پر اب تک کئی کتابیں ہماری نظر سے اردو زبان میں گذر چکی ہیں، مگر وہ سب کی سب ایسی ہیں جیسی کہ عموماً اردو میں فنی کتابیں ہوا کرتی ہیں۔ یعنی نہ ان میں علمیت یا سائنس کا کوئی لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ لکھنے والے اکثر اس فن سے خود کوئی راست تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ ایسی کتابوں کو پیسے کمانے کا ایک آلہ بنا لیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے قابل مصنف نے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے ایک نایاب کام کر کے زبان اردو پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر صاحب نے شکلیں وغیرہ خود بنانے اور ان کو لیتھو اور ٹائپ پریس میں چھاپنے کی جو محنت اٹھائی ہے وہ مزید برآں ہے۔ لیتھو کی مشکلات پر مصنف نے اپنے دیباچے میں خوب ماتم کیا ہے۔

خواہ کوئی بھی فن ہو اس کو الفاظ یا تحریر کے ذریعہ کسی کے ذہن نشین کرنا ایک بہت ہی دشوار کام ہے اور فن بھی وہ جو میکانی (Mechanical) ہو۔ اسواسطے کہ بعض وقت آلات میں ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ہوتی ہیں کہ ان کے متعلق ایک ماہر فن کو لکھتے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ چیز ایسی ہوسکتی ہے جو پڑھنے والے کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ اور لکھنے والا ہمیشہ اپنی واقفیت کی بنا پر یہ خیال کر لیتا ہے کہ یہ معمولی چیز ہے اس کا سمجھانا کوئی ضروری نہیں حالانکہ ایک مبتدی کے لئے وہ معمولی چیز بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہم پروفیسر صاحب کی محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے حتی المقدور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی بیان کرنے میں کوتاہ قلمی سے کام نہیں لیا ہے۔

خود مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ اس کام میں سب سے زیادہ مصیبت ان خاص خاص فنی الفاظ کا ترجمہ تھا جو اب تک نہ تو حیدرآباد میں

ہوا ہے اور نہ کہیں اور اس لئے وضع اصطلاحات خود ایک بڑے کام کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ یقینی چیز ہے کہ ترجمہ وہی شخص خوب کرسکتا ہے جو اس فن کا ماہر بھی ہو۔ کتاب کے شروع میں ایک لغاتچہ (فرہنگ الفاظ) شامل کردیا گیا ہے تاکہ پڑھنے سے اول یہ معلوم ہوجاے کہ مصنف نے کونسا لفظ کس چیز کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد بھی مصنف نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ متن میں جہاں کہیں ترجمہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے سامنے انگریزی کا اصل لفظ بھی لکھدیا ہے اس میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ بار بار لغاتچہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی —

اردوزبان میں کسی ایسی ہی فن پر لکھی ہوئی کتاب آپ اٹھاکر دیکھئے۔ اس میں آپ کو فقط نسخے، چند ترکیبیں اور معمولی عملوں وغیرہ کے مجمل بیان سے زیادہ اور کچھ نہ ملے گا۔ برخلاف اس کے مصنف نے اس کتاب کو حقیقی معنوں میں ایک سائنس کی کامیاب کتاب بنادیا ہے۔ مثلاً لینس (Lense) کے متعلق جہاں ذکر آیا ہے وہاں اُبھرے اور دبھرے لینسوں میں فرق، ان کے حسن و قبح ہر ایک کا تصویر پر مختلف حالتوں میں مختلف اثر، ان کے کام کرنے کی رفتار یا تیزی (Speed) ایکرومیٹک ملسکس (Achromatic Maniscus) اور اس تگ میٹک (Anastigmatic) لینسوں کی وضاحت اور ان تمام مختلف قسموں کے لینسوں کے مختلف کاموں کو بڑی خوبی اور آسان پیرایے میں بیان کیا ہے ان کو مثالوں اور شکلوں سے سمجھایا ہے۔ دیا فرغمہ (Diaphragm) کیمرے میں ایک نہایت ضروری مگر مشکل ترین چیز ہے۔ اس کا عریانی (Exposure) سے سے بہت قریبی تعلق ہے۔ مبتدی کو اس پر حاوی ہونے کے لئے ایک کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو بھی مصنف نے نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ عریانی کن کن حالتوں میں کہاں کہاں، کتنی کتنی، کیوں اور کس طرح دینی چاہئے۔ مبتدی کو کونسا اور کس قسم کا کیمرہ خریدنا اور لیتے وقت ان میں کن کن چیزوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ اسی طرح مختلف حالات میں تصویر لینا، شبیہہ (Portrait) اظہار (Development) جمانا (Fixing)، دھونا، سکھانا، منفیوں (Negatives) کے نقائص اور ان کا علاج، چھپائی اُن کے اور نقائص، رنگائی (Toning) تکبیر (Enlargent) وغیرہ کے حال نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ہر بیان میں پروفیسر صاحب نے اپنے رنگ یا یوں کہئے کہ سائنس کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ ادویات کے سیکڑوں نسخے ہیں۔ ان کے علاوہ جس اہم چیز کو سمجھانے کی مصنف نے اس کتاب میں کوشش کی ہے وہ سورج کی روشنی کے اثرات ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا

ہے کہ روشنی کے مختلف رنگوں کا پلیٹ اور آنکھ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اردو زبان میں ایسے سخت مضمون کو اس قدر آسانی سے بیان کردینا واقعی کوئی معمولی کام نہیں ہے' یہ پروفیسر صاحب کا ہی حصہ ہے —

علاوہ بیسیوں اشکال کے تقریباً پچیس تیس ایسی عکسی تصاویر بھی دی ہیں جو فن کے لحاظ سے ضروری ہیں - مگر ہم کو افسوس ہے کہ چلد کے سوا باقی تمام بلاک نہ اچھے بنے اور نہ اچھے چھپے - اور اس طرح مصنف کا منشا پورا نہ ہوسکا لیکن یہ مصنف کی غلطی نہیں ہے - ہم خود جانتے ہیں کہ ہمارے پریسوں میں کیسا کام ہوتا ہے اس لئے مصنف پر اس کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اسی طرح کتابت میں بھی غلطیاں ہیں جو ہمارے لیتھو پریس کی خصوصیت ہے۔ اردو کی وہ کتاب ہی نہیں جو غلطیوں سے پاک ہو۔ البتہ اکثر جگہ "نے" کا بے جا استعمال بری طرح کھٹکتا ہے' مگر کیا کیا جائے یہ لفظ پنجاب والوں کی اردو کا ایک جز لاینفک ہوگیا ہے —

کتاب کے آخر میں مضمون نما (Index) اور اوزان و پیمانے وغیرہ دے کر اس کتاب کو اور بھی مکمل کردیا گیا ہے - کیونکہ ایسے کاموں میں ان کی ہر وقت اور ہر لحظہ ضرورت پڑتی ہے - چھپائی' لکھائی بہت صاف اور عمدہ ہے —

رنج و راحت

از جناب چودھری سردار خاں صاحب پسروری صفحات ۹۸'
بڑی تقطیع' قیمت ایک روپیہ' ملنے کا پتہ :-
سردار خاں صاحب رجنٹال انسٹی ٹیوٹ'
گھور پڑی بھر یکس پونہ -

اس مختصر کتاب میں انسانی زندگی کے متعلق مختلف چیزوں سے بحث کی گئی ہے - اس میں حسب ذیل مضامین ہیں : مقصد حیات انسانی' موت جبر و قدر اور تقدیر' حصول دولت' صرف دولت' تعلیم و تربیت' صحت جسمانی' رسوم وقیود' شادی خویش و اقارب محبت حرص و قناعت' امید' بیم و یاس' مذہب اور علمی مباحث' پیری —

زینت آسمان

ہمیں رات کو آسمان میں بے شمار ستارے نظر آتے ہیں - ان ستاروں کی شناخت کے لئے انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں موجود ہیں - لیکن اُردو میں کوئی کتاب نہ تھی - جس کی مدد سے ستاروں کو پہچانا جاسکے - زینت آسمان کے چھپنے سے یہ کمی پوری ہوگئی ہے - اِس کتاب میں ستاروں کے بارہ نقشے ہیں - یعنی ہر ایک ماہ میں شام کے وقت نظر آنے والے ستاروں کا الگ نقشہ ہے - اور ستاروں کے انگریزی اور عربی نام دے کر اُن پر مختصر نوٹ لکھے گئے ہیں - جن کی مدد سے مبتدی ستاروں کو پہچان اور جان سکتا ہے - قیمت ایک روپیہ چار آنے -

نفسیات شباب

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے - پی ایچ ڈی

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت ہونگی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب نومبر سنہ ۳۰ ء کے آخری ہفتہ میں شائع ہوئی اور روز اشاعت سے تین دن کے اندر چار سو فروخت ہوگئی - یہ برلن یونیورسٹی کے پروفیسر اور فلسفہ تعلیم و تمدن کے بے مثل ماہر پروفیسر ایڈورڈ اشپرانگر کی تازہ تصنیف Psychologie des jugendallas کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ ہے - ڈاکٹر صاحب جرمن اور اردو دونوں زبانوں میں اس قدر دست گاہ رکھتے ہیں کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مقامات بھی ترجمہ میں اصل سے زیادہ صاف ہوجاتے ہیں -

نفسیات شباب میں نوجوانوں کی نفسی زندگی کا خاکہ ہے - کائنات کے گورکھ دھندے کا سرا انسان ہی کی ذات ہے یہیں سے اس پیچ در پیچ راستہ کا پتہ چلتا ہے جو فلسفیانہ تحقیق کی خلش رکھنے والوں کو منزل مقصود تک لے جاتا ہے - انسان کی عمر کا سب سے اہم زمانہ نوجوانی کا زمانہ ہے - اس عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے مزاج کو سمجھنا والدین اور معلمین کا سب سے

اہم فرض ہے اس لئے کہ اس طوفان اور تلاطم سے جو نوجوانوں کے نفس میں برپا ہوتا ہے اگر نا واقفیت رہی تو یہ کبھی صحیح سلامت ساحل تک نہیں پہنچ سکتے —

نوجوانوں کی مجموعی نفسی سیرت، اُن کی تخیلی زندگی، اُن کے عشق، ان کے تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر "نفسیات شباب" سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ پھر زبان اتنی صاف اور عام طرز تحریر اس قدر دلکش ہے کہ شروع کرنے کے بعد اس کے مطالب میں بالکل محویت ہو جاتی ہے —

کتاب کی ضخامت بڑے سائز کے ۴۲۰ صفحے اور قیمت اُردو کی بلند پایہ علمی ادبی کتابوں کے مقابلہ میں نسبتاً کم یعنی صرف تین روپے —

ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابیں

تلاش حق

ترجمہ خود نوشت سوانح حیات مہاتما گاندھی مشہور و معروف کتاب جلد اول و دوم دو روپے —

تاریخ فلسفہ اسلام

اس موضوع پر یہ اردو میں پہلی کتاب ہے ایک جرمن تصنیف کا ترجمہ قیمت دو روپے —

پردۂ غفلت

ایک معاشرتی ڈراما جو ڈاکٹر صاحب نے قیام جرمنی میں لکھ کر وہیں چھپوایا تھا۔ قیمت ایک روپیہ —

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعۂ ملیہ

ایک دلچسپ اور مفید تعلیمی رسالہ ہر شخص پڑھ کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ قیمت ۴ آنے —

انقلاب افغانستان

بیسیوں مشہور اشخاص اور عمارات کی تصاویر کے ساتھ ایسی صحیح مفید ضروری اور دلچسپ کتاب افغانستان پر اُردو اور انگریزی میں اب تک شائع نہیں ہوئی - انقلاب اور امان اللہ خاں کے زوال کے سچے اور کھرے اسباب بے شمار مثالوں کے ساتھ - نادر شاہ خاں غازی کی خدمات مشکلات اور فتوحات اور ان کے خاندان کے نشیب و فراز کی داستان - بعض اہل ہند کی وفاداری اور بہادری - چوروں کی عجیب و غریب سلطنت اور اُن کے سابقہ حالات افغانی فوج کی مختلف صورتیں - معروف خاندانوں کی رقابتیں - نظمیں لطیفے اور متعدد عالمانہ مضامین مندرج ہیں جو مصنف کتاب محمد حسین خاں بی-اے (علیگ) سابق ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن کے افغانستان میں اکیس سالہ تجربے اور مشاہدے کی پہلی جلد ہے - قیمت اعلیٰ تین روپے- اوسط دو روپے علاوہ محصول ڈاک —

افغان بادشاہ سابق امان اللہ خاں کے عروج پر ضخیم کتاب - قدیم و جدید علوم و فنون ترقی و غرائب سلاطین اور ماضی وحال کے مشاہیر کے سوانح سے باوجود امان اللہ خاں کے زوال کے اس کتاب کا مطالعہ ہمیشہ مفید اور پر لطف رہیگا - اس میں ایک بادشاہ کی غیر معمولی ترقی اور جہانگیر شہرت کے اسباب بیان ہوے ہیں اور مقابلہ تاریخی واقعات کے ساتھ کیا گیا ہے جس سے یہ کتاب ایک شخص کی سیرت سے بڑھکر کئی مشہور اشخاص کی سوانح عمریوں کو ظاہر کر دیتی ہے مصنف مذکور کے چشم دید حالات پر مبنی ہے - با تصویر بھی ہے - قیمت علاوہ محصول ڈاک ڈیڑھ روپیہ —

اردو قاعدہ یورپ اور امریکہ کے صوتی اور طبعی قواعد کا جامع - ہندسی اور عربی و فارسی طریقوں پر حاوی - چند مہینوں میں صحیح پڑھنے لکھنے کے قاعدے معلوم ہوکر آئندہ وہ بیشمار غلطیاں نہیں ہوتیں جو تعلیم یافتہ لوگ بھی ہمیشہ کرتے رہتے ہیں - اب تک یہ قاعدے مطلق دریافت اور منضبط نہیں ہوے تھے - مصنف نے اپنی ڈائرکٹر جنرلی کے زمانے میں افغانستان کے ایک لاکھ سے زیادہ بچوں اوران پڑھ پاہیوں پر اس کا پورا تجربہ کیا ہے قیمت علاوہ محصول ڈاک قاعدہ متعلم ۵ آنے - قواعد معلم ۸ آنے -

---

المشتہر

دفتر پیام اسلام — جالندھر شہر

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

تصانیف مولانا الطاف حسین "حالی" مرحوم

(مکتوبات حالی)

مولانا مرحوم کے خطوط جو انھوں نے اپنے اعزہ و احباب کو لکھے ہیں۔ علاوہ دلچسپ، سبق آموز اور انشا پردازی کا نمونہ ہونے کے یہ خطوط مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی لائف اور کیرکٹر پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ قیمت جلد اول ایک روپیہ جلد دوم تین روپیہ —

(حیات جاوید)

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں کی نہایت مفصل اور ضخیم سوانح عمری اور اُن کے تمام عظیم الشان کارناموں اور کل تصنیفات کا تفصیلی تذکرہ قیمت چار روپیہ —

(حیات سعدی)

حضرت سعدی شیرازی کی مفصل سوانح عمری اور اُن کی شاعری پر زبردست اور فاضلانہ تبصرہ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے —

(یادگار غالب)

مرزا اسد اللہ خاں "غالب" کی بہترین اور مفصل سوانح عمری اور ان کی تمام اُردو و فارسی نظم و نثر پر مبسوط ریویو قیمت تین روپیہ —

(مولود شریف)

اس کتاب کا مکمل و مجلد مسودہ مولانا مرحوم کا دستخطی صاف کیا ہوا حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ آنحضرت صلعم کی جو عظمت و محبت

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

مولانا مرحوم کے دل میں تھی اس کتاب سے مترشح ہوتی ہے۔ جدید و قدیم خیالات کے لوگ اسے ضرور پسند کریں گے قیمت ایک روپیہ —

——(مجالس النساء)——

ہر دو حصے مولانا مرحوم کی اولین تصنیف جس میں لڑکوں کی تربیت کا خاکہ ہے والدین اسے سبق آموز پائیں گے۔ قیمت حصہ اول ایک روپیہ دوم ایک روپیہ —

——(مقدمہ شعر و شاعری)——

دیوان حالی کا یہ مقدمہ فن شاعری پر محققانہ اور عالمانہ تصنیف ہے۔ عام مروجہ شاعری کے عیوب اور شعرائے ماضیہ کے کلام پر مبسوط ریویو دیکھنا ہو تو ضرور اسے طلب فرمائیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

——(تعلیم اور قرآن)——

لکچر مولوی خواجہ غلام الثقلین صاحب جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چھتیسویں اجلاس میں بمقام علی گڈھ دیا گیا قیمت دو آنے —

——(ضمیمہ اُردو کلیات نظم حالی)——

مولانا حالی مرحوم کا فارسی اور عربی کلام نظم و نثر جس سے ان دو زبانوں میں آپ کی قادر الکلامی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ضمیمہ مولانا کی وفات سے چند روز پہلے شایع ہوا تھا۔ لیکن عام طور پر مشتہر نہیں ہوا قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے —

——(مجموعہ نظم حالی)——

مولانا حالی مرحوم کی ۱۸ بے نظیر نظمیں نہایت دلچسپ اور نصیحت آموز نظموں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ چار آنے —

ملنے کا پتہ ———————— مہتمم

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں —

—— (دیوان حالی) ——

طرز جدید کی شاعری کا بہترین نمونہ - قومی، مذہبی اور اخلاقی نظموں کا بیش بہا اور بے نظیر مجموعہ - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے —

—— (مسدس حالی) ——

زمانہ حال کی بہترین قومی نظم اور مسلمانوں کے عروج و زوال کا نہایت پر اثر خاکہ - قیمت بارہ آنے —

—— (مناجات بیوہ)

اس میں ہندوستان کی بیواؤں کی حالت زار کا نقشہ نہایت درد انگیز پیرایہ میں کھینچا ہے چار آنے —

—— (حقوق اولاد) ——

اس مثنوی میں اولاد کی باقاعدہ تعلیم و تربیت نہ کرنے کے ہولناک نتائج ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں - قیمت چار آنے -

—— (شکوۂ ہند) ——

مسدس حالی کے درجہ کی نہایت بے نظیر نظم. جس کے پڑھنے سے مسلمانوں کے عروج و زوال اور ان کے تمام اخلاق فاضلہ کا سارا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے - قیمت تین آنے —

—— (چپ کی داد) ——

مستورات کی عام اخلاقی خوبیوں مثلاً حیا و شرم، عفت و عصمت، صبر و تحمل، محبت و جفاکشی اور خدمت و طاعت وغیرہ کا بیان نہایت سلیس نظم میں - قیمت دو آنے —

—— ❖ ——

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

انجمن کے مطبوعات

(درسیہ عثمانیہ)

(یعنی اردو کا قاعدہ اور ابتدائی سات ریڈریں ' مرتبۂ انجمن ترقی اردو)

یہ سلسلہ انجمن ترقی اردو نے سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کی تجویز و منظوری کے مطابق ریاست حیدرآباد دکن کے مدارس کے لئے مرتب کیا ہے - اس سلسلے میں قاعدہ بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ بچے کم سے کم وقت میں نہایت سہولت کے ساتھ صحیح طور پر اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں ریڈروں کی زبان بہت صاف ستھری اور فصیح ہے - مضامین دلچسپ اور کار آمد ہیں - اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ زبان کی فصاحت اور بیان کی دلچسپی کے ساتھ بچوں کے معلومات میں بھی اضافہ ہو - اس لئے تاریخ ' جغرافیہ ' ہیئت ' زراعت ' مناظر قدرت اخلاق وغیرہ پر بہت اچھے اچھے سبق خاص خاص لوگوں سے لکھوائے گئے ہیں - نظمیں کچھ تو پرانی ہیں اور کچھ نئی لکھوائی گئی ہیں جو بہت ہی پر لطف اور سبق آموز ہیں - آخری ریڈروں میں کچھ حصہ نامور انشا پردازوں کے نظم و نثر کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے ' لیکن وہ انتخاب طلبہ کے ذوق کے مناسب اور ان مصنفین کا بہترین کلام ہے - تصویریں رنگین اور سادہ خاص طور پر تیار کرائی گئی ہیں طلبۂ مدارس کے لئے اردو میں اس سے بہتر اب تک کوئی درسی سلسلہ نہیں لکھا گیا ہے قیمت قاعدہ تین آنے - پہلی ساڑھے چار آنے - دوسری ساڑھے چھہ آنے - تیسری ساڑھے سات آنے - چوتھی ساڑھے نو آنے - پانچویں ایک روپیہ - چھٹی ایک روپیہ ایک آنہ - ساتویں ایک روپیہ دو آنے

(متریکولیشن کا نصاب اردو)

مجلس نصاب اردو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ہدایت کے مطابق جناب مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو نے مرتب کیا - قیمت دو روپیہ —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——— (تاریخ ہند) ———

ہندوستان کی یہ تاریخ مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی نے محکمۂ تعلیمات سرکار نظام کی فرمائش پر لکھی ہے اور مڈل اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے - اس وقت تک کوئی اور مختصر تاریخ ہند اس نقطۂ نظر اور ایسی خوبی سے نہیں لکھی گئی ہے - تعلیمی حلقوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے - قیمت ایک روپیہ ایک آنہ —

——— (قواعد اردو) ———

یہ کتاب جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اردو کی بیش بہا تالیف ہے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ زبان اردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر ' سہل ' جامع کتاب تصنیف نہیں ہوئی - ملک میں بےحد پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت مقبول ہوئی ہے - جامعۂ عثمانیہ کے نصاب ایف اے میں داخل ہے - اب جناب مؤلف و مرتب کی بےحد کاوش اور غور سے نظر ثانی ' ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ چھاپی گئی ہے - شروع میں اردو زبان اور اس کے ادب پر لا جواب بسیط مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے - انجمن نے اپنے پریس میں عمدہ ٹائپ میں چھپوائی ہے ' کاغذ بہت عمدہ ' جلد نہایت نفیس اور مضبوط ' مجلد دو روپیہ ۸ آنے —

(دیوان اثر)

سید محمد نام اثر تخلص ' خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے ان کا کلام فصاحت اور سلاست کا اعلی نمونہ ہے - واردات قلبی کو ایسی صفائی ' حسن و خوبی اور درد کے ساتھہ بیان کرتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے - دیوان بڑی جستجو اور تلاش سے کمال صحت کے ساتھہ طبع کیا گیا ہے - اثر کا کلام اردو ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے - اس میں نہ بعید از کار تشبیہات و استعارات ہیں نہ تخیل کی بلند پروازی ہے ' چھوٹی چھوٹی بحریں اور سادہ سادہ لفظ ہیں لیکن زبان اور بیان کے حسن نے جادو کا کام کیا ہے - زبان و ادب کے شائقین کے لئے یہ تحفہ جو اب تک نایاب تھا ایک بڑی نعمت ہے - قیمت مجلد دو روپیہ غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

المشـــــــــــــتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ ؛ کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

--- (لغت اصطلاحات علمیہ) ---

جملہ اہم علوم کی اصطلاحوں کا ترجمہ ' جس میں حسب ذیل علوم داخل ہیں

Astronomy , Botany , Economics , History , (Constitutional , Greece England , etc) Logic , Algebra , Conics , Solid Geometry , Trigonometry , Differential Equations , Statics , Metaphysics , Psychology , Physics , Political Science , Archælogy —

کئی سال کی مسلسل محنت اور مختلف ماہرین زبان کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہے - مصنفین و مترجمین کے لئے نا گزیر ہے —
حجم ۵۳۸ صفحے - قیمت مجلد چھہ روپے —

--- (بجلی کے کرشمے) ---

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خان صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے - برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے - ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے ' کہاں سے آتی ہے اور کیا کام آسکتی ہے - یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے - لڑکوں لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے —

--- (البیرونی) ---

مصنفۂ مولوی سید حسن برنی صاحب بی ' اے - اس کتاب میں علامۂ ابو ریحان بیرونی کے حالات ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصانیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھہ تبصرہ کیا گیا ہے - انجمن ترقی اردو نے اب دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافۂ مضامین کے ساتھہ نہایت عمدہ کاغذ پر چھپوایا ہے - قیمت فی جلد مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——— (مثنوی خواب و خیال) ———

حضرت میر درد دہلوی (رح) کے چھوٹے بھائی میر اثر کی یہ لا جواب مثنوی نایاب تھی ، بہت کوششوں کے بعد خوش نصیبی سے انجمن ترقی اردو کو دستیاب ہوگئی اور خاص اہتمام کے ساتھہ عمدہ ٹایپ میں اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر طبع کی گئی ہے ، جس پر انجمن کے فاضل معتمد جناب مولوی عبدالحق صاحب نے ایک زبردست ناقدانہ مقدمہ تحریر فرما کر اس مثنوی کے خصوصیات اور محاسن کو نمایاں کیا ہے - یہ مثنوی آج تک ناپید تھی ، تذکروں میں کہیں کہیں اس کا ذکر آجاتا ہے ، حضرت میر درد کے اشعار اور کلام کے علاوہ اس میں مصنف کی غزلیں بھی جا بجا ہیں ، جو قابل دید اور نہایت پاکیزہ ہیں - یہ مثنوی اردو میں ایک قابل قدر اضافہ اور قدردانان اردو کی خدمت میں انجمن کا ایک علمی ہدیہ ہے ، جلد بھی مضبوط عمدہ اور جدید طرز کی بنوائی گئی ہے - حجم دو سو صفحے سے زاید ، قیمت مجلد ڈیڑہ روپیہ -

——— (انتخاب کلام میر) ———

ملک الشعرا میر تقی میر کے نام اور کلام سے کون قدر دان اردو واقف نہیں ، یہ انہیں کے کلام کا بہترین انتخاب ہے جو جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سارے کلیات کا عطر کھینچ لیا ہے - یہ انتخاب ملک میں بہت مقبول ہوچکا ہے اور کئی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے —

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اب تیسری بار انجمن ترقی اردو پریس نے اپنے مشہور اور نفیس ٹایپ میں چھاپ کر شائع کیا ہے - کاغذ چکنا ، نہایت عمدہ - حجم دو سو صفحات سے زیادہ ، جلد نفیس اور مضبوط - شروع میں فاضل مرتب کا زبردست و دلچسپ مقدمہ ہے ، قیمت مجلد دو روپیہ آٹھہ آنے —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (بزم مشاعرہ) ——

عالی جناب مہاراجہ سرکشن پرشاد 'شاد' مدظلہ العالی صدر اعظم دولت آصفیہ دکن کی تشریف آوری اورنگ آباد کے موقع پر اور دل چسپ ہنگاموں کے علاوہ ایک نہایت پر تکلف، شاندار مشاعرہ بھی حضرت موصوف کی صدارت میں بمقام مقبرہ ہوا - اس مشاعرے کا گلدستہ نہایت خوش نما، نظر فریب دو رنگوں میں طبع کیا گیا ہے - شروع میں جناب صدر مدظلہ کی پاکیزہ تصویر اور جناب معنوی صدیقی کے قلم کا دل پذیر دیباچہ بھی قابل دید ہے - سر ورق بھی خوب صورت اور شاندار ہے - آخر میں وہ قصائد بھی شامل کردیے گئے ہیں جو اورنگ آباد کالج میں پڑھے گئے تھے - نفاست پسند ارباب ذوق کے لئے بہت تھوڑی تعداد میں یہ گلدستہ طبع ہوا ہے - قیمت آٹھ آنے —

—— (تاریخ اخلاق یورپ) ——

اس کتاب کے اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر، تحقیق و صداقت کا مرادف ہے - یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن، اصول اخلاق، مذاہب و خیالات کا مرقع ہے - مترجمۂ مولوی عبد الماجد صاحب بی - اے، جلد اول مجلد ۳ روپے، جلد دوم مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (دیباچۂ صحت) ——

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے - زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دلپذیر ہے، ملک کی بہترین تصنیف ہے - اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا - حجم ایک ہزار صفحے - قیمت مجلد چار روپے —

المشـــــــــتہر

انجمن ترقیء اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (کلیات ولی) ——

ولی دکنی کے نام سے کون اردو داں واقف نہ ہوگا - اسے اردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں اور یہی گویا ہماری شاعری کا قدیم اور ممتاز ترین علم بردار ہے - اس کا کلام اُس زمانے کی زبان اور شاعری کا بہترین اور کامل مرقع ہے —

یہ کلیات جناب ' احسن ' مارہروی نے نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے - اور انجمن ترقی اردو کے جدید ترین مطبوعات میں ہے - اب تک ولی کے جو دیوان کہیں کہیں چھپے اور ملتے ہیں اکثر غلط اور نامکمل ہیں یہ کلیات ۱۷ - ۱۸ قدیم ' قلمی ' نایاب نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح کرکے کئی سال کی لگا تار محنت وکاوش سے مرتب کیا گیا ہے —

اس قادر الکلام استاد کا کلیات تقریباً تمام اصناف سخن پر حاوی اور چار سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے - شروع میں مرتب صاحب کا ایک بسیط اور قابل قدر مقدمہ ہے ' جس میں موصوف نے صاحب دیوان کے حالات و سوانح نہایت تحقیق اور کمال محنت سے فراہم کرکے جمع کئے ہیں اور کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے —

کلیات کے آخر میں ایک بسیط فرہنگ ہے ' جس میں ان تمام قدیم ' متروک ' اجنبی ' ہندی ' دکنی الفاظ کا حل ہے جو کلام ولی میں جابجا آئے ہیں - آخر میں پورے دو سو صفحے کا ایک ضمیمۂ اختلاف نسخ ہے ' جو نہایت محنت و عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے ' اس میں تمام نسخوں سے مقابلہ کرنے پر جو جو اختلاف نظر آیا ہے ' دیوان کی ہر غزل کے نمبر کا حوالہ دے کر بتا دیا ہے - یہ ضمیمہ ارباب فن و تحقیق کے لئے خاص طور سے قدر کی چیز ہے - اور کئی ماہ کی مسلسل محنت سے تیار ہوا ہے - ان تمام خوبیوں کے علاوہ انجمن نے اپنے مشہور عمدہ ٹائپ میں مضبوط سفید چکنے کاغذ پر طبع کیا ہے ' قابل دید اور اس لائق ہے کہ ہر لائبریری اور قدر دانان اردو کے ہر کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود رہے - حجم تقریباً آٹھ سو صفحات ' قیمت مجلد ۵ روپے ' غیر مجلد ۴ روپے —

المشـــــــــــــــــــــــــتہر

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——(علم المعیشت) ——

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے - معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے - مبہم و مشکل مسائل کو پانی کردیا ہے ' اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ہے ' حجم ۸۸۵ صفحے ' قیمت مجلد ۵ روپے آٹھ آنے —

—— (تاریخ یونان) ——

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ - اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے - ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں ' اس کتاب کو حد درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپے —

——— (چمنستان شعرا) ———

ایک قدیم و نایاب اردو زبان کے شاعروں کا تذکرہ ہے ' جو انجمن ترقی اردو نے نہایت اہتمام سے شایع کیا ہے ' اور اس کی تصحیح و ترتیب میں نہایت محنت و کوشش سے کام لے کر ایک دل چسپ و محققانہ مقدمے کے ساتھ چھاپا ہے - تذکرے کے مولف دکن کے مشہور مورخ و تذکرہ نویس لاله لچھمی نرائن ' شفیق ' صاحب ' ہیں - سنہ ۱۱۷۲ ھ میں یہ تذکرہ تالیف ہوا ' اور دنیا میں اس کا صرف ایک نسخہ ہی پایا جاتا تھا - عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اردو کا مقدمہ بھی قابل دید ہے - حجم تقریباً ۷۰۰ صفحے - جلد نہایت اعلی قسم کی ' قیمت مجلد پانچ روپے آٹھ آنے سکۂ انگریزی ' غیر مجلد چار روپے بارہ آنے سکۂ انگریزی —

المشـــــــــــــــــتہر

انجمن ترقی اردو ' اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——(اسباق النحو)——

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی اے کی تالیف ہے - اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے - قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۲ آنے - حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنے —

——(مخزن نکات)——

یہ اردو شعرا کا نایاب تذکرہ ہے - مصنفۂ شیخ محمد قیام الدین ' قائم ' چاند پوری - شروع میں مولوی عبدالحق صاحب بی اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کا ایک مقدمہ ہے ' جس میں اس تذکرے پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور آخر میں قائم کے کلام کا انتخاب بھی دیدیا ہے - قیمت فی جلد مجلد ڈیڑھ روپیہ —

——(ذکر میر)——

هندوستان میں کون ایسا صاحب ذوق ہوگا جو اردو کے خدائے سخن حضرت ' میر ' کے نام اور کلام سے نا آشنا ہو ' ان کے کلام کا پاکیزہ انتخاب عرصہ ہوا کہ انجمن نے شائع کیا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا اور کئی بار چھپ چکا ہے - اب خاص اہتمام سے میر صاحب کی یہ نادرۂ روزگار سوانح عمری طبع کی گئی ہے جو خود انہیں کے پر سوز و گداز قلم کی تراوش ہے - جس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی اور اس وقت کی فضا نیز آخری دور مغلیہ کی تصویر نہایت دل کش انداز سے کھینچی ہے - اور انجمن نے اسے مخصوص و خوش نما ٹائپ میں چھاپی ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ معتمد انجمن کا مقدمہ بجائے خود قابل دید اور کتاب کی جان ہے - جلد خوب صورت ' حجم ۱۸۰ صفحے ' قیمت دو روپے —

المشــــــــــــتہر

انجمن ترقیٔ اردو ، اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(تذکرۂ شعرائے اردو)

میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں - ان کی مثنوی ' بدر منیر ' کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی اور کتاب کو نصیب ہوا ہو - یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے - یہ کتاب بالکل نایاب تھی ' بڑی کوشش سے بہم پہنچا کر طبع کی گئی ہے - میر صاحب کا نام اس تذکرے کی خوبی پر کافی شہادت ہے - شروع میں مولانا محمد حبیب‌الرحمن خاں صاحب شروانی کا ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ ہے - قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۲ آنے —

(مقدمات الطبیعات)

یہ انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے - اس میں بظاہر فطرت کی بحث ہے ' لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

(القول الاظہر)

امام مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف (فوزالاصغر) کا اردو ترجمہ ہے - یہ کتاب فلسفۂ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸ آنے ' مجلد ایک روپیہ —

(القمر)

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید اکتشافات ہوئے ہیں ' ان سب کو جمع کر دیا ہے - طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے - قیمت غیر مجلد ۱۰ آنے ' مجلد ایک روپیہ —

المشتہر

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——(فلسفۂ تعلیم)——

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے - غور و فکر کا بہترین کار نامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھہ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۲ روپے ' غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

——(جاپان اور اُس کا تعلیمی نظم و نسق)——

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظم و نسق کے مطالعے اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا - نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور و تحقیق سے مطالعہ فرمایا - کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے ' جو ہمارے اہل وطن کے لئے سبق آموز ہے - اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے - ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات بھی ہے - خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ نا گزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے دلچسپی اور تعلق رکھتے ہیں - حجم ۴۸۲ صفحے قیمت فی جلد مجلد تین روپے —

——(سر گزشت حیات (یا) آپ بیتی)——

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشوو نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے - حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقے سے بتایا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھہ سکے - اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ لازم ہے - حجم ۳۰۰ صفحے ' قیمت فی جلد مجلد ۲ روپے ۸ آنے —

المشـــــــــــتہر

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (تاریخ تمدن) ——

سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے - الف سے ی تک تمدن کے ہر مسئلے پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے - اس کے مطالعے سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے - حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے - مجلد دو روپے - حصۂ دوم مجلد دو روپے —

—— (دریاے لطافت) ——

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاءاللہ خاں کی تصنیف ہے - اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے ' اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت مجلد ۲ روپے ' غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے —

—— (طبقات الارض) ——

اس فن کی پہلی کتاب ہے - (۳۰۰) صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند کئے ہیں - کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے - قیمت غیر مجلد ۲ روپے - مجلد دو روپے ۸ آنے —

—— (مشاہیر یونان و روما) ——

ترجمہ ہے - سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم چلا آتا ہے - ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمے سے فیض حاصل کیا ہے - وطن پرستی اور بے نفسی ' عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے - قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپے - مجلد ۴ روپے جلد دوم ۲ روپے ۸ آنے —

المشـــــــــــــــــــــتہر

انجمن ترقیء اردو ' اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——— (رسالۂ نباتات) ———

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے - علمی اصطلاحات سے معرا - طلباے نباتات جس مسئلے کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالے میں مطالعہ کریں ' قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

——— (فلسفۂ جذبات) ———

کتاب کا مصنف هندوستان کا مشہور نفسی ہے - جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے - متعلمان نفسیات اسے بہت مفید پائیں گے - قیمت مجلد دو روپے آٹھہ آنے - غیر مجلد دو روپے —

——— (وضع اصطلاحات) ———

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز و عالم مولوی وحیدالدین ' سلیم ' مرحوم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے - بقول فاضل مولف " یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی زبان میں " - اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں - مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی ' مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں ' اردو مصادر اور ان کے مشتقات ' غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں - اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں - لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں - اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں - اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوے جھجکتے اور اس کی گنجائش تولی کے متعلق دعوی کرتے ہوے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے - تعداد صفحات (۲۰۵) قیمت مجلد تین روپے ۱۲ آنے —

المشتہر

انجمن ترقیء اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں)

——— (نکات الشعرا) ———

یہ اردو کا تذکرہ استاد الشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ھے - اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں - نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ھیں - مولانا محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی صدرالصدور امور مذھبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ھے - قیمت مجلد ایک روپے بارہ آنے —

——— (محاسن کلام غالب) ———

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا معرکۃ الآرا مضمون ھے - اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ھے جو اس شان کی لکھی گئی ھے - یہ مضمون رسالۂ اردو کے پہلے نمبر میں طبع ھوا تھا - صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ھے - قیمت مجلد ایک روپیہ

——— (تمدن قدیمہ) ———

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ھے - اس میں بعض قدیم اقوام، سلطنت کلدانی آشوری، بابل، بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت، عقائد اور صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیے ھیں - اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ھوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ھے - حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ھیں - صفحہ ۲۸۴ - قیمت مجلد ایک روپے بارہ آنے —

رسالہ اردو کے خریداروں کے ساتھ خاص رعایت

رسالۂ اردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اردو کی شائع کی ھوئی کتابیں فی روپیہ چار آنے کمی قیمت کے ساتھ دی جائیں گی - امید ھے کہ ناظرین اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے —

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ھوتی ھیں ان کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جاسکتی —

الـــــــمشـــــــتہر

منیجر انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ - کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

یہ بیش بہا کتابیں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

—— (دیوان غالب جدید و قدیم) ——

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بے حد انتظار تھا - اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے - مرزا صاحب کا قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی - یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے - مع مقدمۂ ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری مرحوم - مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپے ' غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے)

—— (حقیقت اسلام) ——

یہ کتاب جناب نواب سر امین جنگ بہادر کے سی آئی ای سی ایس آئی ' ایم اے ' بی ایل ' ایف آر ایس ' چیف سکریٹری گورنمنٹ نظام و صدرالمہام پیشی کی بے نظیر تصنیف نوٹس آن اسلام کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ ہے - اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کا بیان کیا ہے - فاضل مصنف نے ان تمام مشکل مسائل کی حقیقت کو جن میں اکثر تعلیم یافتہ جوانوں یا غیر مسلموں کو شبہات واقع ہوتے ہیں ' زمانۂ حال کے ترقی یافتہ خیالات کی روشنی میں نہایت دلاویز طریقہ اور حکیمانہ استدلال سے بیان کیا ہے قیمت مجلد بارہ آنے —

—— (ناٹک کتھا) ——

مولانا محمد عمر نور الہی صاحبان - قدیم ہندوستانی ڈراموں کی کہانیاں نہایت دلچسپ پیرایے میں اس چھوٹی سی کتاب میں جمع کردی گئی ہیں - قیمت فی جلد آٹھ آنے —

—— (سفیر اودھ) ——

آخری بادشاہ اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ کے سفیر مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر مرحوم کے خود نوشت حالات - مطبوعۂ الناظر پریس لکھنؤ قیمت فی جلد ایک روپیہ —

المشتهر

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——— (خطوط شبلی) ———

علامۂ شبلی مرحوم کے یہ وہ لا جواب اور نادر خطوط ہیں جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے تھے - یہ جواہر پارے اردو میں مولانا کے کمال انشا پردازی کی نایاب یادگار ہیں - طرز نگارش اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر کتاب کو چھوڑنا دشوار ہے - شروع میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقیء اردو کا ایک نہایت لطیف و سخن گسترانہ مقدمہ بھی شامل ہے جس نے ان خطوط کے جذبات اخلاص و محبت اور نکات ادبی کو بے نقاب کردیا ہے - مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مارہروی و جناب قیصر بھوپالی - قیمت ایک روپیہ —

——— (محشر خیال) ———

یہ سید سجاد انصاری مرحوم وکیل بارہ بنکی کے چند دلکش ادبی و اصلاحی مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہے جو شرکت ادبیہ دہلی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے - سجاد انصاری صاحب خوش فکر و خوش گفتار ادیب تھے ' ان کے مضامین میں خاص ندرت و ادبیت اور کلام میں خاص کیف اور بلند خیالی و جذبات نگاری ہوتی ہے - یہ مجموعہ مرحوم کی جوانمرگی کی یادگار ہے ' جس کو سید منظور حسین صاحب نے مرتب کیا ہے - لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ ' سائز مختصر ' جلد نہایت نفیس ' اوپر سنہری حروف میں کتاب کا نام بھی لکھا ہے - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے —

——— (چمن) ———

یہ نہایت چھوٹا سا حسین و جمیل مجموعہ اساتذۂ اردو کے پاکیزہ کلام کا انتخاب ہے - کوٹ سائز پر نہایت اعلیٰ طباعت وکتابت کے ساتھ عید کے موقعہ پر دوست احباب کو پیش کرنے کے لئے بہترین ادبی تحفہ ہے - قیمت ۵ آنے —

الم‍شتہر

انجمن ترقیء اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ھیں)

—— (موازنۂ انیس و دبیر) ——

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ - مولفۂ مولانا شبلی نعمانی ' قیمت فی جلد مجلد چار روپے - غیر مجلد تین روپے ——

—— (دیوان حالی) ——

شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم کے قطعات ' غزلیات ' قصیدے ' مرثیے ' ترکیب بند ' رباعیاں ' تاریخیں اور متفرق اشعار - قیمت ڈیڑھ روپیہ ——

—— (معراج العاشقین) ——

حضرت مخدوم ابوالفتح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز (رح) کی تصنیف ھے اس میں حضرت کے بعض مواعظ و ارشادات قدیم اردو یعنی دکنی اردو میں لکھے ھیں - مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیء اردو کی تصحیح و ترتیب اور مقدمے کے ساتھہ چھپی ھے - قیمت ۲ آنے ——

—— (وقائع عالمگیر) ——

حضرت اورنگ زیب سلطان ھند عالمگیر کے وقائع زندگی جو خود ان کے مکاتیب اور مستند مورخین کی روایات پر مبنی ھیں - اور جن سے ان کے حقیقی کیریکٹر ' رواداری ' عدل جوئی اور تشریع مذھبی کا کافی ثبوت ملتا ھے - مرتبۂ چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی قیمت مجلد ۲ روپے ——

—— (افغان بادشاہ) ——

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں کی عظیم الشان چشم دید داستان حیات ھے - اس لاجواب کتاب کو محمد حسین خاں بی اے (علیگ) ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن افغانستان نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ھے - شائقین سیر و تاریخ کے لئے خصوصاً اور کافۂ مسلمین کو عموماً لازم ھے کہ اس کتاب کو غور سے مطالعہ فرما کر استفادہ کریں - قیمت فی جلد دو روپے آٹھہ آنے ——

المشتہر

انجمن ترقیء اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

——— (تاریخ زوال روما) ———

یہ گبن کی مشہور تاریخ کے ابتدائی (۷) ابواب کا ترجمہ ہے - اصل کتاب اپنی خوبیوں کے اعتبار سے محتاج تعریف نہیں - قیمت فی جلد غیر مجلد سوا روپیہ —

——— (تاریخ عرب) ———

مصنفہ موسیو سدیو فرانسیسی - عربوں کے متعلق یہ کتاب ان تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ و ایشیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں - مسلمانوں کی ترقیوں اور عربوں کے کمالات کا آئینہ ہے - ساتھ ہی یورپ کے کذب وافترا کا بہترین جواب - قیمت مجلد چرمی ۷ روپے ۸ آنے —

——— (یادگار غالب) ———

یعنی مرزا اسداللہ خاں "غالب" دہلوی کے مفصل حالات زندگی اور ان کے نظم و نثر اردو فارسی پر تنقیدی ریویو اور انتخاب - مولفۂ شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب "حالی" مرحوم - قیمت مجلد ۳ روپے —

——— (شعر و شاعری) ———

شمس العلما خواجہ الطاف حسین "حالی" مرحوم کے اردو دیوان کا لا جواب مقدمہ جس میں شعر و شاعری پر نقادانہ بحث کی گئی ہے - تنقیدی حیثیت سے اردو زبان میں اب تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی ہے - قیمت مجلد ۲ روپے "غیر مجلد سوا روپیہ -

——— (وکرم اُروسی) ———

کالیداس کے مشہور ناٹک کا اردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمے کے جس میں ہندی ڈرامے کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے - مرتبۂ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی اے مرحوم - قیمت مجلد دو روپے - غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ —

——— تہر

المشتہر ———

انجمن ترقیء اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

—— (عروس ادب) ——

مولوی سید ناظرالحسن صاحب ہوش بلگرامی کے اخلاقی ادبی تاریخی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ - حجم ۲۲۴ صفحہ - سائز ۲۶ × ۲۰ کاغذ عمدہ سفید ' لکھائی چھپائی بہت خوشنما - قیمت فی جلد دو روپے —

—— (خیالات ارونگ) ——

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کے بعض دلچسپ مضامین کا بامحاورہ اردو ترجمہ از مولوی محمد یحیی صاحب تنہا وکیل غازی‌آباد ضلع میرٹھہ - قیمت ۸ آنے —

—— (سیرالمصنفین) ——

جس میں انشاپردازان اردو کے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے - مصنفۂ مولوی محمد یحیی صاحب تنہا بی اے (علیگ) قیمت دو روپے —

—— (مصنوعی بیوی) ——

مشہور ہردلعزیز مغربی ناولسٹ آر ' ایچ ' پول کے ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول " ہز میک بی لیو وائف " کا اردو ترجمہ از مولوی عباس حسین صاحب فطنی ' قیمت ۱۲ آنے —

—— (خواتین انگورہ) ——

مولفۂ ملا توحیدی صاحب - ترکی کی مشہور و معروف خواتین کے کارنامے - اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ جد و جہد میں ترکی خواتین نے کس جوش اور قابلیت سے حصہ لیا ہے - قیمت ایک روپیہ —

—— (جہاں آرا بیگم) ——

جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں کی سوانح عمری جو نہایت مستند تاریخوں سے لکھی گئی ہے - مولفۂ مولوی ضیاالدین احمد برنی صاحب بی اے - قیمت ۸ آنے —

المشتہر

انجمن ترقیء اردو - اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

تمدن ہند

مصنفۂ ڈاکٹر گستاؤ لی بان مترجمہ مولوی سید علی صاحب بلگرامی مرحوم - اس کتاب سے کون واقف نہیں! ہر جگہ اس کے شائق موجود تھے مگر کہیں نہ ملتی تھی - اب اس کی چند جلدیں انجمن ترقی اُردو میں آگئی ہیں - اور بہت کم قیمت پر بیش کی جارہی ہیں - جلد منگوا لیجئے ورنہ اس کتاب کا دوبارہ چھپنا مشکل ہے - قیمت فی جلد مجلد پندرہ روپیہ —

تلاش حق

یہ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہے - ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے ' پی ایچ ڈی نے نہایت ستھری اور سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے - یہ دنیا کی ان کتابوں میں ہے جس کا مطالعہ ہر پڑھے لکھے شخص پر لازم ہے - جلد اول ایک روپیہ جلد دوم ایک روپیہ —

(دارالمصنفین اعظم گڑھ)		روح الاجتماع	۲ روپے
تاریخ فقہ	۳ روپیہ	ابن رشد	۲ روپے
خلفاے راشدین	۳ روپے ۸ آنے	گل رعنا	۵ روپے
مہاجرین	۳ روپے	سیر الانصار حصۂ اول	۳ روپے ۸ آنے
سیرۃالنبی حصۂ اول	۳ روپے	سیرالانصار حصۂ دوم	۳ روپے ۸ آنے
سیرۃالنبی حصہ دوم	۳ روپے ۸ آنے	شعرالہند حصۂ اول	۳ روپے
سیرۃالنبی حصۂ سوم	۲ روپے	شعرالہند حصۂ دوم	۳ روپے
شعرالعجم مکمل ۵ حصے	۱۳ روپے	(جامعۂ ملیہ دہلی)	
الکلام	۲ روپے	تاریخ نجد	۱ روپیہ
اسوۂ صحابہ مکمل دو حصے	۸ روپے	عربوں کا تمدن	۲ روپے ۸ آنے
انقلاب الامم	۲ روپے	تاریخ فلسفۂ اسلام	۲ روپے
مکالمات برکلے	تیرہ روپیہ	تاریخ الدولتین	۲ روپے
سیرالصحابیات	۲ روپے ۳ آنے	سیرۃالرسول	تیرہ روپیہ

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ : کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

خلافت راشدہ	۲ روپے
خلافت بنی امیہ	ڈیڑھ روپیہ
خلافت عباسیہ	دو روپے
خلافت عباسیۂ بغداد	۲ روپے
خلافت عباسیۂ مصر	۲ روپے
مبادی معاشیات	۱ روپیہ
دنیا کے بسنے والے	۴ آنے
قواعد عربی	۲ روپے
اسلامی تہذیب و قومی تعلیم	۴ آنے
لڑکوں کی کہانیاں	۴ آنے
تاریخ ہند قدیم	۱ روپیہ

(الناظر پریس - لکھنؤ)

فسانۂ جوش	۱ روپیہ
مجموعۂ قصائد مومن	۱۲ آنے
گوتم بدھ	۴ آنے
مسالک النظر فی نبوت	
سید البشر	۴ آنے
حکایۂ لیلیٰ و مجنوں	۴ آنے
مقابل فریب مغربی معمل خانے	۴ آنے
وکرم اروسی	۱ روپیہ ۸ آنے

فلسفیانہ مضامین عبدالماجد صاحب

	۱ روپیہ ۸ آنے
تاریخ عرب مجلد	۷ روپے ۸ آنے
موازنۂ انیس و دبیر	۳ روپے
مقدمۂ شعر و شاعری	۱ روپیہ ۴ آنے
اصول النسخ	۶ آنے
مسلمانان اندلس	۱ روپیہ
اسرار زنگون	۱ روپیہ
خوان دعوت	۱ روپیہ
مصلوبی شوہر	۲ آنے
الاحسان	۸ آنے
ارض بحرین	۴ آنے
حیات نظامی	۴ آنے
خطاب	۴ آنے
میلاد نبوی	۴ آنے
فریاد امت	۳ آنے

(نظامی پریس بدایوں)

قاموس المشاہیر جلد اول	۹ روپے
قاموس المشاہیر جلد دوم	۹ روپے
نکات غالب مجلد	۱ روپیہ

المشتہر

انجمن ترقیٔ اردو - اورنگ آباد (دکن)

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

دیوان غالب مشرح مجلد ۲ روپے ۸ آنے
دیوان جان صاحب مجلد ڈیڑھ روپیہ
دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنے
دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن) ڈیڑھ روپیہ
خطوط سر سید قسم اول ۳ روپے
خطوط سر سید قسم دوم ۲ روپے
لیتھو گرافی مجلد ۱ روپیہ ۸ آنے
انتخاب زرین مجلد ۲ روپے
قصائد ذوق ۲ روپے
مراثی میر انیس جلد اول مجلد ۱۰ روپے

مراثی انیس جلد دوم قسم دوم ۸ روپے

(تصانیف نور الٰہی ومحمود عمر صاحبان)
موجودہ لندن کے اسرار ۱ روپیہ ۴ آنے
ناٹک ساگر (یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ)
مجلد ۳ روپے، غیر مجلد ۲ روپے ۸ آنے
تین توپیاں ۸ آنے
ظفر کی موت ۴ آنے
قزاق ۸ آنے
بگڑے دل ۸ آنے

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے ان مہربان معاونوں کی فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو، وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے، تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کر دی جایا کرے۔ ہمیں امید ہے کہ قدر دانان زبان اردو ہمیں عام طور پر اس قسم کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں درج کر لئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہو، فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کر دی جایا کرے۔ یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ہو جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں، اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے —

ان معاونوں کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شایع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کر کے روانہ ہوں گی —

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے، ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی‌الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے۔ اس رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوا کریں گے —

سالانہ چندہ آٹھ روپے سکۂ انگریزی (نو روپیہ چار آنے سکۂ عثمانیہ)۔

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

المشتہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

یادگار مولانا شرر مرحوم

دو سالانہ انعام

زبان اُردو کے محسن مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کی یادگار میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقیء اُردو اور جناب مولوی سیدھاشمی صاحب رکن دارالترجمہ نے حسب ذیل دو سالانہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ھے —

(۱) " عطاے عبدالحق "

رسالۂ اُردو کے سال بھر کے مضامین نثر میں اول درجے کے سب سے اچھے مضمون پر ۱۲۵ روپیہ کلدار کا انعام جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے عطا فرمائیں گے —

(۲) " عطیۂ هاشمی "

کے نام سے دوسرا انعام ۱۰۰ روپیہ کلدار کا، مولوی سیدھاشمی صاحب اُن صاحب کی نذر کریں گے جن کی نظم رسالۂ اُردو کے سال بھر کی نظموں میں سب سے اچھی اور اعلی درجے کی ہوگی

ہر سال کے اخیر مہینے میں جو حضرات اهل سمجھے جائیں گے اُن کی خدمت میں رقم ارسال کر کے رسالے میں اس کا اعلان ہوتا رہے گا - انعام کی اهلیت کا فیصلہ صرف معطیان کی متفقہ راے پر منحصر ہوگا —

المعــــــــــــــــــــــــلن

مدیر رسالۂ اُردو اورنگ اباد دکن

اردو

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

اردو

جلد ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۳۱ ع حصہ ۴۲

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

روسی ادب

دوسرا باب

روسی شاعری

(۳)

از

جناب محمد مجیب صاحب، بی۔ اے۔ آنرز (آکسن)

فیوڈر اِوانووِچ چیوچف

"اس بے مثل شاعر سے، جو دنیا کے ہر ادب کے لئے باعث فخر ہوسکتا تھا، ہمارے ملک میں صرف نظم کے چند شایقین واقف ہیں، ورنہ "تعلیم یافتہ" لوگوں کے بہت بڑے حصے نے صرف اس کا نام سنا ہے یا نہیں ... دو تین نظمیں دیکھی ہیں جو اس کے کلام کا صحیح نمونہ نہیں کہی جاسکتی ہیں۔" روسی نقاد ولاجیمر سولوفیوف نے ۱۸۹۵ ء میں اپنی قوم سے یہ شکایت کی تھی، اور چیوچف کے کلام کے شایقین آج بھی یہی شکایت کرسکتے ہیں۔ اس ناقدردانی کی تلافی کسی قدر اس صورت سے ہوئی ہے کہ چیوچف کا کلام جسے پسند آیا وہ بالکل اس کا فدائی ہوگیا۔ روس کے تقریباً تمام سربرآوردہ انشا پرداز اس زمرے میں شامل تھے، اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے لئے بغیر چیوچف کے دیوان کے زندگی

بسر کرنا نا ممکن تھا۔ *

تعلیم یافتہ لوگوں میں چیوچف کا چرچا اُس کی اپنی زندگی میں اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اُس نے اپنے آپ کو بہت مدتوں سے قوم اور قومی دلچسپیوں سے الگ اور بے تعلق رکھا، اور اپنے کلام کی اشاعت سے بھی حتی الامکان پرہیز کیا۔ اُسے گمنامی سے بچانے کی جو کوششیں بعد کو کی گئیں وہ اس سبب سے نا کامیاب رہیں کہ اس کا مذاق اور اس کے کلام کا رنگ کچھ ایسا تھا کہ وہ ہر دلعزیز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چیوچف نے انسانی زندگی سے منہ موڑ کر فطرت کی طرف رخ کیا، اور اسے فطرت کی کیفیتوں میں وہ حسن نظر آیا جو عام طور سے لوگ معشوقوں کے خال و خط اور ناز و انداز میں تلاش کرتے ہیں۔ اُس نے اُن جذبات کی نیرنگیوں کو جو شاعر کا میدان سمجھی جاتی ہیں اور جن میں شاعر اپنا کمال دکھاتے ہیں یا تو ایسی فلسفیانہ پوشاک پہنا دی کہ وہ عوام کی نگاہوں میں جچ نہ سکیں، یا اپنے تصور کی شوخی سے ایسا بے حجاب کردیا کہ اُن کا حسن اہل نظر کے سوا کے کسی پر ظاہر نہ ہوسکے۔ بد مذاقوں سے ہر شاعر کو شکایت رہی ہے، چیوچف کو محض بد مذاقوں نہیں بلکہ عام لوگوں سے بھی گہری نفرت تھی، جیسا کہ اُن نظموں سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اپنی معشوقہ کے ماتم میں لکھی ہیں، ایسے شخص کے کلام سے ہر دلعزیزی کی توقع کرنا فضول ہے۔

چیوچف کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ وہ ۱۸۰۳ ع میں پیدا ہوا، اور جب وہ اُنیس سال کا ہوا تو سفارت خارجہ میں کسی معمولی

---

* تالستائی نے اپنے ایک خط میں کسی دوست سے چیوچف کا دیوان مانگا ہے اور اُسے جلد بھیجنے کی تاکید کی ہے اس لئے کہ وہ اُس دیوان کے نہ ہونے سے بہت بے چین تھا۔

عهدے پر مقرر هوکر روس کے باهر چلا گیا اور بیس سال یورپ میں بسلسلۂ ملازمت رها۔ وهاں سے واپسی پر "محکمۂ احتساب خارجه" کا ناظم بنا دیا گیا۔ ۱۸۵۴ تک اس نے روسی شاعر هورس کے کلام کے ترجمے اور کافی ساهے رسالوں میں نظمیں شایع کیں، اس سال اُسے ایک دوست نے اپنے کلام کا مجموعه شایع کرنے پر مجبور کیا، اور کچهه دنوں کے لئے عام تعلیم یافته طبقوں میں چیوچف مشہور هوگیا۔ لیکن لوگ اسے بہت جلد بهول گئے، اور اس نے اپنی یاد تازہ کرانے کی مطلق فکر نه کی۔ اس نے تمام عمر انهیں اُصولوں پر عمل کیا جو اُس کے نزدیک هر سمجهه دار آدمی کو اختیار کرنے چاهئیں، اور جو اس نے ذیل کی نظم میں بیان کئے هیں:—

عیب جوئی نه کر، سوچ بچار نه کر...
جستجو دیوانگی هے، عیب نکالنا حماقت؛
آج کے زخموں کا نیند سے علاج کر
اور کل جو هو سو هونے دے۔
زندگی میں هر حالت برداشت کر لے جا:
غم اور راحت اور پریشانیاں،
کاهے کی هوس کرنا، کاهے کا افسوس؟
دن بیت گیا – اور شکر هے خدا کا۔

چیوچف کا موضوع زیادہ تر قدرت کے مناظر هیں اور کائنات میں انسانی هستی کی تصویریں چند نظمیں۔ ایک عشق کی داستاں سناتی هیں جس کا شاعر کے دل پر بہت گہرا اثر هوا تها۔ قوم کی بسر اوقات سے اسے مطلق سروکار نه تها، لیکن جو تین چار نظمیں اس نے قوم کو اپنے دل کی بات سنانے کے لئے لکهی هیں، وہ بے مثل هیں اور اس کی نظر نے حقیقت کو اس

صفائی سے دیکھا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں اس کی نکتہ بینی کی داد دیتے ہیں۔

مناظر قدرت سے مشرقی شاعری تقریباً بیگانہ ہے، مغربی شاعری میں مناظر بہت دکھائے گئے ہیں، لیکن صرف چند شاعروں نے، جن میں گوئٹے، ورڈس ورتھ اور چیخوف سب سے زیادہ کامیاب رہے ہیں، اس کا حوصلہ کیا ہے کہ ان مناظر کی مختلف کیفیتوں کو انسانی احساسات کا پس منظر بنائیں، اور انسانی اور فطرت کی ہم آہنگی سے ایک فلسفہ اخذ کریں۔ چیخوف کی فلسفیانہ نظر ان مناظر کو بھی جو بظاہر کوئی خصوصیت نہیں رکھتے ایک معنی پہنا دیتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو اُن سے محبت ہو جاتی ہے، اسے بجلی کی چمک میں معشوق کا غصہ، بید مجنوں کی سرنگونی میں عاشق کی نیاز مندی نظر آتی ہے، وہ رات کے طوفانوں سے التجا کرتا ہے کہ فساد کا منظر دکھا کر کائنات کی بنیادیں نہ اکھاڑ دیں: اس کی آرزو ہے کہ فطرت میں فنا ہو کر ہستی کی قید سے آزاد ہوجائے، اور وہ لطف حاصل کرے جو قطرے کو دریا میں گم ہوجانے سے نصیب ہوتا ہے۔

پہلے مناظر قدرت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ چیخوف کے طرز بیان سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ اس کے تصور میں کس قدر مشرقی رنگ تھا۔

گرمی میں کمی نہیں ہوئی،
جولائی کی رات روشن تھی۔
پست اور بے حس زمین پر،
سارا آسمان، طوفان کا بوجھ سنبھالے ہوئے

بجلیوں سے لرز رہا تھا .
کسی کی آنکھہ کے بھاری پپوٹے
کبھی کبھی اٹھہ جاتے تھے '
اور تیز رو بجلیاں کیا تھیں —
کسی کے غضب ناک دیدے
زمین پر چمک جاتے تھے .

یہ منظر خفگی کا تھا . ایک اور کیفیت ملاحظہ ہو :

غم میں ڈوبے ہوے نیم برہنہ جنگل پر
ایک پر معنی غنودگی چھائی ہے .
بہار کی پتیوں میں سے جابجا ایک دو
خزاں کے سنہرے رنگ میں چمکتی ہو ئی
اب تک ٹنھی شاخوں پر لٹک رہی ہیں
میری آنکھیں ایک دلگداز ہمدردی سے بھر آتی ہیں .
جب بادلوں سے گزرتی ہوئی
سورج کی کرن ' بجلی کی طرح چمک کر '
رنگ برنگی درختوں پر بکھر جاتی ہے .
پژمردگی بھی ہم کو کیسی بھلی لگتی ہے !
وہ منظر کیسا دلفریب ہوتا ہے
جب ایک چیز جو کبھی پھلی پھولی تھی
بے بس اور بیمار ہوکر
آخری بار مسکراتی ہے .

مناظر قدرت میں شاعر کو انسانی جذبات ' انسانی نیاز اور بے نیازی

کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے:

اے بید مجنوں، تو پانی کے اوپر
اپنا سر کیوں جھکائے ہے،
اور کانپتی ہوئی پتیوں،
گویا لالچی لبوں، سے
بہتے ہوئے چشمے کو کیوں پکڑنا چاہتا ہے؟
چشمے کے دھارے پر تیری ہر پتی
چاہے غم میں گھلے، چاہے تڑپے...
چشمہ یوں ہی بہے گا، شور کرے گا،
دھوپ کا مزہ لے کر چمکے گا
اور تجھ پر ہنستا رہے گا.

پتیوں کا فلسفہ سنئے:—

چاہے شمشاد اور صنوبر
جاڑوں بھر کھڑے رہیں،
اور برف اور برف کے طوفانوں میں
اوڑھ لپیٹ کر سو جائیں،
ان کی بے رس سبزی...
چاہے کبھی پیلی نہ پڑے،
لیکن کبھی تازی بھی نہیں ہوتی.
ہم، رندان سبک سر،
جو پتیاں کہلاتے ہیں،
رنگ پر آتے ہیں، چمکتے ہیں،

اور تھوڑے دنوں تک
شاخوں کے مہمان ہوتے ہیں -
بہار کے حسن میں
ہم بھی حسین تھے۔
کرنوں سے کھیلتے
شبنم میں نہاتے تھے۔
اب چڑیاں سب کا چکیں،
پھول سرجھا چکے،
سبزہ زار زرد ہیں -
خوش گوار ہوائیں بدل گئیں -
اب ہم کیوں بیکار
لٹکے لٹکے سرجھائیں ؟
انھیں سب ساتھیوں کے پیچھے
ہم بھی کیوں نہ اُڑجائیں ؟
او تند و تیز ہواؤ
جلدی چلو، جلدی!
ہم شاخوں سے اکتا گئے،
ہم کو جلد چھڑا لے جاؤ!
جلدی کرو، ہم کو چھڑاؤ۔
ہم اور نہ ٹھیریں گے!
اڑو، اڑو،
ہم بھی تمھارے ساتھ اڑیں گے!

کائنات میں انسانی ہستی کی حقیقت بتانا پیغمبر اور شاعر کا خاص کام ہے۔ مذہب اس حقیقت کے بیان پر اپنی تعلیم منحصر کرتا ہے، شاعری کو عموماً عقیدے اور اخلاق کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا؛ لیکن سچے شاعر اپنی سبکدوشی کے باوجود انسان کو وہ تعلق جو اس کی ہستی اور کائنات میں ہے اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ ہر صاحب ادراک اپنے دل سے خوف اور وحشت دور کرسکتا ہے اور وہ روحانی تسلی حاصل کرسکتا ہے جس سے مذہب کی بے سوچ مذاق اسے اکثر محروم رکھتی ہے۔ چیوچف کے کلام میں انسانی ہستی کے یہ مسائل بہت نمایاں ہیں۔ لیکن اُس نے اپنے روحانی "تجربوں" کو تعلیم کی شکل نہیں دی ہے۔ وہ محض تجربے ہیں، اور تجربے ہر قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

شام کے وقت شاعر کی کیفیت دیکھئے:—

سرمئی رنگ کے سائے ایک دوسرے سے مل گئے،
روشنی دھیمی پڑی، غائب ہوگئی، آوازیں سو گئیں:
حرکت اور زندگی گھٹتے بڑھتے اندھیرے
اور دور کے شور وغل میں گھل مل گئی ہیں۔
ایک تتلی جو نظر نہیں آتی رات کی ہوا میں
اڑتی سنائی دیتی ہے...
یہ ان تمناؤں کا وقت ہے جو زباں پہ نہیں آتیں۔
ساری ہستی مجھ میں ہے، میں ساری ہستی میں ہوں....
خاموش اندھیرے، خواب آور اندھیرے،
میری روح میں تہ تک سما جا،
خاموش، تاریک، عطر بیز،

سارا میری روح میں سما جا۔
احساسات کو خود فراموشی کی تاریکی سے
لبا لب بھر دے...
مجھے نیستی کا مزہ چکھا دے،
زینہ کے متوالے جہاں میں فنا کردے!

رات کی آمد کا یہ تصور ہے:

آسمان پر پاک رات چھا گئی،
اور اس نے فرحت بخش اور پیارے دن کو
لپیٹ کر الگ رکھ دیا، ایک سنہری چادر کی طرح —
ایک چادر جو رات کے اتھاہ غار پر تنی ہوئی تھی۔
ظاہری دنیا، ایک دھوی تصویر کے مانند، نظر سے غائب ہوگئی ہے...
اور انسان مثل ایک یتیم بچے کے جسے سر رکھنے کو ٹھکانا نہیں
اب بے بس اور برہنہ
اس اتھاہ غار کے کنارے کھڑا ہے۔
وہ اب بالکل تنہا ہے،
اس کا دماغ ساکت ہے، خیالات کا کوئی خبر گیراں نہیں،
وہ اپنی روح میں ترہا ہے، اس کی روح بھی ایک اتھاہ دریا ہے،
اسے کوئی سہارا نہیں ملتا، اور دریا بے کراں ہے۔
اب وہ ایک پرانا خواب سمجھ کر، حیرت سے،
ہر روشن اور زندہ چیز کو یاد کرتا ہے،
اور اسے آخر کار یقین ہوجاتا ہے کہ یہ بیگانہ وحشی اور پر اسرار رات
اس کا آبائی ورثہ ہے۔

رات کی آندھی، تاریکی اور طوفان کی فضا بھی شاعر کے دل کو تڑپا دیتی ہے :

او رات کی آندھی، تو کیا چیخ رہی ہے؟
کس فکر میں یوں دیوانہ وار تیزی سے چل رہی ہے؟
تیری یہ آواز کیا سنانا چاہتی ہے
جو کبھی نحیف و زار، کبھی تند و پرشور ہو جاتی ہے؟
تو ایک لہجے میں جسے میرا دل سمجھتا ہے
ایک پر درد شکوہ سناتی ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا.
تو میرے دل کو دکھاتی ہے اور تیرے جواب میں
وہ کبھی کبھی دیوانوں کی طرح چیخ اٹھتا ہے.
ارے، یہ وحشتناک گیت نہ گا،
اس عالم فساد کا گیت جو قدیم ہے، عزیز ہے!
رات کی روح کے اس محبوب گیت کو

سارا عالم کسی ذوق و شوق سے سن رہا ہے!
سارا عالم اس تمنا میں بیتاب ہے
کہ جسم فانی کی قید سے رہا ہوکر
ابدیت کے بے پایاں سمندر میں بہ جائے...
ارے، سوتے طوفانوں کو نہ جگا!
اُن کے نیچے فساد کا دریا ابلنے کو تیار ہے.

استعارے اور حقیقت، مناظر قدرت اور عالم خیال کی ایک عجیب آمیزش ملاحظہ ہو:

جیسے سمندر زمین کے کرے کو گھیرے ہے،
دنیاوی زندگی خوابوں سے گھری ہے..

رات ہوئی اور سمندر کی موجیں
ساحل سے ٹکراتی ہیں' اور ٹکرانے سے ایک صدا نکلتی ہے۔
یہ اس کی آواز ہے۔ یہ دل کو لبھاتی ہے' اپنی طرف بلاتی ہے'
کہتی ہے کہ کشتی بندرگاہ میں پہنچ گئی ہے...
سمندر کا بہاؤ بہت جلد ہمیں ساحل سے بہا لیجاتا ہے
اور تاریک' بے پایاں موجوں کی گود میں ڈال دیتا ہے۔
آسمان کا گنبد، ستاروں کے نور سے چمکتا ہوا
اپنی گہرائی سے ہمیں پر اسرار نظروں سے دیکھتا ہے'
ہم تیرتے رہتے ہیں' اور اتھاہ سمندر کی ابلتی ہوئی موجیں
ہمیں ہر طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔

شاعر کی نظر سے وہ اختلاف بھی مخفی نہیں رہا ہے جو اکثر انسان کے فلسفۂ زندگی کو فطرت کی تعلیم سے جدا رکھتا ہے۔ وہ حیرت سے پوچھتا ہے:

سمندر کی موجوں کا اپنا ترانہ ہے'
عناصر کی ان بن میں ایک ہم آہنگی'
اور لچکتے ہوئے بید کے درختوں کی لرزش سے
ایک خوشگوار سریلا راگ نکلتا ہے۔
ہر شے اور حرکت میں تناسب ہے'
فطرت کی ہم آہنگی میں خلل نہیں'
صرف ہم' اپنی آزادی کے وہم باطل میں مبتلا ہوکر
فطرت سے ناسازی محسوس کرتے ہیں۔
یہ ناسازی کہاں سے آئی' کیسے پیدا ہوئی؟
ہماری روح اس سنگت میں کیوں شریک نہیں ہوتی'

کیوں وہی گیت نہیں گاتی جو سمندر گاتا ہے
اور فکر میں ڈوبا ہوا بید گنگناتا ہے ؟

اس اختلاف کا ایک اور پہلو ہے- فطرت کو بھی انسانی زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ۔ ذیل کی نظم ' جو روس کے ایک مشہور میدان جنگ سے گزرتے وقت لکھی گئی تھی ' فطرت کی اس سرد مہری کو بیان کرتی ہے۔

اس زندگی کا ' جس کا یہاں شور و غوغا تھا ،
اس خون کا ' جس کے یہاں دریا بہ گئے '
کتنا حصہ محفوظ رہا ' ہم تک کتنا پہنچا ؟
آج ہمیں صرف دو تین ٹیلے نظر آتے ہیں —
ان پر دو تین شاہ بلوط کے درخت اُگے ہیں
جن کی شاخیں بیباکی سے دور تک پھیلی ہیں ۔
درخت سرسبز ہوتے ہیں' خوشی کے گیت گاتے ہیں' اور انہیں اس کی فکر نہیں
کہ ان کی جڑیں کس کی لاش ' کس کی یادگار چھپائے ہیں ۔
یعنی فطرت کو گذرے ہوے زمانے کا کوئی احساس نہیں '
وہ ہمارے ماہ و سال کے پیمانے سے نا آشنا ہے '
اور اس کے روبرو ہمیں اپنی ہستی کی تصویر دھندلی سی نظر آتی ہے-
ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم محض صورتیں ہیں جو اسے خواب میں دکھائی دیتی ہیں۔
باری باری سے فطرت اپنے تمام بچوں کو
جو اپنی سعی لا حاصل انتہا تک پہنچا چکے ہیں
بلا تفریق اس اتھاہ غار میں بلا لیتی ہے
جس میں ہر شے فنا ہوتی ہے ' جس سے ہر شے پیدا ہوتی ہے ۔

فطرت اور انسان کا یہ تعلق شاعر کو پسند نہیں' اور اس نظم کے سوا

اس کے کلام میں ہم کہیں فطرت کو موت اور حیات کے کارخانے کی شکل میں نہیں دیکھتے۔ لیکن فطرت کی طرح خود شاعر کو بھی انسانی کوشش اور کامیابی سے اتنی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ فطرت کے آئین اور انسان کی آرزوؤں کو ہم آہنگ بنانے کی تدبیریں سوچے۔

عشق کا مضمون نظم میں بہت پرانا ہے، اور اس لحاظ سے کہ ہر شاعر اپنے تجربے اور احساسات نرالے سمجھ کر انہیں ایک نئی شکل میں پیش کرتا ہے، عشق کا مضمون ہمیشہ نیا بھی ہوتا ہے۔ چیوچف کے لئے عشق کا جذبہ وہی کیفیت رکھتا تھا جو ہر شاعر اور ہر انسان محسوس کرتا ہے، لیکن اس کے عشق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مناظر قدرت کی خوبیوں کو زیادہ روشن اور پر معنی، اس اثر کو جو یہ دل پر ڈالتے ہیں زیادہ گہرا اور پر کیف کردیتا ہے۔ عشق اسے انسان اور کائنات کے رازوں سے آشنا کرتا ہے، اور چیوچف عشق کے تصور میں اسی طرح محو ہو جاتا ہے جیسے مناظر قدرت کے مشاہدے میں۔

دن ڈھل رہا ہے، رات قریب ہے،
پہاڑ کا سایہ لمبا ہوتا جاتا ہے۔
آسمان پر بادلوں کی چمک ماند پڑگئی...
اندھیرا چھا گیا۔ شام ہوگئی۔
مگر مجھے رات کے اندھیرے کا کوئی خوف نہیں،
نہ گئے ہوے دن کے گذرنے کا افسوس —
صرف تو، میری مسحور کن خیالی مورت،
صرف تو میرا ساتھ نہ چھوڑنا!...
مجھے اپنے پروں کے سائے میں لیلے،

میرے دل کی بے تابی دور کردے '
تب میری مسحور روح کے لئے
تاریکی بھی فرحت بخش ہوجائے گی .
تو کون ہے ؟ کہاں سے آئی ؟ کیسے جانوں
کہ تو زمین کی ہے یا آسمان کی ؟
ممکن ہے تو آسمان کی رہنے والی ہو
مگر تیری رزم ایک آرزو بھری عورت کی ہے .

چیوچف نے کہیں اپنی معشوقہ کا سراپا نہیں بیان کیا ہے . صرف ایک نظم میں اس کی آنکھوں کی تاثیر بتائی ہے .

مجھے آنکھیں یاد ہیں - آہ ' وہ آنکھیں !
مجھے ان سے جو محبت تھی وہ خدا ہی جانتا ہے !
ان کی طلسمی ' آرزو بھری رات
میری روح کا قید خانہ بن گئی تھی .
اُن آنکھوں میں ' جن کی کیفیت میری عقل سمجھ نہ سکی '
جن کی نظر ہستی کے تمام راز روشن کردیتی تھی '
ان آنکھوں میں کیسا غم موجیں مار رہا تھا '
جذبات کی کیا گہرائی تھی !
ان کی نظر ' پلکوں کے سائے میں بسیرا لئے ہوئے
کبھی رنج و الم کی آہیں بھرتی '
کبھی لذت سے سیر ہوکر ' نڈھال ہوجاتی '
کبھی بلائے آسمانی بن کر گرتی .
ان پر کیف لمحوں میں

کبھی مجھ سے یہ نہ ہوسکا
کہ ان آنکھوں کو دیکھوں اور دل بیتاب نہ ہوجائے '
ادا شناسی کا حق ادا کروں 'اور آنسو نہ بہیں .

معشوقہ کے انتقال کے بعد وہ گزرے ہوئے دن یاد کرکے کہتا ہے :

میں اس سے ان دنوں بھی آشنا تھا '
اس زمانے میں جو اب ایک پرانی کہانی معلوم ہوتا ہے '
وہ زمانہ جو یاد سے محو ہو گیا ہے
جیسے صبح کا ستارہ ' سورج کی کرنوں میں چھپ کر
آسمان میں غائب ہو جاتا ہے .
ان دنوں وہ
شاداب حسن سے مالا مال تھی '
اس میں وہ تازگی تھی جو سورج نکلنے سے پہلے فطرت میں ہوتی ہے '
جب شبنم کی بوند پھول پر ٹپک جاتی ہے
اس طرح کہ کوئی نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے .
اس وقت اس کی زندگی
ایسی مکمل تھی 'ایسی پاک ,
دنیا کی عام روش سے اتنی بیگانہ '
کہ معلوم ہوتا ہے وہ مری نہیں
بلکہ غروب ہو گئی ' جیسے ستارہ غروب ہو تا ہے .

اسی عشق کا ایک اور پہلو ہے . مشرق کے لوگوں کو وہ بہت انوکھا معلوم ہوگا .
یہاں عاشق اپنے جذبے کی سنگدلی اور بےرحمی کی شکایت کرتا ہے ' اس لئے کہ
وہ معشوق کے لئے مہلک ثابت ہوا .

آہ، ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے،
جب پرہوس جذبات کے بےلگام جوش میں
ہم اندھا کر اسی چیز کو تباہ کردیتے ہیں
جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔
کیا بہت دن ہوئے جب اپنی فتح پر فخر کرتے ہوئے
تونے کہا تھا: وہ میری ہے...
ایک برس بھی نہیں بیتا، اب خودھی دیکھ
اس کی کون‌سی خوبی محفوظ رہی؟
اس کے گالوں کی گلاب جیسی سرخی کیا ہوئی،
لبوں کا تبسم، آنکھوں کی‌چمک اب‌کہاں ہے؟
جلتے ہوے آنسو ایسے بہے
کہ سب کچھ جلاکر خاک کر گئے!
تجھے یاد ہے ملاقات کے وقت،
اس پہلی کمبخت ملاقات کے وقت؟
وہ اس کی جادو بھری نظر اور گفتگو،
وہ اس کی چونچال ہنسی؟
اب کیا رہا؟ یہ سب شوخیاں کدھر گئیں؟
اور تیرا خواب کتنے دن رہا؟
افسوس، شمالی ملکوں کی گرمیوں کی طرح
وہ چند لمحوں کا مہماں تھا!
تیری محبت اس کے لئے تقدیر کی
ایک ہیبتناک سزا تھی،

ایک رسوائی تھی جس کی وہ سزاوار نہ تھی
جس نے اس کی ساری زندگی برباد کردی!
عمر بھر اس نے ہر نعمت سے پرہیز کیا '
دل ہی دل میں صدھا تکلیفیں اُٹھائیں ...
عہد شباب کی کچھہ یادگاریں باقی تھیں
لیکن وہ بھی اسے دھوکا دے گئیں .
دنیا کی ہر بات سے اسے وحشت ہونے لگی '
فریب زندگی کا سرور جاتا رہا ...
اس کی روح پھل پھول رہی تھی
سو اسے بھی لوگوں کے حملوں نے پامال کردیا .
مصیبتوں کی آگ نے سب کچھہ جلا کر راکھہ کردیا '
اور یہ راکھہ جو محفوظ رہی کیا تھی ؟
درد ' روحانی تلخی کا بے رحم درد '
درد ' جسے نہ دوا نصیب ہوئی نہ آنسو .
آہ ' ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے '
جب پر ہوس جذبات کے بے لگام جوش میں
ہم ادبدا کر اسی چیز کو تباہ کردیتے ہیں
جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے .

چیوچف جب اپنی معشوقہ سے پہلی بار ملا تو اس کی عمر ۶۸ سال کی تھی .
اپنے جذبے کی اِس خصوصیت کو بھی وہ محسوس کرتا ہے :

آہ ' عمر کے ڈھلتے وقت ہماری محبت میں
کیا دلسوزی ہوتی ہے ' کیسی وہم پرستی ...

کچھ دیر اور چمک، دکھلا، کچھ دیر اور،
آخری عشق، ڈوبتے ہوئے سورج، کی روشنی!
آدھے آسمان پر اندھیرا چھا گیا ہے،
صرف ادھر مغرب میں کچھ رونق باقی ہے۔
ذرا ٹھہر، ذرا اور ٹھہر، اے روز روشن کی یادگار،
اے ذوق نظر، اپنے جادو کا اثر ذرا اور رہنے دے!
رگوں میں خون ٹھنڈا پڑگیا تو کیا ہوا،
دل تو شوق سے گرم ہے ...
اے آخری عشق!
تو روحانی لذت بھی ہے، اور ناامیدی کا پیغام بھی۔

یہ عمر، یہ جذبہ اور یہ انجام۔ کیا تعجب اگر شاعر کے دل میں صرف یہ حوصلہ باقی رہ گیا:

جیسے جلتی راکھ پر پڑا ہوا کاغذ
دھواں دیتا ہے اور سلگتا ہے،
اور چھپی ہوئی آگ چپکے چپکے
اس کے الفاظ اور سطروں کو چاٹ جاتی ہے؛
یوں ہی میری زندگی برباد ہو رہی ہے،
روز تھوڑی تھوڑی دھواں بن کر اڑ جاتی ہے،
اور میں، ایسی یکسانی سے جو برداشت نہیں ہوتی
رفتہ رفتہ جل کر بھسم ہو رہا ہوں ...
اے آسمان، کیسا ہوتا اگر یہ آگ
ایک بار دل کھول کر بھڑک اٹھتی،

اور رنج اور سست قدم موت کی تکلیفوں سے رہا ہوکر
میں ایکبارگی جل اٹھتا اور جل جاتا!

چیوچف کی نظمیں پڑھ کر ہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قومی اور ملکی مسائل کو وہ کن نگاہوں سے دیکھتا ہوگا۔ سوا ایک نظم کے جو اس نے ایک دوست کے اصرار پر لکھی تھی' اور جس میں روسیوں کو قسطنطنیہ کی فتح کا مژدہ سنایا گیا ہے اس نے کبھی کسی قسم کے سیاسی جوش کا اظہار نہیں کیا۔ اسے اپنے ملک سے محبت بہت کم تھی' لیکن بالکل بیگانگی برتنا ناممکن تھا۔ دو نظمیں جو روس میں خاص طور پر مشہور ہوئیں درج کی جاتی ہیں:

یہ مفلس بستیاں'
یہ اجڑی سر زمین' یہ بے لطف آب و ہوا —
یہی تیری کائنات ہے' اے مظلومیت کے گھر'
اے روسی قوم کے وطن!
غیروں کی مغرور نظر ان احساسات کو
نہ دیکھ سکتی ہے' نہ سمجھ سکتی ہے'
جن کی روشنی تیری عاجزی اور بے کسی کے پردے سے گذر کر
تیری روح کو چمکاتی ہے۔
صلیب کے بوجھ سے زیر بار کرکے
تجھے' اے میرے وطن'
آسمان کے بادشاہ نے غلاموں کے ذمیر سے
بنایا اور بناکر برکت دی۔

دوسری نظم اس سے کچھ کم ہمت شکن ہے' اور اس کے آخری مصرع میں ایک بات کہی گئی ہے جو ان تمام خیالات کا جز روس کی نسبت

ظاہر کئے گئے ہیں' اب انتخاب ہے :

روس کو عقل نہیں سمجھ سکتی'
عام پیمانہ نہیں ناپ سکتا'
اُس کا ایک اپنا الگ معیار ہے —
روس سے صرف عقیدت ہوسکتی ہے ۔



خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان

خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مرحوم و مغفور

از

جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے مددگار معتمد عدالت و کوتوالی
و امور عامہ حیدر آباد دکن

تمہید

یہ تو شاید آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ تھوڑے دنوں سے میں شاعر ہوگیا ہوں۔ اور شاعر بھی اس زور کا کہ غالب کی غزل پر غزل لکھتا ہوں۔ اس جوش شاعری میں ایک واقعہ کا اظہار میں نے مقطع میں اس طرح کہا ہے —

میری رندانہ روش کو بہر اصلاح خیال
محتسب سے کم نہیں 'فرحت' میرا 'دانی' مجھے

یقین مانئے کہ اس شعر میں جو کچھ لکھا گیا ہے صحیح اور بالکل صحیح ہے۔ یہ میاں دانی خدا کے فضل سے کچھ ایسے نکتہ چین واقع ہوے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ یہ مرض تو ان کو بچپن ہی سے تھا۔ مگر اب اس میں ترقی ہوکر بہت کچھ پختگی آگئی ہے۔ آگے چل کر دیکھئے کہ اس کی کیا شکل ہوتی ہے۔ ذرا ملے۔ سلام علیک کی اور نکتہ چینی کا سلسلہ شروع ہوا۔ "ارے بھئی۔ آج تم نے ڈاڑھی کیوں نہیں بنائی۔ بندہ خدا ذرا اپنا کالر تو دیکھا ہوتا۔ آخر اس چوہا چکٹ کا لر لگانے سے

فائدہ۔ لاحول ولا قوت۔ تم اپنی پوزیشن کو دیکھو۔ اور اس چھکڑا موٹر کو دیکھو۔ یہ تو معلوم ہو کہ آخر کون سے دن اس کو بدلوگے" غرض جب ان سے ملو۔ ایسے ہی ہزاروں فقرے سن لو۔ مگر ہے یہ کہ ان کے اکثر ریمارک ہوتے ہیں صحیح۔ یہ اور بات ہے کہ اب سنتے سنتے ہم کو کچھہ عادت سی ہوگئی ہے کہ خواہ مخواہ ان کی خدا لگتی بات کو بھی یوں ہی ٹال دیتے ہیں۔ کئی برس کی بات ہے کہ میں کسی شاعر کے حالات رسالہ اُردو کے لئے لکھہ رہا تھا کہ میاں داسی آدھمکے۔ کہنے لگے "کیا لکھہ رہے ہو" میں نے کہا "لو۔ سن لو۔" پھر بڑی دیر تک بیٹھے سنتے رہے۔ ان کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھہ کہنا چاہتے ہیں مگر میرے پڑھنے کی وجہ سے اپنا جوش دبائے بیٹھے ہیں۔ جب میں نے پڑھنا ختم کیا۔ تو فرمانے لگے "ارے۔ بھئی مرزا خدا کی قسم تمہاری باتوں سے بہت جی جلتا ہے۔ ارے غیروں کے حالات گھسیٹتے چلے جاتے ہو اور گھر کے پیڑوں کو تیل ہی کا ملیدہ کھلاتے ہو" میں نے کہا۔" یہ کیا "کہنے لگے" بندۂ خدا۔ آخر یہ حضرت آپ کے کون ہیں جو دین دنیا سب فراموش کرکے ان کے حالات جمع کرنے کے پیچھے پڑے ہوے ہو۔ اگر لکھنا ہے تو اپنے دادا خواجہ امان مرحوم ہی پر کچھہ لکھو۔ ان شاعروں کے قصوں سے تو سیکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں۔ خدا معلوم یہ کیا مصیبت ہے کہ ہماری زبان کے نثر لکھنے والوں کے حالات کوئی نہیں لکھتا۔ غضب خدا کا کہ اردو کے تٹ پونجیے شاعروں کے حال میں تو صفحے کے صفحے کالے کردئے جائیں اور خواجہ امان جیسے نثر نگار کا نام تک لوگ نہ جانیں۔ میاں ابھی اس زمانہ کے بزرگ خود تمہارے گھر میں موجود ہیں۔ ان سے پوچھہ پوچھا کر تھوڑا بہت لکھہ ڈالو نہیں تو تھوڑے دنوں

میں یہ قصے بھی ان لوگوں کے ساتھہ رخصت ہوجائیں گے " میں اس وقت اپنی دھن میں لگا ہوا تھا - میں نے کہا " بہت اچھا - دیکھا جاے گا - اس وقت تو آپ تشریف لے جائیے - کبھی فرصت ہوئی تو آپ کے اس قیمتی مشورہ پر غور کروں گا " اس کے چند ہی روز بعد خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ میاں واہی کے متعلق ایک صحبت میں گفتگو ہورہی تھی - مولوی عبدالحق صاحب بھی موجود تھے - میں نے محض " تفریح " کی غرض سے اوپر والا واقعہ بیان کیا - تفریح تو ایک طرف مولوی عبدالحق صاحب تو میرے پیچھے پڑ گئے اور پیچھے کیا پڑے - گویا میری چڑ مقرر کر لی جب اور جہاں کہیں ملتے سب سے پہلے یہی پوچھتے کہ " کہوں بھئی ہمارا وہ خواجہ امان والا مضمون لکھا - مگر واہ رے میں - میری ہمت کی بھی داد دیجئے کہ دو برس سے کچھہ اوپر تقاضوں ہی تقاضوں میں نکال دئے - میں تو اب بھی ٹھنڈے دل سے اس معاملہ پر غور نہ کرتا - مگر چند ہی دنوں میں خاندان کے بعض بزرگوں کے اٹھہ جانے نے میری آنکھیں کھول دیں - اور سمجھہ میں آیا کہ" میاں فرحت - اب اس داستان کو لکھہ لینا ہی اچھا ہے - ایسا نہو کہ تمہارے گھرانے کے جو بڑے بوڑھے بچے کھچے رہ گئے ہیں وہ بھی رخصت ہوں - اور پھر سارا مضمون ہی ختم ہو جائے " دل میں یہہ خیال آنا تھا کہ مجھے وحشت سی ہونی شروع ہوئی - اِس سے پوچھا اُس سے پوچھا - یہ کتابیں دیکھی وہ کتاب دیکھی اور تھوڑے ہی دنوں میں خاصہ مواد جمع کرلیا - میں نے اس مضمون میں خواجہ امان مرحوم کے خاندانی حالات کچھہ تو هندوستان کی تاریخوں اور خود انکی کتابوں سے لئے ہیں اور کچھہ مرزا غالب کے خطوں اور خواجہ قمرالدین خان راقم (فرزند خواجہ امان) کی تحریروں سے حاصل کئے ہیں اور ان سب کا مقابلہ انکے پوتے خواجہ

اسیرالدین مرحوم کی اس درخواست سے کیا ہے جو انہوں نے سنہ 1911 ع کے دربار تاج پوشی کے موقعہ پر لاٹ صاحب کو دی تھی - اب رہے انکے حالات زندگی - انکا اٹھنا بیٹھنا - ان کارھنا سہنا اور انکا میل جول وغیرہ تو یہ سب میں نے اپنے بزرگوں سے پوچھہ پوچھہ کر لکھا ہے - لیکن اس پوچھہ کچھہ میں جو دقتیں مجھے پیش آئی ہیں وہ میرا دل ہی خوب جانتا - کسی بڑے میاں اور خاصکر کسی بڑی بی سے کسی کا کچھہ حال پوچھو تو مزا آے - یہہ لوگ بات میں بات پھلسا کر کچھہ ایسی چکر کی گفتگو کرتے ہیں کہ اصل مطلب غائب ہو کر مضمون کہیں سے کہیں جا پڑتا ہے - جب میں نے خواجہ امان مرحوم کے حالات معلوم کر نے کا ارادہ کرلیا تو سب سے پہلے میں نے اپنی پھوپی صاحبہ سے اس کا تذکرہ کیا - اس وقت ان کی عمر نوے برس سے بھی کچھہ اوپر ہے مگر خدا کے فضل سے قوی اچھے ہیں اور ہوش و حواس بالکل ٹھیک ہیں - میں نے کہا " اجی دادی اماں - اپکو دادا خواجہ امان تو اچھی طرح یاد ہونگے " کہنے لگیں " ہیں - یاد ہونے کی بھی خوب کہی - ابھی انکو مرے ہوے کتنے دن ہوے ہیں - کل کی بات ہے - میرا مشو گود میں تھا - اس کے تھوڑے ہی دن بعد تو میاں حشمت کی شادی ہوئی ہے - ڈپٹی صاحب کے مرنے کے کوئی چھہ مہینے بعد مرے ہوں تو مرے ہوں " غرض یہہ سلسلہ کسی کے مرنے - کسی کے جینے - کسی کے پیدا ہونے - کسی کی شادی ہونے - کسی کے آنے اور کسی کے جانے سے ملتا ہوا یہانتک بڑھا کہ سنہ ۵۷ ع کے غدر سے جا ملا - لیکن یہہ پتہ نہ چلا کہ بیچارے خواجہ امان مرے کون سے سنہ میں - ان بڑھیوں سے کوئی بات معلوم کرنا "جوئے شیر" لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے دلی والیاں تو ہربات کو غدر سے لیجا کر ملادیتی ہیں - اور ایک قصہ کو دوسرے قصہ میں ایسا پھنسا دیتی ہیں کہ مطلب کی بات کھانس کے ڈھیر میں سوئی ہوکر رہ جاتی ہے

خیر - جب اس طرح کام نہیں چلا - تو میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا - یعنی اپنے گھرانے کے دو چار بزرگوں (نمبر ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ شجرہ) کو ایک جگہ جمع کرکے خواجہ امان مرحوم کا ذکر چھیڑ دیا - اور خود ایک کونہ میں کاغذ پنسل لیکر بیٹھ گیا - یہ ترکیب بڑی کار گر ہوئی - ہرایک نے ایک دوسرے کی تائید یا تردید میں اپنی آنکھوں دیکھے حالات بیان کرنے شروع کئے - رونا بھی ہوا - ہنسنا بھی ہوا - ان کے مرنے پرافسوس بھی ہوا - اپنی موت کو بھی یاد کیا - غرض یہ سلسلہ ایسا چھڑا کہ اس کاختم ہونا مشکل ہوگیا - اگر ایک ہی مضمون پر گفتگو ہوتی تو میرا کوئی ہرج نہ تھا - مجھے اپنے مضمون کے لئے بہت مسالا ملجاتا - لیکن مشکل تو یہ تھی کہ قصہ میں سے قصہ اور واقعہ سے واقعہ اس طرح نکلے چلا آتا تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر میں خواجہ امان کا قصہ بہادر شاہ اور غدر کے قصوں میں غائب ہوجاتا تھا - اب ان لوگوں کی گفتگو میں دخل دیا جائے تو سمجھہ لو کہ داستان ختم ہے - کیونکہ ذرا ان کو شبہ ہوا کہ اس گفتگو سے میاں صاحب زادے کا کوئی خاص مطلب ہے اور یہ لوگ چپ ہوگئے - اس لئے ان کو اصل مضمون کی طرف پھیر نے میں بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے - بہر حال کچھہ ہی ہوا - مجھے اتنا تو مواد مل گیا کہ خاصہ ایک مضمون ہوجائے - اور کم سے کم خواجہ امان کی صورت شکل - چال ڈھال اور طرز زندگی کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے -

میرے اس مضمون میں جا بجا بعض لوگوں کے نام آئے ہیں - اس لئے میں اپنے اور خواجہ امان مرحوم کے خاندانوں کا مختصر سا شجرہ نیچے دیے دیتا ہوں - تاکہ ایک طرف تو یہ معلوم ہوجائے کہ ہمارے خاندان سے ان کا کیا تعلق تھا اور اس لئے ہمارے خاندان سے زیادہ ان کے صحیح حالات اور

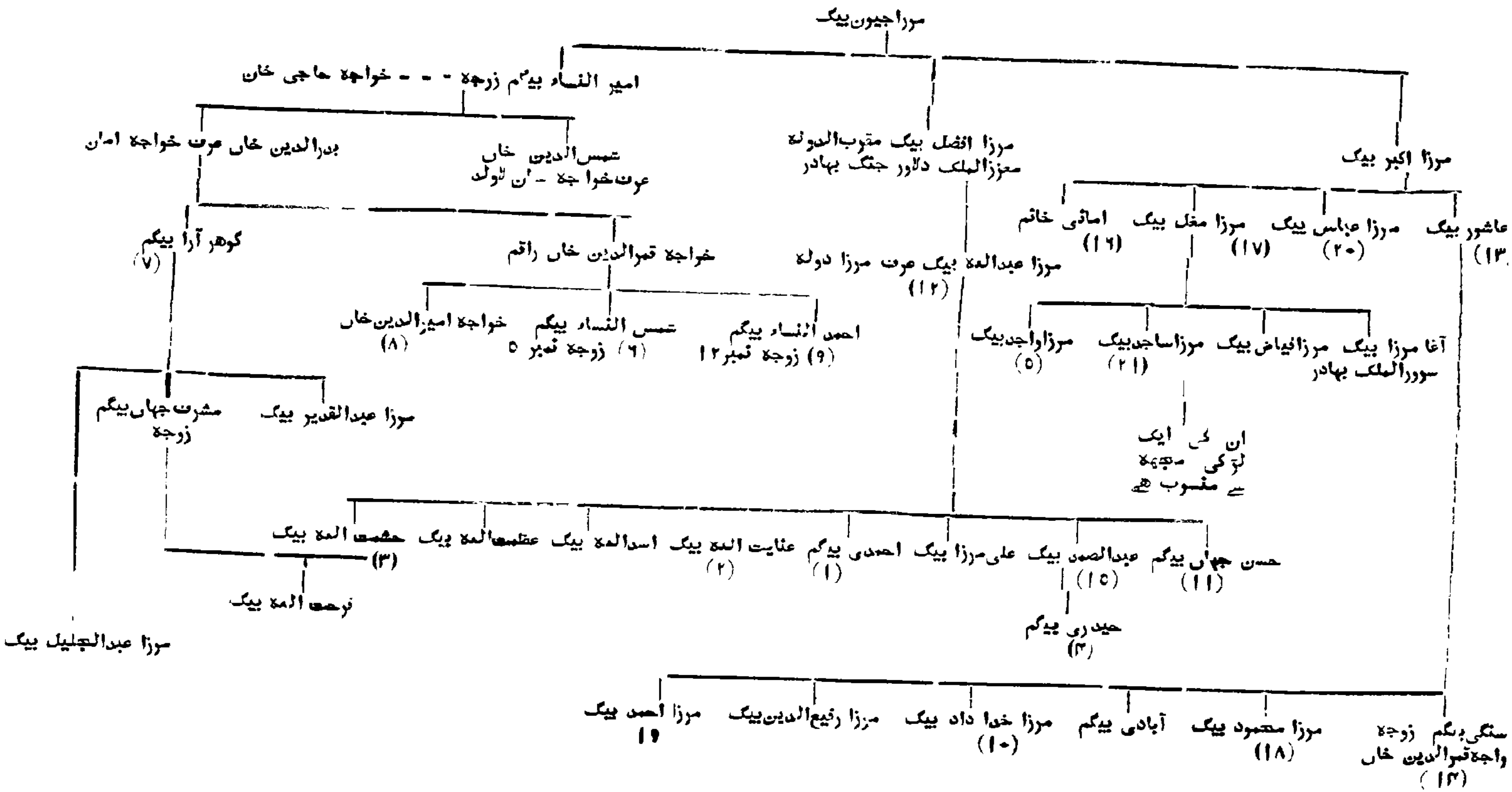
کوئی نہیں جانتا - اور دوسری طرف ان لوگوں کے نام جاننے سے واقعات کے سمجھنے میں دقت نہو - یہ سارا مضمون ان لوگوں کی گفتگو کا نتیجہ ھے جن کے نمبر اس شجرہ میں ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ هیں - باقی سب لوگ سوائے دادا آغا مرزا بیگ سرور الملک بہادر کے جنت کو سدھار چکے هیں اور جو لوگ بچے هیں وہ بھی جانے کو تیار بیٹھے هیں - نمبر ۱ اس وقت نوے برس سے کچھہ اوپر هیں نمبر ۲ کی عمر ۸۰ سے زیادہ ھے - نمبر ۳ - کا سن کوئی ۷۲ سال ھے نمبر ۴ و ۵ کی عمر ۶۸ سال اور نمبر ۶ کی عمر ۶۲ سال هو گی -

اس شجرہ میں میرا نام بھی آگیا ھے - کہیں اوپر کی تحریر سے یہ نہ سمجھہ لیا جائے کہ خدانخواستہ میں بھی مرچکا هوں یا مرنے کو تیار بیٹھا هوں-

خیر - یہ تو مضمون کی تمہید هوئی - اب اصل مضمون لیجئیے - هاں یہ یاد رکھئیے کہ جہاں کہیں میں کوئی نام لکھونگا وهاں اسکے ساتھہ هندسے بھی دونگا - ان هندسوں کا مقابلہ شجرہ کے هندسوں سے کر نے سے معلوم هو جائیگا کہ یہ کون شخص هیں اور ان کا خواجہ امان مرحوم سے کیا رشتہ اور تعلق ھے —

حالات خاندانی

حسب و نسب — انکا نام خواجہ بدرالدین خان اور عرف خواجہ امان تھا - شعر کہتے تھے مگر تخلص کوئی نہ تھا - یہ اور اسداللہ خاں غالب هم جدهیں



مرزا جیون بیگ
امیر النساء بیگم زوجہ - - - خواجہ حاجی خان
مرزا افضل بیگ مقرب الدولہ
معززالملک دلاور جنگ بہادر
مرزا اکبر بیگ
بدرالدین خاں عرف خواجہ امان
شمس الدین خاں
عرف خواجہ - ان لولہ
کوھر آرا بیگم (۷)
خواجہ قمرالدین خاں راقم
مرزا عبداللہ بیگ عرف مرزا دولہ (۱۲)
امانی خانم (۱۶)
مرزا مغل بیگ (۱۷)
مرزا عباس بیگ (۲۰)
عاشور بیگ (۱۳)
خواجہ امیرالدین خاں (۸)
شمس النساء بیگم (۶) زوجہ نمبر ۵
احمد النساء بیگم (۹) زوجہ نمبر ۱۲
مرزا واجد بیگ (۵)
مرزا ساجد بیگ (۲۱)
مرزا فیاض بیگ
آغا مرزا بیگ
سوورالملک بہادر
مشرف جہاں بیگم
زوجہ
مرزا عبدالقدیر بیگ
ان کی ایک
لڑکی مجھ
سے منسوب ھے
حشمت اللہ بیگ (۳)
عظمت اللہ بیگ
اسداللہ بیگ
عنایت اللہ بیگ (۲)
احمدی بیگم (۱)
مرزا بیگ
علی بیگ
عبدالصمد بیگ (۱۵)
حسن جہاں بیگم (۱۱)
نرحمت اللہ بیگ
حیدری بیگم (۴)
مرزا عبدالجلیل بیگ
مرزا احمد بیگ ۱۹
مرزا رفیع الدین بیگ
مرزا خدا داد بیگ (۱۰)
آبادی بیگم
مرزا محمود بیگ (۱۸)
سنگی بیگم زوجہ
خواجہ قمرالدین خاں (۱۴)

یعلی تیسری هی پشت میں دونوں کا سلسلہ مل جاتا هے - اور یہ سلسلہ نسب تور ابن فریدون تک پہنچتا هے- جب کیا نیوں کے هاتھوں تورانیوں کی سلطنت کا خاتمہ هوا - تو یہ لوگ بھی ادھر ادھر منتشر هوگئے - صدیوں کے بعد ان کا نصیب جاگا اور سلجوقی خاندان کی شکل میں انہوں نے پھر سلطنت قائم کرلی - کئی پشتوں کے بعد زوال نے پھر منھہ دکھایا - اور سلجوقی شاهزادے سمرقند میں گوشہ نشین هوگئے - غالب مرحوم نے اپنے اس نسب کو اس طرح ظاهر کیا هے —

غالب از خاک پاک تورانیم لا جرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و درنژاد همے بہ سترکان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعت اتراک در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست مرزبان زادۂ سمرقندیم

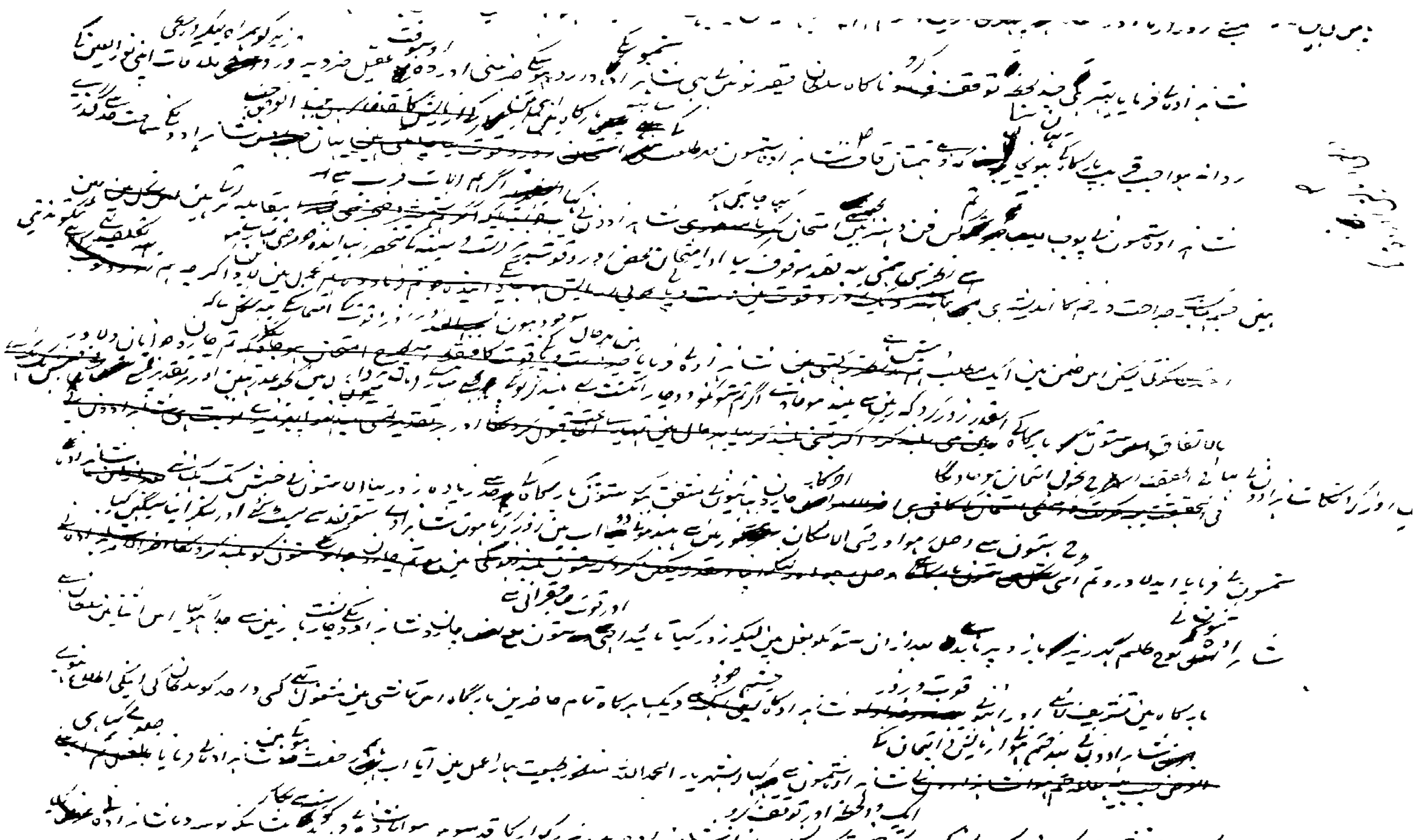
لیکن سمرقند میں بھی ان کو اطمینان نصیب نہیں هوا - کیونکہ ایک طرف تو ان کو اپنی سلطنت جانے کا غم تھا اور دوسری طرف وهاں کے حاکموں کو ڈرتھا کہ کہیں یہ لوگ اپنی کھوئی هوئی حکومت حاصل کرنیکی پھر کوشش نہ کریں - آخر انہوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا اور بدخشان کی طرف نکل کھڑے هوئے - جس وقت یہ لوگ بدخشان آئے اس وقت اس خاندان میں دو بھائی رہ گئے تھے - بڑے کا نام ترسم خاں اور چھوٹے کا نام رستم خاں تھا - ترسم خان کی شادی بدخشاں هی کے ایک امیر کے هاں هوگئی - ان کے هاں تین اولادیں هوئی - دو لڑکے نصر اللہ بیگ خان اور عبداللہ بیگ خان اور ایک لڑکی - بہر حال اس خاندان کو ذرا فراغت نصیب هوئی تھی کہ ترسم خان کا وقت آ اگا اور انکا بدخشاں هی میں انتقال هوگیا - بھائی کے مرنے کا رستم خان کو کچھہ ایسا صدمہ هوا کہ وہ

سب کو چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل کھڑے ہوئے - پھرتے پھراتے بخارا پہونچے - اور وہیں ان کی شادی حضرت خواجہ عبداللہ احراری کے خاندان میں ہو گئی - اسی شادی کی وجہ سے رستم خان کے خاندان میں بلحاظ اعزاز خواجگی کا خطاب آگیا - اس بیوی کے بطن سے ان کے ہاں صرف ایک لڑکا خواجہ قطب الدین خان ہوا - خواجہ قطب الدین خان ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا - اور یہ اپنی ننھیال میں پرورش پاتے رہے - جوان ہونے پر ان کی شادی اسی خاندان میں ہوگئی - ان کے ہاں صرف ایک لڑکا خواجہ حاجی خان پیدا ہوا - یہ خواجہ حاجی خان ہی خواجہ بدرالدین خان کے والد ہیں -

خواجہ حاجی خان پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والدین بھی اس دنیا سے رخصت ہوئے - جب یہ خبر ان کے چچا نصراللہ بیگ خان کو پہونچی تو وہ اپنے چھوٹے بھائی عبداللہ بیگ خان کے ساتھ بدخشان سے بخارا آئے اور کچھ دنوں بھتیجے کے پاس رہے - یہاں ان سبھوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ترکستان اور بدخشان بد امنیوں کا مرکز بنا ہوا ہے - اور یہاں بظاہر اصلاح حال کی کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی بہتر یہی ہے کہ سب مل کر ہندوستان چلیں اور وہاں قسمت آزمائی کریں - غرض صلاح و مشورے کر اور بھتیجے کو ساتھ لے یہ لوگ بدخشان آئے اور ہندوستان چلنے کی تیاریاں شروع کیں - بدخشان سے قوم برلاس کے ایک اور امیرزادے مرزا جیون بیگ خان جو حضرت * سبز پوش کی اولاد میں تھے اپنے خاندان کو لیکر انکے ساتھ ہوئیے اور اس طرح ان دو خاندانوں نے اپنے

---

* حضرت سبز پوش کا مزار اب تک بدخشان میں مرجع خلائق ہے - اور مرزا جیون بیگ خاں بیگ کے دو بیٹوں اللہ داد خاں اور خدا دار خاں کی اولاد اب تک وہاں امیروں کی طرح گذار رہی ہے - حضرت سبز پوش کے بہت سے قصے ہمارے خاندان میں چلے آرہے ہیں لیکن ان کا تعلق اس داستان سے نہیں ہے اس لئے ان کا یہاں دہرانا ذرا بیمو قعہ ہے —



نمونہ خط خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان مرحوم

وطن کو چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا —

پہلے یہ قافلہ اٹک میں آکر ٹھہرا - اس کے بعد کچھ عرصہ تک لاہور میں رہا اور وہاں سے نکل کر دھلی پہنچا - یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عالم ثانی دھلی کے بادشاہ (سنہ ۱۷۷۱ ع سے سنہ ۱۸۰۶ ع تک) تھے۔ اگر ایک طرف مرھٹوں کا زور تھا تو دوسری طرف جات سر اٹھا رہے تھے - وزیر اودہ بالکل خود مختار ہوچکے تھے - دوسرے صوبے برائے نام بادشاہ کے ماتحت تھے - ورنہ در حقیقت ان کی حکومتیں قایم تھیں - *
ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں سلطنت دھلی کے وزیر بھی تھے اور سپہ سالار بھی - انھوں نے جو سنا کہ تازہ ولایتیوں کا ایک قافلہ دھلی آیا ہے تو فوراً سبکو بلایا اور پرگنہ پھاسو مدد خرچ کے لئے جاگیر میں دیکر نوکر رکھ لیا - ابھی تھوڑے ھی دنوں بعد کسی بات پر نواب سے ان کی چشمک ہوگئی اور یہ نوکری چھوڑ اکبر اباد چلے گئے - جب مہاراجہ مہاداجی سیندھیا کو ان کے اکبرآباد آنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے بھی ان کو بلایا - بہت اخلاق سے پیش آیا اور ان کو فوج میں بھرتی ہوجانے کے لئے کہا - یہ لوگ تونکلے ھی اسی غرض سے تھے سندھیا کی فوج میں اس شرط کے ساتھہ ملازم ہوگئے کہ سب ایک جگہ رھینگے - ساتھہ ھی لڑائی پر جائیں گے اور اگر علحدہ ہوئے تو ساتھہ ہی سب نوکری چھوڑینگے - غرض اس طرح نصراللہ بیگ خاں جو سب سے بڑے

---

* - مرزا نجف خان ایران کے امیر تھے - گردش زمانہ سے ہندوستان آئے اور محمد قلی کے ہاں ملازم ہوے - جب سنہ ۱۷۶۰ ع میں الہ آباد کے قریب محمد قلی کو کسی نے مار ڈالا تو یہ لارڈ کلایو کے پاس چلے گئے - اور اسی کی سفارش پر شاہ عالم ثانی نے ان کو فتح پور کا علاقہ بغرض انتظام سپرد کردیا - رفتہ رفتہ یہ بادشاہ کے وزیر ہوگئے - اور اس قابلیت سے انتظام ملک کیا کہ تھوڑے عرصہ کیلئے سلطنت دھلی سنبھل گئی - یہ جس طرح انتظام ملکی میں مشاق تھے اسی طرح میدان جنگ میں ایک قابل جرنیل تھے - چنانچہ جن جن رہا ستوں نے سلطنت کے خلاف سر اٹھایا ان کو انھوں نے پوری طرح کچل دیا سلطنت مغلیہ کے آخر زمانے میں اس قابلیت کوئی شخص نہیں تھا - یہ ۲۶ - اپریل سنہ ۱۷۸۲ ع کو لاولد فوت ہوے —

تھے فوج کے کمانیر ہوئے خواجه حاجی خاں کو ایک رساله کی رساله اری ملی - اور مرزا جیون بیگ خاں ایک پلٹن کے کمیدان مقرر ہوئے - نصرالله بیگ خاں کے چھوٹے بھائی عبدالله بیگ خاں ذرا مذهبی آدمی تھے انکے متعلق یه قرار پایا که ان کو پرگنے کے انتظام اور خاندان کی دیکھه بھال کے لئے آگرہ ہی چھوڑ دیا جاے ۔

ان لوگوں کو ملازم ہوکر تھوڑا ہی عرصه گزرا تھا که مرھٹوں کی نجف خاں سے بگڑ گئی - نجف خاں کی مدد انگریزوں نے کی اور اپنی حکمت عملی سے مرھٹه فوج کے بخشی بھوانی شنکر نامی کو توڑ لیا - مرھٹوں نے ۲۳ مارچ سنه ۱۸۷۱ ع کو شکست کھائی - لیکن ان نووارد ولایتوں کی فوج اپنے مورچے سے نه ھٹی - بخشی نے بہت کوشش کی ، نجف خاں نے بہت کچھه لالچ دئیے ، لیکن ان لوگوں نے ایک نه مانی - جب یه مختصر سی فوج چاروں طرف سے گھر گئی تو نصرالله بیگ خاں نے راجه کو لکھه بھیجا که اب ہمارا یہاں ٹھیرنا مشکل ہے - اگر فوراً کمک نه بھیجی گئی تو ہمارے جانوں کی خیر نہیں وہاں سے جواب ملا که بخشی جو کہے اس پر عمل کرو - جب راجه کے ہاں سے بھی کورا جواب مل گیا تو اب سوائے اس کے چارہ نه تھا که مورچه خالی کردیں - اور ادھر منھه آئے ادھر چلے جائیں - چنانچه وہاں سے لڑتے بھڑتے نکلے اور سیدھے اکبر آباد آئے - ان لوگوں کی بہادری دیکھه کر نواب نجف خاں نے ان سے پھر صفائی کرنی چاہی - نصرالله بیگ خاں کو دہلی بلایا اور فخرالدوله دلاور الملک رستم جنگ نواب احمد بخش خاں کی بہن سے ان کی شادی کرادی - لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا - اسی زمانه میں عبدالله بیگ خاں کی شادی اکبرآباد کے ایک امیر مرزا غلام حسین بیگ خاں کمیدان کی لڑکی سے ہوگئی اور ان کے بطن سے اسد الله خاں غالب اور یوسف بیگ خاں دو لڑکے اور چھوٹی خانم

ایک لڑکی پیدا هوے خبر نہیں که ایک دفعه هی عبدالله بیگ خاں کے دل میں کیا سمائی که گھر بار چھوڑ لکھنئو پہنچے - یہاں نواب آصف‌الدوله کے هاں کچھه دنوں ملازم رهے - وهاں سے طبیعت اچاٹ هوئی تو حیدرآباد دکن کا رخ کیا اور فوج میں تین سو سوار کی جمیعت کے افسر مقرر هوگئے - مگر یہاں کی خانه جنگیوں سے بھی تنگ آکر راجه بختاور سنگه والی الور کے هاں چلے آئے اور ایک گڑھي کے محاصرے میں کام آکر راج گڑھ میں سپرد خاک هوے —

خواجه حاجی خاں کا عقد مرزا جیون بیگ خاں کی لڑکی امیرالنساء بیگم سے هوا - ان کے هاں دو لڑکے هوے - ایک خواجه شمس‌الدین خاں عرف خواجه جان اور دوسرے خواجه بدرالدین خاں خواجه امان - یہی خواجه امان هیں جن کا حال میں اب لکھه رها هوں —

واقعات مابعد | یه لوگ اکبر آباد هی میں رهتے تھے که انگریزوں کی بھرت پور کے راجه سے لڑائی چھڑ گئی - بھرت پور کی ریاست کی بنیاد اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں سلطنت مغلیه کی کمزوری کی وجه سے پڑی تھی - یہاں کے راجه ذات کے جاٹ اور ملتان کے رهنے والے تھے - پہلے بھرت پور کے علاقے میں آکر بسے اور زبردستی دیگ کے چند مواضعات پر قبضه کرلیا - جب سلطنت مغلیه میں اور زیادہ انحطاط هوا تو ان میں کا ایک جاٹ سورج مل نامی ادھر ادھر کا علاقه دبا راجه بن بیٹھا - لیکن کچھه هی عرصه بعد دهلی پر حمله کرتے وقت سنه ۱۷۶۳ ع میں مارا گیا - اس کے بعد اس کا بیٹا جواهر سنگه اور پھر اس کا بھائی رتن سنگه اور بعد ازاں سورج مل کا پوتا کیہری سنگه گدی پر بیٹھے - کیہری سنگه نابالغ تھا - اس لئے ریاست کا سارا انتظام اس کے چچا نول سنگه اور اس کے بعد اس کے دوسرے چچا نہل سنگه کے هاتھه میں رها - نہل سنگه کے زمانے میں سورج مل کے چھوٹے بیٹے رنجیت سنگه

نے بغاوت کی اور دہلی سے مرزا نجف خان کو لے کر آیا - نجف خاں نے سارا ملک فتح کرکے رنجیت سنگھ کے حوالے کردیا - لیکن بھرت پور کے قلعہ کو ہاتھ نہیں لگایا - نجف خاں کے مرنے کے بعد سنہ ۱۷۸۲ ع میں مہاراجہ سیندھیا نے اس علاقہ پر قبضہ کرلیا - اور صرف تھوڑا سا حصہ رنجیت سنگھ کے گذارے کو دیکھ کر اسے بھرت پور کا راجہ بنا دیا - رنجیت سنگھ نے سنہ ۱۸۰۳ع میں لارڈ لیک سے معاہدہ کیا اور سیندھیا کے مقابلہ میں فوج بھیجی - اس کے صلے میں تھوڑا سا اور علاقہ اس کو عطا ہوا - لیکن جب انگریزوں کی جسونت راو ہلکر سے جنگ چھڑی تو رنجیت سنگھ نے انگریزوں کی مدد کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا - بلکہ در پردہ ہلکر کو مدد پہنچاتا رہا - اور جب ہلکر میدان جنگ سے بھاگا تو اس کو لا کر بھرت پور میں ٹھہرایا - یہ رنگ دیکھ کر لارڈ لیک نے سوچا کہ جب تک اس راجہ (بھرت پور) کی سرکوبی نہ ہوگی اس وقت تک یہ راہ راست پر نہ آئے گا - چنانچہ اسی غرض سے فوجیں جمع کرنی شروع کیں - لارڈ لیک کو ان نوواردہ ولایتیوں کی اس بہادری کا پورا طرح علم تھا جو انہوں نے سندھیا کی فوج میں رہ کر دکھائی تھی - اس لئے جب وہ اکبرآباد آیا تو ان سب کو اپنے پاس بلایا اور فوج جمع کرنے کا حکم دیا - انہوں نے نصراللہ بیگ خان کو اپنا افسر اعلی بنایا خواجہ حاجی خان رسالہ کے اور مرزا جیون بیگ پیدل فوج کے افسر بنے - اور اس طرح یہ لوگ انگریزی فوج کے ساتھ پھر ایک بار میدان جنگ میں آئے - اس لڑائی میں مہاراجہ الور بھی معاہدوں کی بنا پر انگریزوں کے ساتھ تھے چنانچہ ان کی طرف سے نواب احمدبخش خاں وکیل کل ہو کر لارڈ لیک کے شریک کار ہوئے اور اس طرح یہ فوج بڑھتے بڑھتے بھرت پور کے نیچے پہنچ گئی - مرزا نصراللہ بیگ خان کے ساتھ جو فوج تھی اس نے حملہ کر کے شہر کی ہوائی

فصیل پر قبضہ کرلیا - اس وقت راجہ کی آنکھیں کھلیں اور اس نے صلح کا پیغام بھیجا اور ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۰۵ ع کو صلح ہوکر راجہ سے جدید معاہدہ ہوگیا ۔ اس کے بعد انگریزی فوج اکبر آباد واپس آئی ۔ اور ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو جو جدید فوج بھرتی کی گئی تھی وہ ۲۱ اپریل سنہ ۱۸۰۵ ع کو موقوف کر دی گئی - لیکن اس کارگزاری کے صلے میں مرزا نصراللہ بیگ خان اور ان کے خاندان والوں کو (جس میں خواجہ حاجی خاں بھی شریک تھے) پانچ ہزار سالانہ کے دو پرگنے سونک سونا اور پونا ھانا مضافات ہوتل تحصیل فیروز پور جھرکہ میں بطور جاگیر عطا ہوئے - نواب احمد بخش خاں کو سرکار انگریزی کی کی طرف سے علاقہ فیروز پور اور راجہ الور کی جانب سے لوھارو جاگیر میں ملا اور مرزا جیون بیگ خان کو ایک سو روپئے ماھانہ پنشن عطا ہوئی —

اب ان نو واردوں کی ترقی کا زمانہ آیا - مرزا جیون بیگ کے چھوٹے فرزند مرزا افضل بیگ خاں بادشاہ دھلی کی طرف سے وکیل ہو کر گورنر جنرل کے پاس کلکتہ گئے اور مقرب الدولہ معزز الملک دلاور جنگ کے خطاب سے ممتاز ہوے - اس تعلق سے مرزا جیون بیگ خان اور خواجہ حاجی خان اکبر آباد سے دھلی چلے آے مرزا نصراللہ بیگ خان کو اپنے چھوٹے بھائی مرزا عبد اللہ بیگ خان کے مرنے کا کچھہ ایسا صدمہ تھا کہ وہ بھی سنہ ۱۲۲۱ ھجری مطابق سنہ ۱۸۰۷ ع میں اسی غم میں مرگئے ان کے بعد خواجہ حاجی خاں نے جو اب سارے خاندان میں سب سے بڑے تھے جاگیر کا دعوی کیا - نواب احمد بخش خان نے شہادت دی اور اس طرح یہ جائداد خواجہ حاجی خان پر اس شرط کے ساتھہ نسلاً بعد نسل بحال ہوئی کہ مرزا نصر اللہ بیگ خان کے پس ماندوں کی پرورش بھی کی جاے - جب جاگیر کا تصفیہ ہوگیا تو ایک دن نواب احمد بخش خان نے خواجہ حاجی خان

سے آکر کہا بھائی آپ کا علاقہ میرے علاقہ سے ملا ہوا ہے - آپ کو مالگزاری وصول کرنے اور وہاں کا انتظام کرنے میں مشکلیں پیش آتی ہیں - بہتر یہ ہے کہ اپنا علاقہ بھی میرے سپرد کردو - میں اس کی آمدنی تم کو پہنچا دیا کروں گا - خواجہ حاجی خان کے لئے اس سے زیادہ سہولت اور آسایش کا انتظام اور کیا ہوسکتا تھا ' وہ راضی ہوگئے - سرکار انگریزی میں درخواست دی گئی اور ان کی جاگیر بھی علاقہ فیروز پور جھرکہ میں شامل ہوگئی • قرار یہ پایا کہ ان پرگنوں کی آمدنی میں سے (۳) ہزار روپئے سالانہ مرزا نصراللہ بیگ خان کے پسماندوں کو اور دو ہزار روپئے سالانہ خواجہ حاجی خان کو ملا کریں - خواجہ حاجی کا انتقال سنہ ۱۸۲۶ ع میں ہوا - اور جو گزارہ ان کو ملتا تھا وہ ان کے دونوں نابالغ بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ امان پر بحال ہوا - اسداللہ خان غالب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ سرکار سے جو پرگنے دئے گئے تھے وہ دس ہزار سالانہ کی آمدنی تھے اور صرف ان کے چچا نصراللہ بیگ خان کو دئے گئے تھے - اس میں خواجہ حاجی خان کا خاندان زبردستی شریک ہوگیا ہے اور نواب احمد بخش خان بجائے دس ہزار سالانہ کے صرف پانچ ہزار سالانہ دے رہے ہیں چوں کہ ان کے دوسرے بھائی مرزا یوسف دیوانے تھے اور بہن کی شادی مرزا جیون بیگ خان کے بڑے لڑکے مرزا اکبر بیگ سے ہوگئی تھی اس لئے انہوں نے اپنی طرف سے اپنے دونوں بھتیجوں (خواجہ جان اوز خواجہ امان) پر دعوی دایر کر دیا - کول مرگ صاحب رزیڈنٹ دھلی اور اسٹر لنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ انگریزی نے تو ان کے موافق رپورٹ کی لیکن گور نر جنرل نے یہ تصفیہ کیا کہ یہ سند سر جان ملکم کے ھاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اس زمانے لارڈ لیک کے سکرٹری

• ملاحظہ ہو پروانہ نمبر ۳۲ بنام نواب احمد بخش خان مورخہ ۴ مئی سنہ ۱۸۰۶ ع

تھے اور اس کے متعلق نواب احمد بخش خان کی شہادت ہونی ضرور ہے کیوں کہ ان کے سامنے یہ مرتب ہوی تھی - اس لئے نواب کی شہادت اور سرجان میلکم کی رائے کے بعد اس کا کوئی قطعی فیصلہ کیا جا گا - چنانچہ اس کے متعلق نواب احمد بخش خان بہادر کی شہادت ہوئی - اور انہوں نے اصل واقعہ کا اظہار کیا - سرجان میلکم نے بھی اس کی تائید کہ یہ جاگیر پانچ ہزار سالانہ کی تھی اور اس میں سے تین ہزار روپیے سالانہ نصراللہ بیگ خان کے خاندان والوں کے اور دو ہزار روپئیے سالانہ ان دونوں نابالغوں کے ہیں - چنانچہ اسی رپورٹ پر مرزا غالب کے خلاف فیصلہ ہوا - یہ سنہ ۱۸۳۰ ع میں اس سلسلہ میں کلکتہ بھی گئے مگر بے نیل مرام واپس آئے - انہوں نے اس کا مرافعہ ولایت میں بھی کیا مگر وہاں بھی ان کے خلاف ہی نتیجہ نکلا -

اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ ع میں نواب احمد بخش خان کا انتقال ہوا - اور ان کی جگہ ان کے بڑے فرزند نواب شمس الدین خان * (جو ایک حرم کے بطن سے تھے) گدی پر بیٹھے - ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۳۵ ع کو ایک خانگی معاملہ میں انہوں نے دہلی کے رزیڈنٹ مسٹر فریزر † کو قتل کرادیا - ان پر مقدمہ چلایا گیا اور ۳ اکتوبر سنہ ۱۸۳۵ ع کو ان کو پھانسی دے دی گئی - اور اس جرم کی پاداش میں ان کی ساری ریاست سرکار نے ضبط کرلی - جب احمد بخش خان کے دوسرے فرزند (جو بیوی کے بطن سے تھے) نواب امین الدین خان اور خواجہ حاجی خان کے ورثاء نے غل مچایا کہ یہ کیا ظلم ہے کہ کرے کوئی اور جاگیر ہماری ضبط ہو تو اس

---

* انہی کے فرزند نواب مرزا خاں داغ تھے---

† یہ وہی سرون والے فریزر ہیں جن کے متعلق جاتوں میں مدتوں سے یہ گانا چلا ہے --- ع: کلکتہ سے چلا فریجن پانچوں پھر مٹا کے

وقت خدا خدا کر کے لوہارو نواب امین الدین خاں پر بحال ہوا۔ اور خواجہ جان کے نام پچاس روپئے، اور خواجہ امان کے نام پچاس روپئے اور خواجہ حاجی خاں کی بیوہ کے نام بیس روپئے ماہانہ جاری ہوے۔ اور اس طرح فیروز پور جھرکہ سے نہ نواب احمد بخش خاں کے خاندان کا کوئی تعلق رہا اور نہ خواجہ حاجی خاں کے پس ماندوں کا۔ جو پنشن اس جاگیر کے بدلے جاری ہوئی تھی اس کا یہ حشر ہوا۔ مرزا یوسف کے سنہ ۱۸۵۷ء میں مرنے کے بعد ان کی پنشن رک گئی۔ مرزا غالب کے بعد ان کی پنشن داخل سرکار ہوئی۔ خواجہ جان کا انتقال سنہ ۱۲۸۷ء میں ہوا تو ان کی رقم ضبط ہوگئی۔ والدہ مریں تو وہ رقم بھی گئی۔ ہاں خواجہ امان کے مرنے کے بعد ان کے فرزند خواجہ قمرالدین خاں کے نام پچیس روپئے مہینہ جاری ہوا۔ اور جب مارچ سنہ ۱۹۱۰ ع میں ان کا انتقال ہوا تو وہ جاگیر جو "نسلاً بعد نسل" اور "تاہ ورشمش و قمر" جاری ہوئی تھی وہ دوھی پشت میں ٹھکانے لگ گئی۔ خواجہ قمرالدین خاں کے فرزند خواجہ امیرالدین خاں نے دربار تاج پوشی کے موقعہ پر بادشاہ سلامت کی خدمت میں درخواست بھی دی۔ لیکن وہاں سے یہ جواب ملا کہ اب اس قدر عرصہ کے بعد اس کارروائی کو تازہ کرنا دوسری جاگیر کے دعویداروں کو بھی دعویدار بنا دے گا۔ ہاں چونکہ گورنمنٹ کی نظر میں تمہارے حقوق ہیں اور تمہارے خاندان نے ہمیشہ فوجی خدمات انجام دئے ہیں اس لئے اگر تمہارے خاندان کا کوئی شخص فوج میں آنا چاہے تو اس کے ساتھ خاص رعایت اور سلوک کیا جاے گا۔

خواجہ حاجی خاں کے بڑے فرزند خواجہ شمس الدین عرف خواجہ جان سنہ ۱۸۱۳ ع میں اور چھوٹے فرزند خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان سنہ ۱۸۱۷ ع میں بمقام

دھلی پیدا ہوے۔ ان دونوں نے دھلی ہی میں تعلیم پائی۔ وہیں جوان ہوے وہیں مرے اور وہیں دفن ہوے —

خواجہ جان نے شادی نہیں کی اور ساری عمر اللہ اللہ کرتے گذار دی ان کو جتنا عبادت الٰہی سے ذوق تھا اتنا ہی کسرت کا شوق تھا۔ دن بھر یا تو مصلے پر بیٹھے تسبیح پڑھتے یا ڈنڈ پیلتے رہتے تھے۔ رنگت ایسی سرخ و سفید پائی تھی کہ سورج مکھی کا دھوکا ہوتا تھا۔ فراش خانہ میں میٹھے کنویں کی گلی میں رہتے تھے۔ صبح ہوئی یہ اٹھے نماز پڑھی۔ ڈنڈ پیلے، بیٹھکیاں لگائیں، مگدر ہلاے، کپڑے پہنے اور باہر آ بیٹھے۔ اب ان کے دروازے پر لوگوں کا تانتا بندھا۔ میں نے بھی وہ مکان دیکھا ہے۔ دروازہ سے ملا ہوا ایک چبوترہ ہے اس میں بیٹھے رہتے تھے۔ کوئی ہے کہ اپنے بچے کو لئے چلا آ رہا ہے۔ انھوں نے کچھ پڑھا اور دم کردیا۔ کوئی ہے کہ تعویز لکھوانے آ رہا ہے۔ سامنے قلمدان رکھا ہے۔ انھوں نے حال پوچھا اور تعویز لکھ دیا۔ غرض یہ سلسلہ کوئی دن کے دس گیارہ بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس کے بعد یہ اٹھے، گھر میں گئے، کھانا کھایا، تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر وہی اللہ اللہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تعجب ہے کہ با وجود اس قدر متقی و پرہیزگار ہونے کے ان کو کتوں سے بڑی رغبت تھی۔ ان کی داشت ایسی کرتے تھے کہ شاید ہی کوئی اپنے بچوں کی بھی کرے گا۔ اور ان کے کتے بھی ایسے تمیزدار تھے کہ انسان بھی کیا ہوگا۔ رمضان کا مہینہ آیا اور خود بخود ان کے کتوں نے دن کا کھانا پینا بند کیا۔ اب ہزار ظلم کرو ممکن نہیں کہ کھانے پر منہ ڈالیں یا پانی کی طرف پھر کر دیکھیں۔ عید کا چاند ہوا اور انھوں نے یہ عادت چھوڑی۔ ان کے کتوں میں یہ ایک عجیب بات تھی کہ نہ تو اولچھا ہوتا تھا جیسے تازی اور مادہ ایسی للی سی ہوتی تھی

جیسے چھوٹی بلی۔ بھلا ممکن تھا کہ کوئی پالنے کے لئے ان سے کتے کا بچہ لے جاے۔ جب تک ان کو پوری طرح اطمینان نہیں ہوجاتا تھا کہ اس کو اچھی طرح رکھا جاےگا اور پوری طرح خدمت کی جاے گی اس وقت تک کبھی کسی کو کوئی بچہ نہیں دیتے تھے۔ فن موسیقی میں یہ یگانہ روزگار مانے جاتے تھے۔ دور دور سے گویے آتے۔ اپنی خاص خاص چیزیں ان کو سناتے، ان سے موسیقی کے نکات معلوم کرتے اور کچھہ حاصل کرکے ہی جاتے۔ یہ خود اپنے گھر سے بہت کم نکلتے تھے۔ کبھی پندرھویں بیسویں کسی عزیز یا دوست کے ہاں تھوڑی دیر کو ہو آے تو ہو آے نہیں تو خود بھلے اپنا گھر بھلا پر عمل کرکے دہلیز سے پاؤں باہر نہیں نکالتے تھے۔ ہاں عید بقر عید کو شاید ہی کوئی رشتہ دار یا دوست ہوتا ہوگا جس کے ہاں یہ نہ جاتے ہوں اور بچوں کو عیدیاں نہ دیتے ہوں۔

غرض اسی طرح اکیلے رہ کر انھوں نے ساری عمر گزار دی۔ چونسٹھہ برس کی عمر پاکر سنہ ۱۲۸۷ ھ مطابق سنہ ۱۸۷۰ ع میں اسی مکان میں انتقال کیا۔ اور قدم شریف کے باہر مغرب کی طرف جو نالہ اُترتا ہے اس کے پاس اپنی ہزوار میں دفن ہوے۔

خواجہ امان مرحوم خواجہ بدرالدین خاں سنہ ۱۸۱۷ ء میں دہلی میں پیدا ہوے۔ یہیں تعلیم پائی یہیں بڑے ہوے۔ اردو تو ان کی خاص زبان تھی۔ فارسی اور ترکی انھوں نے اپنے والدین سے سیکھی تھی۔ شرفاے دہلی کی صحبت میں رہ کر زبان اردو میں وہ صفائی اور پاکیزگی پیدا کی کہ خود دہلی میں ان کی تقریر اور تحریر کے سب قائل تھے۔ ان کا آنا جانا اپنے رشتہ داروں کے علاوہ حکیم 'مومن' خاں مومن کے ہاں زیادہ تھا۔ اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کی بھانجی کی شادی ان کے ماموں مرزا افضل بیگ خاں

سے ہوئی تھی - ان کو مثل عزیزوں کے سمجھتے تھے - مرزا غالب کی صحبت میں ان کو مئے نوشی کی عادت پڑی اور مومن خاں سے انہوں نے خوش پوشی و خوش لباسی حاصل کی - یہ اپنے زمانے میں دہلی کے وجیہ اور خوشرو لوگوں میں سمجھے جاتے تھے - کسرت کا شوق تھا - بدن بنا ہوا تھا - اونچا قد اور اس کے موافق ڈیل ڈول - شربتی غلافی آنکھیں اور خوبصورت پتلی ستواں ناک تھی - ہاں دہانہ اور نتھنے ذرا بڑے تھے - مگر سب کے سب اعضا میں مل ملاکر کچھ ایسا تناسب پیدا ہوگیا تھا کہ یہی جی چاہتا تھا کہ بس ان کو دیکھے ہی جاؤ - رنگ ایسا صاف اور چمکتا ہوا تھا کہ سفید ململ کے انگرکھے میں سے بدن جھم جھم کرتا تھا - گھر میں کرتا اور دوپلڑی ٹوپی پہن لیتے تھے - مگر باہر جاتے وقت ان کا لباس ذرا بدل جاتا تھا - سر پر مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی ہوتی تھی مگر بالوں کو نہیں دباتے تھے جسم پر باریک شربتی ململ یا موہن چکن کا انگرکھا - نیچے کرتہ ندارد - بغل میں انگوچھہ - شانہ پر سفید چوکور رومال - پہلے پاجامہ پہنتے تھے - لیکن الور میں جو گڑبڑ ہوئی اس وقت شاید کسی وجہ سے یہ پیجامہ چھٹ کر گھٹنوں تک رہ گیا - اب ان کی وضعداری دیکھیئے کہ مرتے مرگئے مگر سوائے گھٹنے کے کبھی اور کچھ نہیں پہنا - راجہ شیودان سنگھ والئی الور کے مرنے کے غم میں جو گیروا رنگ اختیار کیا تو پھر کفن ہی سفید پہنا - اس گھٹنے پر کبھی کبھی گیروا تہمد باندھ لیتے تھے - سلیم شاہی جوتی کا بڑا شوق تھا - مگر آخر میں گرگابی بھی پہننے لگے تھے - اگر کسی دربار میں جانا ہوا تو اس لباس میں یہ تبدیلی ہو جاتی تھی کہ سر پر چوگوشیہ ٹوپی کے اوپر سوا گز لمبا شالی رومال لپیٹ کر انگرکھے کے اوپر خفتان پہن لی جاتی تھی - ڈاڑھی گھنی اور بڑی تھی - آخر زمانے میں اکا دکا سفید بال آگیا تھا - اس کو نہایت احتیاط سے چنواتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر سفیدی بڑھی

تو ڈاڑھی مونچھیں سب صاف کرونگا - روزانہ دو وقت ڈاڑی چڑھا کر ڈھاٹا باندھنا لازم اور ضروری تھا - کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ ڈھاٹا باندھے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور کہیں راستہ ہی میں کھول کر جیب میں رکھہ لیا - یہی حال جرابوں اور دستانوں کا تھا - جاڑا زیادہ ہوا پہن لئے - گرمی معلوم ہوئی اتار پھینکے - ان کی کاٹھی ایسی اچھی تھی کہ مرتے دم تک نہ بینائی میں فرق آیا - نہ کوئی دانت اپنی جگہ سے ہلا - نہ کمر جھکی اور نہ قویٰ میں ضعف آیا - مزاق ایسا شستہ اور گفتگو ایسی برجستہ ہوتی تھی کہ لوگ گھنٹوں بیٹھے ان کی باتیں سنا کرتے تھے - اور دل نہیں گھبرا تا تھا - ہرفن مولا تھے - جس فن کی طرف طبیعت آگئی بس اس کے ہولئے - اس کی تکمیل کی اور چھوڑدیا - مرزا غالب ان کی اسی ہمہ دانی کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ " میرا برادرزادہ سعادت تو امان خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان کہ وہ ایک جوان شیریں بیان نیز ہرفن ہے اور ہرفن کے کمال کی تحصیل میں سعئی کش و سخت کوش ہے - ستار کا جو خیال آیا ایسا بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا - مصوری کی طرف جو طبیعت آئی وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھہ کر مانی و بہزاد کو حیرت ہوئی " اور سر مہدی مجروح فرماتے ہیں کہ "خواجہ صاحب ہرفن میں بے نظیر ہیں - ندیمی کا برتاو وہ ہاتھہ آیا ہے کہ ہر شخص کو اپنا آرزو مند بنایا ہے - امرا ملنے کی جستجو میں '' نقرا دیکھنے کی آرزو میں بسکہ مزاج آزادانہ ہے - ہر ہر ایک سے ملاقات بے تکلفانہ ہے - طبع موشگاف نے چند ہی روز میں یہہ یہ طولی بہم پہنچایا کہ مانی و بہزاد کو نقش دیوار بنایا " ستارنوازی میں وہ ہاتھہ تیار ہے کہ مضراب بے پر کی طیار ہے - صفائی و رنگینی وہ ہاتھہ آئی ہے کہ استادوں نے زانوئے ادب تہ کر کے



گردن جھکائی ہے ''' بھلا ایسے مجمع خوبی کیوں نہوں۔ آخر کس شہر لطافت بھر کے رئیس ہیں"

خیر ان صاحبوں نے تو جو کچھہ لکھا ہے وہ لکھا ہے مگر واقعی بات یہ ہے کہ ان کی طبیعت کچھہ ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ ہر فن کو بآسانی قبول کرلیتی تھی - مصوری میں یہہ دہلی کے مشہور مصوروں کے خاندان کے شاگرد ہوئے۔ اس خاندان میں محمد فضل مرحوم ایسے یگانہ روزگار مصور ہو گزرے ہیں کہ تمام عالم میں ان کے قلم کا سکہ بیٹھا ہوا تھا - ان ہی سے انہوں نے یہہ کام سیکھا - سیکھا، مشق کی، تکمیل کو پہنچایا اور چھوڑ دیا - ان کے فرزند خواجہ قمرالدین خان بھی اسی خاندان کے شاگرد ہوئے - شاید آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ دہلی کے مصور سوائے اپنے خاندان والوں کے یہہ کام اور کسی کو نہیں سکھاتے۔ کچھہ خواجہ امان مرحوم ہی کا خیال تھا کہ مجھے بھی محمد فضل مرحوم کے بھائی محمد عارف صاحب نے اپنا شاگرد بنالیا - میں نے اکثر استاد سے خواجہ امان کے متعلق دریافت کیا کہ مصوری میں ان کا ہاتھہ کیسا تھا۔ استاد مرحوم نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ" خواجہ صاحب نے غضب کی طبیعت پائی تھی - رنگ ایسا اور اس طرح لگاتے تھے کہ دیکھہ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ اگر واقعی وہ اس فن کو اپنا پیشہ بنالیتے تو دہلی تودہلی شاید ہندوستان بھر میں ان کی ٹکر کا کوئی مصور نہ نکلتا " اس وقت ہمارے خاندان میں ان کی بنائی ہوئیں تین تصویریں موجود ہیں - دو وصلی پر ہیں اور ایک ہاتھی دانت پر - وصلی کی ایک تصویر حکیم مومن خان مرحوم کی ہے اور میرے ہی ذریعہ سے اس کا بلاک بن کر رسالہ اردو میں شایع ہوچکا ہے - وصلی کی دوسری تصویر مرزا عاشور بیگ (۱۳) کی اور ہاتھی دانت کی تصویر ڈپٹی مرزاعباس بیگ (۲۰) کی ہے - ان کے علاوہ اور بھی کئی نامکمل تصویریں تھیں مگر تھوڑے دنوں سے وہ کہیں ادھر ادھر

هوگئیں هیں - بہت تلاش کرچکا هوں - خدا معلوم بچوں نے پہاڑ چیر کر برابر کردیں یا چوہے کہا گئے - مجھے چونکہ خود بھی اس فن میں کچھہ دخل ہے اس لئے آپ شاید میری اس رائے کو مان لیں کہ چہرہ کا رنگ ملانے اور قلم لگانے میں ان کا استادی هاتھہ هے - البتہ تصویر کی نشست پر ان کو پوری قدرت نہ تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے میں نے مومن خان کی تصویر میں ذرا هاتھہ لگاکر آج کل کے مذاق کے موافق کردی هے -

کہا جاتا هے کہ ستار بجانے میں هندوستان بھر میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا - بول ایسا بجاتے تھے کہ تار سے انسانی آواز نکلنے لگتی تھی - یہہ شوق ان کو بچپن سے تھا اور مرتے دم تک ان کے ساتھہ رہا - مومن خان کو خود ستار کا شوق تھا ان کی یہہ حالت تھی کہ خواجہ امان ان کے پاس گئے اور انہوں نے ستار ان کے سامنے لارکھا - جب تک دو ایک چیزیں سن نہ لیتے ان کو جانے نہ دیتے - غالب مرحوم کے وهاں تو ان کا روز آنہ جانا تھا - جہاں مرزا صاحب کا ذراجی کھبرایا اور انہوں نے کہا" میاں لانا اپنا ستار" ان دو جگہوں کے علاوہ ممکن نہ تھا کہ دهلی بھر میں کوئی ان سے فرمایش کر کے ستار بجوالے - مگر ان کے یار دوست بھی آخر دهلی والے تھے - ایک دو دفعہ نہیں - دس پندرہ دفعہ ان کا مقابلہ دهلی کے مشہور ستار بجانے والوں سے کرا هی دیا - اور انہوں نے سب کو همیشہ نیچا دکھایا - هاں لکھنؤ میں جو ان کا مقابلہ هوا - وہ انہوں نے محض اپنے جوش سے کیا - وهاں کے چند رئیسوں نے ان کے بھائی ڈپٹی مرزا عباس بیگ مرحوم (۲۰) سے کہا کہ همیں کسی طرح خواجہ صاحب کا ستار سنوادو - اور اگر ممکن هو تو یہاں کے استادوں سے ان کا مقابلہ بھی کرادو - مرزا عباس بیگ جانتے اور سمجھتے تھے کہ اگر بھائی سے صاف صاف کہا تو وہ قیامت تک ماننے والے نہیں - اس لئے ترکیب یہ

کی کہ ایک * جلسہ کرکے لکھنؤ کے روساء شہر کو مدعو کیا اور اسی میں وہاں کے چار پانچ مشہور استادان ستار کو بھی بلوایا - خواجہ امان مرحوم بھی وہیں تھے - جلسہ میں آبیٹھے - استادان فن نے اپنے کمال دکھانے شروع کئے لوگوں نے تعریفوں کے پل باندھنے شروع کئے - تعریفیں اور وہ بھی لکھنؤ والوں کی تعریفیں - ان لوگوں کو آسمان پر چڑھا دیا - خواجہ صاحب بیٹھے سنتے رہے - خدا معلوم کیوں ایک دفعہ ہی جوش آگیا - کہنے لگے ,, میاں عباس لاؤ ہم بھی بجائیں - مگر ہاں بھئی ایک شرط ہے - ہم اکیلے نہیں بجائینگے - ہمارا ساتھہ سب ملکر دیں ,, غرض ستار لایا گیا - انھوں نے ایک چیز چھیڑی - دوسروں نے ساتھہ دیا - تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ بجانے والے ان کا ستار سننے میں ایسے منہمک ہوے کہ سب کی انگلیاں تاروں پر جمی کی جمی رہ گئیں - جب انھوں نے خود ہاتھہ روکا اس وقت لوگوں کو ہوش آیا اور سب نے اٹھہ کر ان کے ہاتھہ چوم لئے - اب کیا تھا یہ ذرا اور کھلے اور بول بجانے شروع کئے - مرزا ساجد بیگ مرحوم (۲۱) کہا کرتے تھے کہ چچا خواجہ امان کا ستار یوں تو ہم ہمیشہ ہی سنا کرتے تھے - لیکن اُس روز تو میری بھی یہ حالت ہو گئی تھی کہ گویا کوئی روح بدن میں سے کھینچے لیتا ہے اور جلسہ کی یہ کیفیت تھی کہ گویا چینی کی مورتیں دم بخود بیٹھی ہیں —

میرے والد صاحب قبلہ (۳) کو ہمیشہ سے ستار بجانے کا شوق ہے وہ کہا کرتے ہیں کہ " میں نے ہندوستان کے لاکھوں تو نہیں ہزاروں ستار بجانے والے استادوں کو سنا ہے لیکن جو بات چچا خواجہ امان کے ہاتھہ

---

* - یہ جلسہ ٹپتی صاحب کی اس کوٹھی میں ہوا تھا جو قیصر باغ کے دروازہ کے بالکل سامنے تھی اور اب کھد کھدا کر سڑک میں آگئی ہے —

میں تھی وہ ایک میں نہیں دیکھی۔ خبر نہیں کیا بات تھی کہ اول بجانے میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بیٹھا دھیمے سروں میں گا رہا ہے۔ تانت میں سے تو انسانی آواز ضرور نکلتی ہے لیکن تار میں سے یہ آواز پیدا کرتے میں نے صرف چچا صاحب مرحوم ہی کو دیکھا "۔

ان کے ستار بجانے کا وقت رات کے کوئی آٹھ بجے کا تھا۔ کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ اور وہی وقت ان کے کھانا کھانے کا تھا۔ وقت آیا اور کمرہ میں ان کا ستار لاکر رکھ دیا گیا۔ یہ آکر بیٹھے۔ ان کے آتے ہی کشتی آئی۔ کشتی میں کیا ہوتا تھا۔ ایک شراب کی بوتل ایک شراب کا پیمانہ۔ ایک شیشہ کا گلاس۔ دو تین طشتریاں۔ کسی میں نمک مرچ میں تلے ہوے بھونے چنے۔ کسی میں دال موٹھ۔ کسی میں کباب یا تلا ہوا گوشت۔ انہوں نے سب سے پہلے شراب کی بوتل کھولی۔ ناپ کر کوئی ڈھائی تین تولے شراب نکالی۔ گلاس میں ڈالی۔ پانی ملایا اور اوپر کپڑا ڈھک دیا۔ اس کے بعد ستار اٹھایا کوئی چیز چھیڑی۔ اب ہیں کہ ستار بجا رہے ہیں اور ایک ایک چسکی گلاس میں سے لیتے ہیں، اور ذرا سے چنے یا دال موٹھ منہ میں ڈال لیتے ہیں یہ سلسلہ کوئی دو گھنٹہ تک چلتا تھا۔ ادھر گلاس ختم ہوا اور ادھر انہوں نے ہاتھ سے ستار رکھا۔ اس کے بعد کھانے پر بیٹھے۔ کھانا کھایا صحن میں ذرا ٹہلے اور پھر پڑکر سو گئے۔ ان کا یہ کہنا تھا اور ضبط کی انتہا تھی کہ جس مقدار سے انہوں نے شراب شروع کی تھی (یعنی کوئی تین تولہ) مرتے دم تک اس میں ایک قطرہ نہ زیادہ کیا نہ کم۔

راجاؤں اور رئیسوں کے مصاحب رہے۔ خود ان کے بعض دوست بڑے پینے والے تھے۔ ان کے چچا مرزا غالب کے ہاں اس کا زور تھا مگر ان کے

سبھ کو کوئی نہ توڑ سکا - اور کبھی کسی سے نہ ہو سکا کہ ستار سفر زہ سے زیادہ ان کو پلا دے یا دیکھا دیکھی یہ خود پی لیں —

ڈپٹی عباس بیگ مرحوم کے پاس یہ اکثر لکھنؤ جایا کرتے تھے - وہاں بھی شام کو یہی رنگ جمتا تھا - لکھنؤ کی مشہور طوائف مشتری جان کا تو یہ حال تھا کہ ادھر اس نے سنا کہ خواجہ صاحب آئے ہوئے ہیں اور ادھر شام کو وہ بن بلائے آ موجود ہوئی - یہ ستار لیکر بیٹھے اور اس نے نیچے سروں میں گانا شروع کیا - کوئی دو گھنٹے تک یہی صحبت گرم رہی - انہوں نے ستار رکھا اور وہ سلام کرکے رخصت ہوئی - جب تک یہ لکھنؤ میں رہتے ممکن نہیں تھا کہ شام کو مشتری کوٹھے پر نہ آ جاتی ہو —

دہلی میں ان کا ساتھ دینے کو خود ان کی رنڈی امیر جان موجود تھی - اس کی شکل تو ایسی تھی کہ دیکھ کر ڈر لگے مگر گاتی ایسا تھی کہ سبحان اللہ - نام کو تو یہ ان کی رنڈی کہلاتی تھی - مگر سوائے گانے کے اور کوئی تعلق ان سے نہیں تھا - شام کو آ جاتی - جب تک یہ شغل کرتے اور ستار بجاتے وہ آہستہ آہستہ گاکر ان کا ساتھ دیتی بعد میں اٹھ کر یا تو اپنے گھر چلی جاتی - یا وہیں ادھر اُدھر پڑ رہتی - اس کی تنخواہ اگر آپ سنیں گے - تو تعجب ہوگا خواجہ صاحب کے گھر سے روزانہ ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی بھر کر اس کے ہاں چلی جاتی تھی اور یہی اس کی تنخواہ تھی —

یہ بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی کہ پہلے زمانہ میں ہر بھلے آدمی کے پاس ایک نہ ایک طوائف کیوں نوکری رہتی تھی - اگر آج کل کوئی صاحب اس کا خیال بھی کریں تو گھر بگڑ جائے - معلوم ہوتا ہے کہ پہلے

زمانه میں یه عورتیں صرف رونق محفل کے لئے ملازم رکھی جاتی تھیں۔ اور اس کے علاوہ ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہی وجه تھی که اس زمانه کی بیویاں یه سب رنگ دیکھتی تھیں۔ اور منھه سے کچھه نہیں بولتی تھیں۔ یا شاید یه باعث ہو که اس زمانه میں گھر والیوں کا زور کم ہو۔ اور گھر بھر کے مالک میاں ہی میاں ہوں۔ بہر حال کوئی وجه بھی ہو۔ ہر محفل میں دو چار طوائفوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ خبر نہیں کیا بات تھی۔ که مجلس میں جتنی بھی طوائفیں ہوتی تھیں ان میں سے ہر ایک یہی چاہتی تھی که خواجه صاحب مجھه ہی سے باتیں کرتے رہیں۔ ان کی یه حالت تھی که سوائے خاص خاص طوائفوں کے جو آداب مجلس سے پوری طرح واقف اور گفتگو کا سلیقه رکھتی تھیں اور کسی کی طرف آنکھه بھر کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ بلکه بعض وقت تو ایسا ہوا ہے که کسی نے ان سے ذرا بیہودہ گفتگو کی اور انہوں نے وہیں بھری محفل میں اس کو دھتکار دیا۔ چنانچه دہلی کے مشہور رئیس ڈپٹی امیر علی صاحب کے فرزند کبیر علی کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ ڈپٹی سلطان خان مرحوم * کا مکان ایسا سجایا گیا که پرستان کا نمونه ہوگیا۔ بیسیوں رنڈیاں خدا معلوم کہاں کہاں سے بلوائی گئیں۔ نکاح کے بعد ہی ناچ ہورہا تھا که کسی بڑی طوائف سے خواجه صاحب نے کچھه پوچھا۔ اس نے ایسا جواب دیا جو آداب مجلس کے خلاف تھا۔ انھوں نے وہیں اس بیچاری کی مٹی پلید کردی۔ اور اس عورت سے لوگ ایسے متنفر ہوے که شرفاء میں اس کے مجرے بالکل موقوف ہوگئے —

---

* شجرہ میں جو نمبر (۱۱) ہے ان کے یه شوہر تھے۔ ان کی حویلی چوڑیوالوں کے محلہ میں ہے۔ اور اب خدا کی قدرت سے میں اس کا مالک ہوں۔

یہ سب بھائیوں میں میرے دادا مرزا عبداللہ بیگ * کو (۱۲) بہت چاہتے تھے - وجہ یہ تھی کہ دونوں ہم عمر اور ساتھ کھیلے ہوئے تھے - یہی ایک شخص تھے جن کو آکر یہ بوستان خیال کا ترجمہ سنایا کرتے تھے - ایک بھائی اصل فارسی کتاب لیتے - دوسرا ترجمہ لیتا - ایک پڑھتا دوسرا سنتا - کہیں درستی کی ضرورت ہوئی تو درستی کردی نہیں تو مسودے لے اور دونوں ٹہلنے نکل گئے -

ان کے گھر میں آنے کی کیفیت میری پھوپھی صاحبہ (۱) یوں بیان کرتی ہیں کہ ادھر عصر کی اذان ہوئی اور ادھر خیال ہوا کہ اب چچا آتے ہوں گے - کسی نہ کسی نے ان کا خاص حقہ تازہ کیا - بورا اور قالین کے برابر لے جاکر رکھ دیا - ہمارے ابا اٹھے - نماز پڑھی - ان کا حقہ بھی تازہ دم بھر کر قالین کے دوسرے طرف رکھ دیا گیا - تھوڑی دیر کے بعد دروازہ میں سے آواز آئی کہ "بھئی ہم آئیں" - ابا نے کہا - "آئیے - آئیے" - یہ سن کر انہوں نے بسم اللہ کہہ کر اندر قدم رکھا - اور سیدھے آ کے گاؤتکیہ سے لگ کر ہو بیٹھے - اتنی دیر میں ابا بھی نماز وظیفہ سے فارغ ہو آگئے - اب دونوں حقہ پیتے جاتے ہیں - باتیں ہوتی جاتی ہیں - ہماری اماں آئیں - اور سلام کرکے گاؤتکیہ کے ایک کونہ سے لگ کر ہو بیٹھیں - اب ہم لوگ ایک ایک کرکے آتے ہیں سلام کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں - کسی کی مجال نہ تھی کہ بغیر کہے پاس بیٹھ جائے یا بغیر پوچھے کوئی بات کرے - اس کے بعد بوستاں خیال کا ترجمہ پڑھنا شروع ہوا - جی تو بہت چاہتا تھا کہ ہم بھی جاکر سنیں - مگر بھئی ان کا وہ رعب تھا کہ میں تو میں بڑی آپا (۱۱) کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ پاس تک جا سکیں

---

* ان کا مکان محلہ چوڑیوالاں میں سگھیں والی گلی میں تھا -

وہ نہ ہمارے ابا کے حقہ کو منہ لگاتے اور نہ گھر کے کٹوروں میں پانی پیتے۔ کہا کرتے تھے کہ میرا منہ اس قابل نہیں ہے کہ تم لوگوں کی کسی چیز کو منہ لگاؤں۔ ان کا حقہ الگ تھا۔ اور پانی کا کاغذی آب خورہ الگ۔ پیاس لگی اور انہوں نے کسی کا نام لے کر پکارا۔ وہ گیا اور ان کا آب خورہ دھو دھلا کر صاف کیا۔ پانی بھرا۔ لے جا کر پلایا۔ اور پھر آب خورہ احتیاط سے الگ رکھ دیا۔ ابا کہا کرتے تھے کہ بھائی آخر اس سے فائدہ۔ کیا تمہارے پانی پینے سے کٹورے گندے ہو جائیں گے۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ میرا جی نہیں چاہتا کہ اپنا ناپاک منہ لگا کر تمہارے برتنوں کو خراب کروں ۔۔

خدا معلوم کیا بات تھی کہ انہیں سوائے مرزا غالب کے اور اپنی تمام ددھیال والوں سے نفرت تھی ہاں ننھیال کے بچہ بچہ پر جان دیتے تھے۔ میرے چچا مرزا عنایت اللہ بیگ صاحب (۲) کی لڑکی فرخ کو تو ایسا چاہتے تھے کہ شاید ہی دنیا میں کسی کو ایسا چاہتے ہوں۔ وہ تھی تو چار برس کی جان مگر ایسی خوبصورت تھی اور باتیں بھی اس طرح دماغ سے اتار اتار کر کیا کرتی تھی کہ بڑے بوڑھے بھی کیا کریں گے۔ یہ گھر میں گھسے اور آتے ہی کہا کہ فرخ کو بلاو۔ وہ بنی سنوری آئی اور پہلو میں ادب سے بیٹھ گئی۔ انہوں نے دو پیسے نکال کر اس کے ہاتھ میں دیے۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا اور پھر اسی طرح بھاری بھرکم بن کر بیٹھ گئی جب تک گھر میں رہتے نہ یہ خود اس کو کہتے کہ جاو اور نہ وہ خود جاتی۔ دو پیسے روز اس کے بندھے ہوئے تھے۔ کوئی سوا چار برس کی ہوگی کہ سیتلا نکلی اور اسی میں اس کا انتقال ہوا۔ مگر مرنے کے دن تک اسکے یہہ دو پیسے ناغہ نہیں ہوئے۔ خود انکو بھی اسکے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ بیان نہیں

هوسکتا - اس کے لئے ایسے روئے که روتے روتے هچکی بنده هوگئی یہانتک که
همارے هاں آنا جانا بھی گم کر دیا - اسکی زندگی میں انکی یہه حالت تھی
که جس سے ملتے اس لڑکی کی خوبصورتی کی تعریف کرتے اور کہتے که خدا
معلوم یه پری انسانوں کے هاں کیسے پیدا هوگئی هے - اگر کہیں خدانخواسته
کسی نے انکی بات کاٹ کر کسی دوسرے کے بچه کی تعریف کر دی تو بس
سمجھه لو که قیامت آگئی اس بری طرح خبر لیتے که تو به هی بھلی —
تھا یہه که حسن کے دلداده تھے اور بدصورتوں کو منه لگانا کیسا ان کے
دنیا میں رهنے کو بھی بے ضرورت سمجھتے تھے - خدا کی قدرت دیکھو که ان کے
هاں لڑکا پیدا هوا - بچارے کی کچھه واجبی واجبی هی سی شکل تھی - خاصه
کالا تھا - پھر کچھه نه پوچھو که ان پر کیا گزری کوئی وقت نه تھا که اس
کو نه کوستے هوں اور اس کے مرنے کی دعا نه مانگتے هوں - کہتے تھے که یه
اور میرا بیٹا کہلائے لوگ اس کو دیکھه کر یہی کہیں گے که خواجه امان
بھی اسی شکل کا هوگا - آخر کوستے کوستے اس بچارے کو ختم هی کردیا -
دو برس کا هوکر مرا - اس کے مرنے کے بعد هنستے هوے ایک دن آے اور
کہا که " لو بھئی - هم نے میاں کلو کو ٹھکانے سے لگا دیا " ان کے بڑے فرزند
خواجه قمرالدین خاں کا رنگ بھی کچھه زیاده صاف نه تھا - اس لئے ان سے
بھی کچھه زیاده رغبت نه تھی - هاں اپنی بیٹی (۲) اور دوسرے بیٹے
معزالدین کو بہت چاهتے تھے - کیوں که یه دونوں بہت خوبصورت اور ان کی
هم شکل تھے - اکثر میری بڑی پھوپی صاحبه مرحوم (۱۱) کے هاں بھی جایا
کرتے تھے - اور جب کبھی جاتے ان کے شوهر ڈپٹی سلطان خاں مرحوم سے کہتے
که " دیکھو بھئی سلطان خاں - میں تم سے یا اپنی بھتیجی سے ملنے نہیں آیا

میں تو اصل میں تمہاری حلال خوری نینو* کو دیکھنے آیا ہوں - اب یہ دوسری بات ہے کہ جب یہاں آگیا تو تم سے بھی دو باتیں کرلوں گا - اور اندر جاکر بھی سب سے مل آؤنگا -

ایک دن تو انہوں نے ایسا غضب کیا کہ سارے گھر بھر میں تہلکہ مچ گیا - اس قصہ کے بیان کرنے سے پہلے ذرا ہمارے گھر کا حال سن لو - جب مرزا جیون بیگ اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے مرزا افضل بیگ کا انتقال ہوگیا تو آمدنی کے سارے ذرایع بند ہوگئے - میرے دادا مرزا عبداللہ بیگ مرحوم سخت پریشان تھے کہ آخر اتنا بڑا کنبہ کیونکر چلیگا - آخر سوچتے سوچتے یہہ صلاح ٹھیری کہ دھلی کے رزیڈنٹ سے جا کر ملیں اور جو سارٹیفکیٹ مرزا افضل بیگ مرحوم کو ویسرائے نے دئے ہیں وہ دکھا کر کچھہ ملازمت کا انتظام کریں - چنانچہ یہہ اس کے پاس گئے - رزیڈنٹ نہایت مہربانی سے پیش آئے اور انبالہ سے لگاکر کانپور تک ڈاک گاڑی کا انتظام ان کو دیدیا - جابجا سینکڑوں ... چوکیاں قایم کی گئیں اور اس طرح ہمارے خاندان کی حالت سنبھل گئی - مرزا عبداللہ بیگ مرحوم اکثر ان چوکیوں کی دیکھہ بھال کے لئے جایا کرتے تھے - ایک دن کیا ہوا کہ وہ تو کوئل کی چوکی دیکھنے گئے ہوئے تھے اور دادا خواجہ امان آکر کہنے لگے " بھابی - بھابی - ہم تو سمجھتے تے کہ تمہارے میاں بڑے اللہ والے ہوں - مگر اب معلوم ہوا کہ یہہ جو روز روز گھر سے چلے جاتے ہیں اس میں بھی ایک راز ہے - دل جو میں شام کو آنے لگا تو کیا دیکھتا

* نینو حلال خوری کو میں نے بھی دیکھا ہے - ہمارے ہاں کمانے آتی تھی - واقعی بڑی خوبصورت تھی - کسی زمانہ میں لاکھوں میں ایک ہوگی اس کو مرکر ابھی تھوڑے دن ہوے ہیں -

ہوں کہ بھائی صاحب ایک طوائف کو لئے ڈاک گاڑی میں جارہے ہیں- میں نے ہاتھہ کے اشارہ سے روکنا بھی چاہا- مگر وہ ایسے وقت میں کیا رکنے والے تھے- نکلے چلے گئے، وہ تو یہہ کہہ رخصت ہوئے اور یہاں سارے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا- وجہ یہہ تھی کہ سارے خاندان بھر میں یہی ایک گھر تھا جس میں طوائف کا نام نہیں ... آیا تھا- اب جو یہہ حال معلوم ہوا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی- اور خیال ہوا کہ دیکھئیے آج یہہ ہوا کل کیا ہوتا ہے- خیر دن بھر تو اِدھر پوچھہ اُدھر پوچھہ میں گزرا- شام کو بچاری گھر والی ڈولی منگوا اپنی خالہ کے ہاں پہنچیں- ان سے تمام قصہ بیان کیا- انہوں نے بہت سمجھایا کہ مرزا دولہ خدا نخواستہ ایسا کیوں ہونے لگا- خواہ مخواہ یہہ خواجہ امان نے اشقلہ چھوڑا ہے مگر ان کی کسی طرح تسکین نہیں ہوئی- آخر یہہ قرار پایا کہ آج رات کو فال گوش لیں- ان کی خالہ کا مکان بڑیوں کے کٹرے کے نکڑ پر تھا- جب آدھی رات گئی تو خالہ بھتیجی دونوں اٹھیں- خالہ نے ڈوئی بغل میں دبائی بھتیجی نے منہ میں کلی لی- اور دونوں کی دونوں سڑک کے رخ جو بر آمدہ تھا اس میں چلمن سے لگ کر جا کھڑی ہوئیں خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اس وقت نئے بانس کی طرف سے دو آدمی باتیں کرتے آرہے تھے- ایک نے کہا کہ " میاں تم خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہو - وہ بچارا ایسا آدمی ہی نہیں ہے - بعض لوگوں میں مذاق کرنے کی عادت ہوتی ہے وہ صرف ستانے کو ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں " وہ تو یہہ کہہ کر فراشخانہ کی طرف مڑگئے- اور ان دونوں کو اطمینان ہوگیا- وضو کر کے اسی وقت دو نفل شکرانہ کے پڑھے- صبح یہہ اپنے گھر آئیں- شام ہوتے ہوتے مرزا عبداللہ بیگ بھی آگئے- اور ساتھہ ہی خواجہ امان

بھی آگئے - اور آتے ہی کہا کہ " بھائی کل میں نے بھابی سے ایک ایسی بات کہی تھی کہ کوئی دوسری بیوی ہوتی تو قیامت بپا کردیتی - مگر تمہاری بیوی نے کمال کیا کہ اس کان سنا اور اُس کان اڑادیا - بھائی تم ہو بہت خوش قسمت " اگر کہیں تمام واقعات کی ان کو اطلاع ہوجاتی تو خدا معلوم کیا کچھ مذاق نہ اڑاتے -

ان کی اولاد

ان کی شادی قاضی وارثہ میں قاضی محمد یعقوب صاحب کی بہن سے ہوئی تھی - جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے ان کا شجرہ اس طرح ہے

ستار قلیچ خاں

احمد یار خاں — محمد نعیم خاں

محمد امین خاں — دولت النساء بیگم زوجہ محمد امین خاں

قاضی محمد یعقوب خاں — سنگی بیگم زوجہ خواجہ امان

ان بیوی سے انکے ہاں تین لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی اور بے چاری غدر سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوئیں - بڑے لڑکے خواجہ قمرالدین خاں راقم عرف خواجہ مرزا خاں تھے جنہوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد انکی ترجمہ کردہ بوستان خیال جلد ہفتم کو طبع کرایا اور آخری جلد کا خود ترجمہ کرکے شائع کیا - یہ پہلے بہادر شاہ کے ہاں ملازم ہوئے - لیکن پھر وہاں سے الور اور الور سے جیپور چلے گئے -

ان سے چھوٹی لڑکی تھیں اور یہی اپنے باپ کی سب سے چاہیتی اولاد تھیں اس لڑکی کے بعد وہ لڑکا پیدا ہوا جسکو کوس کوس کر خود انہوں نے ختم کردیا - سب سے چھوٹے لڑکے معزالدین تھے - یہ ایسے خوبصورت تھے کہ دیکھنے سے



خواجہ قمر الدین خان عرف خواجہ مرزا خان مرحوم

نظر لگتی تھی - پڑھنے لکھنے کا انہیں بے انتہا شوق تھا - اسی زمانہ میں رڑکی کالج نیا نیا کھلا تھا یہہ وہاں جاکر داخل ہوئے - کئی برس تک گھر نہیں آئے - آئے تو اسطرح آئے کہ انجینیری کی سند پاس تھی - اور مرض دق ان کو ختم کر چکا تھا - چنانچہ آنے کے آٹھ روز بعد ھی باپ نے اس بیس سال کے جوان بیٹے کو پہلی منزل پہنچا دیا -

خواجہ قمر الدین خان کی شادی ان کے ماموں زاد بھائی مرزا عاشور بیگ (۱۳) کی لڑکی سنگی بیگم (۱۴) سے ہوئی - کچھ نہ پوچھو کہ بڑے میاں بہو سے کیسے ناراض تھے - کہا کرتے تھے کہ میرا ایک تو لڑکا رہ گیا ھے - بہو آئی ھے تو ایسی کہ لڑکیوں پر لڑکیاں جنے چلی جاتی ھے - آخر خواجہ حاجی خان کا نام کیسے چلیگا - خیر خدا خدا کر کے ایک لڑکا نور الدین پیدا ہوا - اور ہوا بھی ایسی اچھی شکل کا کہ دادا کا جی باغ باغ ہوگیا - ایک ملت کے لئے اس کو اپنے دم سے جدا نہیں کرتے تھے - نورالدین - نورالدین کہتے کہتے منہ خشک ہوتا تھا - نوکری کے سلسلہ میں خواجہ مرزا خاں جیپور چلے گئے - بچہ ساتھ گیا - اس زمانے کی حالت کچھ نہ پوچھو ہر وقت اسی کا ذکر کیا کرتے تھے کہ اب یہ کر رہا ہو گا اب یہ کر رہا ہوگا - آخر خط لکھ لکھ کر بیٹے کو بلا ھی لیا اس زمانے میں دھلی میں ہیضہ کا بڑا زور تھا - بچارے بچے نے آتے ھی ہیضہ کیا اور نو سال کی عمر میں اس جہان سے رخصت ہوا - غالب مرحوم نے اپنے ایک خط میں میر مہدی مجروح کو اس واقعہ کی اطلاع اس طرح دی ھے کہ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان معہ اپنے بی بی بچوں کے دلی آیا - کل رات کو اس کا نو برس کا بیٹا ہیضہ کر کے مرگیا - اناللہ وانا الیہ راجعون " اس کے تھوڑے ھی دنوں بعد ان کے ہاں دوسرا پوتا پیدا ہوا خواجہ امیرالدین نام رکھا گیا اور جو زخم نورالدین کے مرنے سے ان بچارے

کے دل میں پڑا تھا وہ کسیقدر مندمل ہوگیا - ۸ برس تک اس سے دل بہلا یا کہ خود دنیا سے رخصت ہوے - خدا کے کارخانوں میں کس کو دخل ہے - آدمی کچھہ سو چتا ہے - ہوتا کچھہ اور ہے - بیچارے خواجہ امان مرحوم کی آرزو تھی کہ لڑکا ہو اور باپ دادا کا نام قایم رہے - قسمت میں کچھہ اور لکھا تھا - خواجہ امیرالدین کی شادی ہوی - بچے ہوے - لیکن لڑکا کوئی بھی زندہ نہیں رہا - پانچ لڑکیاں چھوڑ کر انھوں نے بھی ۹ ذی‌الحجہ سنہ ۱۳۳۹ ھ (مطابق ۱۴ اگست سنہ ۱۹۲۱ م) کو انتقال کیا - اور اسطرح اس خاندان کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا - ادھر مرزا غالب کے لاولد فوت ہونے سے ترسم‌خاں کا خاندان باقی نہیں رہا - اور ادھر خواجہ امیرالدین کے انتقال نے رستم‌خاں کے سلسلہ کو ختم کردیا - سچ ہے " ہمیشہ رہے نام اللہ کا "-

اکثر اوقات | خواجہ امان دلّی کے کوچہ میں جو گھنٹہ گھر کے سامنے کمپنی باغ سے ملا ہوا ایک محلہ ہے رہا کرتے تھے - دو منزلہ مکان تھا - نیچے کے حصہ میں چھاپہ خانہ تھا - اوپر کی منزل میں خود رہتے تھے - اوپر کیا تھا - صرف ایک کمرہ اور اسکے سامنے سائبان ‘ صحن خاصہ تھا اور صحن کے ایک کونہ میں بیت الخلاء تھا - یہہ صبح ہی اٹھتے - پہلے نہائے - سائبان میں آکر بیٹھے - کسرت کی - ناشتہ کیا - چاء پی - داڑھی چڑھائی - ڈھاٹا باندھا - اور لکھنے بیٹھہ گئے - لکھنے کا یہہ سلسلہ کوئی بارہ بجے تک جاری رہا - اسکے بعد ذرا لیٹ گئے - اور ڈیڑھ بجے سے مطابع کی کاپیاں دیکھنی شروع کیں - تین بجے ان سے فراغت کرکے منھہ ہاتھہ دھوکر ۱۵ داڑھی چڑھائی - ڈھاٹا باندھا - اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے - تکلیں بنانے کا بہت شوق تھا - اسلئے ہاتھہ میں دو کانپیں اور ایک چاقو لیکر نکلتے تھے اور سارے رستہ کانپیں چھیلتے رہتے -

جہاں جا کر بیٹھتے - وہاں بھی یہ شغل جاری رہا - ان کے ملنے کے اوقات ایسے بندھے ہوئے تھے کہ جاڑا ہو یا گرمی - مینھ برستا ہو یا اولے پڑتے ہوں ممکن نہ تھا کہ ان کی جہاں اور جس وقت بیٹھک ہو وہاں نہ جائیں اور جتنی دیر وہاں ٹھیرنے کا معمول ہو وہاں اتنی دیر نہ ٹھیریں - یہی نہیں بلکہ یہاں تک پابند وضع تھے - کہ جس مقام اور جس مونڈھے یا چھت پر ایک دفعہ بیٹھے آخر وقت تک پھر اس کے سوا اور کہیں نہیں بیٹھے - لوگ [illegible] کو مخصوص جانتے تھے جب خواجہ صاحب آتے ہوں گے اور پہلے سے ان کی نشست کا مقام یا مونڈھا خالی کرا دیتے تھے - عصر کا وقت ہوا اور یہ اپنے بھائی مرزا عبداللہ بیگ کے ہاں آئے - تھوڑی دیر ٹھیر کر بوستان خیال کا ترجمہ پڑھا - اور دونوں بھائی سیر کو نکل گئے - مغرب سے پہلے پہلے دونوں کے دونوں اپنے گھروں کو واپس آ گئے - انہوں نے آ کر اپنے کپڑے اور [illegible] کو [illegible] دیا - کھانا کھایا - ذرا ٹہلے اور سو گئے - ان کی بہو کے مکان [illegible] - کھانا [illegible] سے پک کر آتا تھا - خود انہوں نے کبھی بیوی کے مرنے کے بعد ہنڈیا روٹی سے غرض نہیں رکھی —

جب تک ان کی والدہ زندہ رہیں ان کا ہمیشہ یہ دستور رہا کہ صبح اٹھ کر جاتے تھے - اور بہو کے ہاں اپنی والدہ کے سلام کو پہنچے - بڑی بی کو سلام کیا اور چھت کے ایک کونے پر بیٹھ گئے انہوں نے کچھ پوچھا تو جواب دے دیا - نہیں تو یوں ہی گردن جھکائے تھوڑی دیر بیٹھے رہے - اس کے بعد سلام کیا اور اٹھ کر چلے آئے - بزرگوں کے سامنے چھوٹوں کا بلا ضرورت کچھ بولنا یا کوئی بیہودہ بات منہ سے نکالنا ان کو سخت ناگوار ہوتا تھا - چنانچہ ہمارے ہاں ایک دن یہ ایسا بگڑے کہ خدا کی پناہ - ہوا یہ کہ میرے بڑے چچا مرزا عبدالصمد بیگ (۱۵) کی بیوی کی ایک لونڈی دولت مدام

خواجہ امان مرحوم

۲۹۴

تھی اس کا بیاہ ایک شخص سے کر دیا تھا - وہ ہمیشہ فتنیوں میں پڑا
رہتا تھا - اس کی یہ بات سب کو بری معلوم ہوتی تھی - ایک روز کیا
اتفاق ہوا کہ یہ بیٹھے تھے اور وہ بد معاش قدرو (قادر) دو تین دن کے بعد
آیا - میری پھوپھی صاحبہ اس پر خفا ہونے لگیں اور خانگی میں کہیں ان
کے منھہ سے لفظ "بھڑوا" نکل گیا - اب کیا تھا بڑے میاں بگڑ گئے - کہنے
لگے " ہیں - یہ کیا کہا اول تو میرے سامنے اس طرح اونچی آواز سے
بولنا اور پھر ایسا مکروہ لفظ منھہ سے نکالنا - کیا تمہارے بزرگوں نے یہی
تعلیم تم کو دی ہے - کیا شریفوں کی بہو بیٹیاں ایسی ہی باتیں کیا کرتی
ہیں " خیر وہ بیچاری تو ڈر کر کوٹھری میں جا چھپیں - مگر انہوں نے
وہ غل مچایا کہ خدا کی پناہ - کروروں ہی نصیحتیں کر ڈالیں - اور کسی
طرح ان کا غصہ کم نہیں ہوا - جب خدا خدا کرکے یہ رخصت ہوے اس وقت
جا کر وہ غریب کوٹھری میں سے نکلیں - اور گھر میں امن ہوا —
میں پہلے ہی لکھہ آیا ہوں کہ ان کو اپنی ننھیال والوں سے خاص انس
تھا - اور وہ اپنے ماموں زاد بھائیوں کو اپنے سگے بھائی اور ان کی اولاد کو اپنا
اولاد سمجھتے تھے - ان کی لڑکی حسن آرا بیگم کی شادی مرزا عبدالقادر بیگ
سے ہوئی تھی - یہ بھی تازہ وارد ترکوں کی اولاد میں تھے - مگر ا
تو غصہ ور بہت تھے دوسرے پردہ کا ان کو بیحد خیال تھا - شادی کے
انہوں نے اپنی بیوی کو سب سے چھپانا شروع کیا - اس کی اطلاع خ
صاحب کو نہیں ہوئی - ایک دن یہ اپنی لڑکی سے ملنے گئے اور اپنے بھ
مرزا عبدالصمد بیگ کو ساتھہ لیگئے - جب اندر جانے لگے تو وہ ذرا ٹھ
انہوں نے پوچھا کہ " ہیں یہ کیا " عبدالصمد بیگ نے کہا کہ " بھان
سے اب پردہ کرتی ہوں " یہ سننا تھا کہ رہوں سے لگے پاؤں پھرے

خداوندی نیابت کی بالیاں ... لیا اور سعد نیابت ... [illegible]

تیرے نصیب دون یار و اس وقت جو شخص محبت یار شدہ تھا اور صدق دل سے سجدہ کریگا مین اوسے حسب فرمان خداوندی اور اپنی نوازش و کرم سے اس

جو تمام زمین پر فلک مقام ذوالقار کا بعد مرگ وہ شخص باغ بہشت مین سیر کرتا رہیگا ورنہ جو بندہ درگاہ مرے سجود و اطاعت سے منحرف رہیگا اوس

نار جہنم نصیب ہوگی جسکا اثر شعلہ زن دیکھتے ہو ایسے شخص کو قیامت تک عذاب نار سے نجات دربار نہین ملیگا اے جمشید یقین ہے کہ جلد جادوین جلسہ

بیم و امید سے تیرے معتقد ہوجائینگے ہرگاہ تو اوس گفتگو کو تمام کریگا و شیاطین عالم غیب تخت و مرکب کو تیرے پاس ہو نمادینگے اور کرشمہ ظاہر کر

بعض بعض منحرف ہیں تیری شان و مرتبہ خداوندی کے قایل ہوجائینگے جب تو اس کام سے فارغ ہوگا بعض مردمان سخت دل [illegible] مطیع و عقیدہ کو کوفت

جبا ... اپنا مقصع فرمان کرتا کو ... کاریکہ زصلح بر نیاید دیوانگی درو بباید علاوہ ازین مخنشن و عمایین اپنا ہاتھ

دراز کرنا کہ مردمان عالم زر و مال کی حرص و طمع سے تیری اطاعت قبول کرین بعد ازان تو بلا وسواس و بلا شرکت غیرے فرمان روائی کرنا اور کو

خداوندی کا اے جمشید مین تجھے اس حال سے بہر گاہ کرتا ہون کہ شاہزادہ معز الدین ہنوز طلسم مین موجود ہے اور اوسنے تمام و کمال طبقات

طلسم کو مفتوح کرلیا ہے لیکن ایک حصار طلسم باقی رہا ہے وہ نقطہ ایک سہل عمل ہے و ابتہ زتمام ترتیب ترے وہ بہت جلد حل ہوجائیگا یہ بھی

کرونگی الحال چند روز معز الدین طلسم میں بیٹھا ہے باہر نہین آئیگا کسواسطے کہ اوسے انتظار کمک زر ... ہے بلکہ معز الدین مع حکیم ... کار دیکھ

تاجدار اسرار کا جشن عروسی اور تیاری ورازتیکے مقامات طلسم کی فکر مین ہمہ تن مصروف و سرگرم ہے [illegible] اور ابوالحسن جو ہمراہ معز الدین کا سر

اعتماد کی کہ معز الدین ابھی چالیس روز تک طلسم مین رہے اور لشکر میدان ... اے جمشید تجھے چاہئے کہ اپنا سرانجام کار تمام و کمال دس روز کی عرصہ

درست و مہیا کرلے ایک لمحہ تساہل نکر جمشید تمام [illegible] وقایع حویلی حصار جادو سے سنا اور بجان و دل اوسکی ہدایت و تلقین کو قبول

... کہ ایک ... ہزار ... دربار ... ملازمان ... دیکھا ہے

نمونہ خط خواجہ قمر الدین خاں عرف خواجہ مرزا خاں مرحوم

آکر داماد کو لکھا کہ اگر انھیں اپنے بھائیوں سے چھپاتی ہے تو مجھ سے بھی چھپے۔ یہہ خط و کتابت بہت دنوں تک ہوتی رہی - آخر جب وہ سب کے سامنے ہوئیں اسوقت انہوں نے انکے ہاں آنا جانا شروع کیا - لوگوں نے سمجھایا بھی کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو کسی سے چھپاتا ہے تو اس کو اختیار ہے - آپ کیوں خواہ مخواہ بگڑتے ہیں - اسکا جواب انہوں نے یہہ دیا کہ "اگر عبدالقادر کو اپنی بیوی پر اختیار ہے تو میں اپنی ذات کا مختار ہوں - میں نہیں ملتا کسی کا دینا آتا ہے :—

یوں تو یہہ مذہب کے پابند نہیں تھے - لیکن دو باتیں انکی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اول یہہ کہ انکو بزرگان دین سے خاص محبت تھی - دوسرے یہہ کہ ۲۷ - رمضان کو یہہ ضرور روزہ رکھتے تھے - اس زمانہ میں بغدادی صاحب دہلی میں خاص طور پر مرجع خلایق تھے - یہہ حضرت نظام الدین اولیا (رح) کی درگاہ کے قریب ایک مسجد میں رہتے تھے - حضرت غوث پاک کی اولاد میں تھے - اور انکی بزرگی اور بے تعلقی کے لحاظ سے ساری دہلی انکی معتقد تھی - خواجہ امان مرحوم کو ان سے خاص محبت تھی - اور بغدادی صاحب بھی انکو بہت چاہتے تھے - یہاں تک کہ اگر کوئی ان کی شکایت کرتا تو بغدادی صاحب فرمایا کرتے کہ "میاں ہمارے چھوٹے خوجم * کو کچھہ نہ کہو - اسکی آنکھہ کا شرم و لحاظ اس کے سب گناہوں کا کفارہ ہے - جو شخص اپنے برے اعمال پر نادم ہو وہ ایسوں سے بدرجہا بہتر ہے جس کو اپنی عبادت پر

* خواجہ جان کو تمام دہلی والے بڑے خوجم صاحب اور خواجہ امان کو چھوٹے خوجم صاحب کہتے تھے —

از ہو۔ " ان کی خود یہ حالت تھی کہ جب بغدادی صاحب کے پاس جا کر بیٹھتے اس وقت سے اٹھنے کے وقت تک آنکھ اونچی نہ کرتے۔ اور خود اپنے افعال پر ایسے نادم ہوتے کہ خود بخود آنسو ان کے رخساروں پر بہنے لگتے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی یعنی میری نانی اماں صاحبہ نے بغدادی صاحب سے کہا کہ "میاں صاحب مجھے والد کی طرف سے بڑی فکر ہے دیکھئے وہاں ان کی کیسی گزرتی ہے" بغدادی صاحب نے فرمایا "بی بی - اگر ایسے شرم و لحاظ والا آدمی بھی نہ بخشا گیا تو آخر بخشا کون جائے گا"۔

ان کے روزہ رکھنے کی یہ کیفیت تھی کہ ۲۷ رمضان المبارک دو ان کا روزہ کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اس دن روزہ بھی رکھتے اور پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھتے۔ مگر روزہ ہمیشہ دوسروں کے ہاں جا کر کھولتے تھے اور کہتے کہ "میں ایک روزہ کا ثواب لے کر کیا کروں گا یہ دوسروں ہی کو پہنچ جائے تو اچھا ہے۔ خیر میں تو جیسا ہوں ویسا ہوں۔ چلو مجھ گنہگار کی وجہ سے کسی دوسرے ہی کا کچھ فائدہ ہو جائے گا"۔

خبر نہیں یہ کیا بات تھی کہ ان کو بیواؤں کی شادی کرانے کا بڑا شوق تھا۔ سمجھاتے کوشش کرتے اور کسی نہ کسی طرح شادی کرا ہی دیتے۔ مگر دو عورتوں ان کو ایسی ملیں کہ انھوں نے ہزار کوشش کی لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ یہ کوشش کرتے کرتے مر گئے۔ اور انھوں نے نہیں سے ہاں نہ کی۔ ان میں ایک تو ان کے بھتیجے مرزا احمد بیگ (۱۹) کی بیوی تھیں اور دوسری ان کے بیٹے کی ملگیتر۔ ان کے بھائی مرزا عاشور بیگ اور ان کے بڑے فرزند مرزا احمد بیگ غدر میں بالکل بےگناہ شہید ہوئے۔ ان کی بیوی کی عمر کوئی ۲۰ سال کی تھی۔ جب خواجہ اماں دہلی آئے تو انھوں نے تقاضے شروع کئے کہ ایسی جوانی

بیوہ کو یوں بٹھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی شادی کرو جس گھر میں جوان بیوہ ہوتی ہے اس میں سوا پہر دن تک خون برستا ہے۔ لیکن اس لڑکی نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا۔ یہ جب جاتے اس لڑکی کو سمجھاتے گھر بھر سے کہتے کہ اس بیوقوف لڑکی کو سمجھاؤ۔ مگر ان کی ایک نہ چلی اور آخر وہ بیچاری بڑھاپے تک بیوہ رہکر رخصت ہوئیں۔ خواجہ امان کے چھوٹے فرزند معزالدین کی شادی جے پور والے حکیم سلیم الدین خاں کی بھانجی سے ٹھیری تھی۔ شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں کہ معزالدین کا انتقال ہوگیا۔ تمام گھر والوں نے ناک رگڑ لی مگر وہ لڑکی دوسری جگہ شادی کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوئی۔ اور اس مرنے والے کے نام پر مرتے دم تک بیٹھی رہی—

یہ خود تو سب سے الگ تنہا اپنے گھر میں رہتے تھے۔ اب ان کا سینا پرونا کرے تو کون کرے۔ اس کا انھوں نے یہ بندوبست کیا تھا کہ اپنے سارے کام خاندان والوں میں تقسیم کردئے تھے۔ کھانے کا تعلق بہو سے رکھا تھا۔ کرتے۔ دھاتے اور کھٹنے ہماری دادی * سیا کرتی تھیں۔ گھر کی ہر لڑکی کے ذمہ ایک نہ ایک کام تھا۔ کوئی بن دھنیا بناکر دیتی۔ کوئی چھالیہ کترکر دیتی غرض اسی طرح ان کے سب کام پورے ہوجاتے۔ البتہ ایک کام عجیب و غریب تھا اور وہ انھوں نے اپنی بہن (۱۶) کے ذمہ کیا تھا۔ ان کا کام تھا کہ ہر مہینہ سا تھہ موتی موتی روئی کی بتیاں بٹ دیا کریں۔ یہ بتیاں کوئی تین چار انچھہ لمبی اور خاصی موتی ہوتی تھی۔ اور اتنی بٹی جاتی تہیں کہ لکڑی جیسی سخت ہوجاتی تھیں۔ صبح ہوئی اور خواجہ امان مرحوم نے دو بتیاں ناک میں چڑھائیں۔

* شجرہ کے نمبر ۱۲ کی زوجہ —

ایسا دبا کر ناک میں چڑھاتے که ساری کی ساری بتی اندر اتر جاتی - معلوم نهیں که سانس کس طرح لیتے تھے مگر کوئی موسم هو ان بتیوں کا ناک میں سارے دن رهنا ضرور تها - رات کو سوتے وقت نکال دیتے تھے - ممکن هے که کوئی حکیم صاحب اس کا فائده بتا سکیں - هماری سمجهه میں تو خاک نهیں آتا - اگر حبس دم هی کرنا هے تو پھر منهه کهلا کیوں رکها جائے - بهر حال یهه واقعه هے اور راویوں میں کوئی اختلاف نهیں هے -

ریاست الور سے تعلق

چونکه خواجه امان مرحوم کا تعلق ایک عرصه تک ریاست الور سے رها هے اس لئے مناسب معلوم هوتا هے که اس موقعه پر وهاں کے بهی کچهه حالات لکهدوں تا که یهه داستان مکمل هو جائے -

الور منروکه راجپوتوں کی ریاست هے - اس کی بنیاد پرتاب سنگه نے ڈالی تهی - جو جیپور کا ایک بڑا ٹهاکر اور ماچیری کا جاگیردار تها - اٹهارویں صدی کے وسط میں یهه خود مختار هوگیا اور الور کا قلعه بهرت پور والوں سے چهین لیا - سنه ۱۸۰۲ع میں اس کا انتقال هوا - اور اس کا متبنی لڑکا بختاور سنگه گدی پر بیٹها - ۱۴ نومبر سنه ۱۸۰۳ع کو اس نے انگریزوں سے مدد دینے کا معاهده کیا - اور لارڈ لیک کے ساتهه هوکر لڑا - یهه وهی لڑائی هے جس میں مرزا نصرالله بیگ خاں خواجه حاجی خاں اور مرزا جیون بیگ خاں شریک تهے اور الور کی طرف سے نواب احمد بخش خاں مختار کل هوکر آئے تهے - اس وقت سے دهلی والوں کا زور الور میں شروع هوا - اور اسی وجه سے خواجه امان کا بهی بعد میں اسی ریاست سے تعلق هوا - سنه ۱۸۱۱ع میں بختاور سنگه کی انگریزوں سے بگڑ گئی کیونکه خلاف معاهده اس نے ریاست جیپور کے معاملات میں دخل دیا

شروع کیا تھا اور سنہ ۱۸۱۲ م میں جیپور کے قلعہ جات ڈھوبی اور سکراوا پر قبضہ کر لیا تھا - جب دھلی سے فوج اس کی سرکوبی کے لئے گئی - اس وقت اس نے ان قلعوں کو چھوڑا اور ۳ لاکھہ ھرجانہ بھرا - سنہ ۱۸۱۵ م میں بختاور سنگھ مر گیا اور اس کی جگہ بنے سنگھ اس کا نابالغ بھتیجہ گدی پر بیٹھا - لیکن دراصل ریاست بختاور سنگھ کے حرامی لڑکے بلونت سنگھ کے ھاتھہ میں رھی - اس کی مدد پر نواب احمد بخش خان تھے - جب بنے سنگھ بالغ ھوا تو اس نے نواب کے قتل کو آدمی بھیجے - لیکن یہ راز کھل گیا - اس پر اس نے بلونت سنگھ کو قید کر دیا - جب انگریزوں نے بلونت سنگھ کی رھائی کا مطالبہ کیا اور ساتھہ یہ حکم بھی دیا کہ جو لوگ نواب احمد بخش خان کو قتل کرنے کے لئے روانہ کئے گئے تھے ان کو حوالہ کیا جائے تو اس نے صاف انکار کر دیا - لیکن جب فوج بھیجی گئی تو اس کے اوسان جاتے رھے اور اس نے بلونت سنگھ کو رھا کرنے کا وعدہ کر لیا - یہ وہ زمانہ تھا کہ خواجہ امان مرحوم کا تعلق اس ریاست سے ھوچکا تھا - اور وہ بنے سنگھ کے فرزند راجہ شیوداں سنگھ کے اتالیق و مصاحب مقرر ھوگئے تھے - اس کے ساتھہ ھی بنے سنگھ نے یہ بھی کیا تھا کہ دھلی کے بعض شرفاء کو بلا کر اپنے ھاں نوکر رکھہ لیا تھا - اور انھوں نے ساری ریاست کا انتظام ٹھیک کر دیا تھا - بہر حال چھہ مہینے تک بنے سنگھ انگریزوں کو باتوں میں ٹالتا رھا - اس عرصہ میں غدر ھوگیا اور انگریز خود اپنی مصیبت میں گرفتار ھوگئے - غدر کے زمانہ میں خواجہ امان الور ھی تھے - اور دھلی سے جو ان کے خاندان والے بھاگے تھے انھوں نے بھی الور ھی میں پناہ لی تھی - جب غدر سے انگریزوں نے فراغت پائی تو انھوں نے پھر بنے سنگھ کا معاملہ ھاتھہ میں لیا - اور اس کو تخت سے اتار کر اس کے بیٹے شیوداں سنگھ

کو گدی پر بٹھا دیا ۔ یہ راجہ دہلی والوں پر عاشق تھا ۔ یہاں تک
ریاست کے کل سیاہ و سفید کا مالک کر کے جتنے بڑے بڑے عہدے تھے ۔
ان ہی کے سپرد کر دے تھے ۔ یہاں دہلی والوں میں سب سے زیادہ ز
بخشی انعام اللہ خاں منشی امو جان اور میاں تفضل کا تھا ۔ خواجہ ام
مرحوم نے نہ تو کبھی ریاست کے کاموں میں دخل دیا اور نہ کبھی ا
اختیارات بڑھانے کی کوشش کی ہاں یہ ضرور کیا کہ الور سے مرزا غالب
گزارہ مقرر کرا دیا ۔ اس کے علاوہ بس یہ تھے اور راجہ شیودان سنگ
دن رات اسی کی صحبت میں رہتے تھے اور وہ بھی ان کا ایسا گرو
تھا کہ ایک منٹ کو اپنے پاس سے جدا نہیں ہونے دیتا تھا د
والوں کا یہ زور دیکھ ریاست کے راجپوتوں کو بڑا غصہ آیا ۔ ا
انھوں نے سنہ ۱۸۵۸ ء میں بغاوت کر دی ۔ بغاوت ریاست کے خلاف تو نہ تھ
ہاں ان دہلی والوں کے خلاف تھی ۔ لڑائی ہوئی ۔ کچھ مارے گئے ۔
جان بچا کر وہاں سے بھاگے ۔ چنانچہ اسی واقعہ کے متعلق حکیم غلام نجف خ
کو مرزا غالب ایک خط میں یوں لکھتے ہیں کہ مرزا مغل (۱۲)
حقیقت بھالجہ کہ وہ منشی خلیل اللہ خاں مرحوم کا خویش ہے اس کی بی
اور شاید ایک دو بچے بھی ہیں ۔ اغلب ہے یہ امر کہ وہ بھی قاف
ساتھ ہوگا ۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو اس کا حال بالتفراد لکھئے ۔
جان اور خواجہ امان کی حقیقت بھی بشرط اطلاع ضرور ہی فرمائیے
پھر دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں " میاں یہ الور میں کیا فسا
ہوا ہے ۔ خدا خیر کرے ۔ واسطے خدا کے جو تم کو معلوم ہوا ہو ا

• یہ دہلی کے مشہور طبیب شفاءالملک حکیم رضی الدین خاں
کے دادا تھے ۔

معلوم ہو جائے اس سے مجھہ کو اطلاع دینا" غرض اس کشمکش میں سارے دہلی والے تو دہلی واپس آ گئے - مگر خواجہ امان وہیں رہے - اس وقت راجہ شیودان سنگھ کی عمر ۱۴ سال کی تھی - الور کی یہ حالت دیکھہ کر سرکار انگریزی نے وہاں ایجنسی قایم کردی - سنہ ۱۸۶۳ ع میں راجہ بالغ ہو گیا - اور اختیارات اس کے سپرد کردے گئے - لیکن کام پر نگرانی کو ۵ و سال کے لئے ایک پولٹیکل ایجنٹ مقرر ہو گیا - ایجنٹ کی مدت ختم ہونے کے بعد ہی راجپوتوں نے پھر فساد برپا کیا - اور اس مرتبہ خواجہ امان کو بھی الور چھوڑنا پڑا - پھر ریاست میں کونسل مقرر ہوئی اور اس کی راجہ سے خوب چلی - آخر اس جھگڑے میں اکتوبر سنہ ۱۸۷۴ ع میں اس کا انتقال ہو گیا - راجہ اپنے مرنے کی تاریخ تک خواجہ امان مرحوم کو نہ صرف گذارہ بھیجتا رہا بلکہ ہر شادی بیاہ کے موقعہ پر ان کے ساتھہ رقمی سلوک کیا کرتا تھا - اسی راجہ کی تحریک پر خواجہ صاحب نے بوستان خیال کا ترجمہ شروع کیا تھا اور اسی راجہ کے مرنے کے بعد سے انہوں نے گیروا لباس اختیار کیا تھا —

انتقال جیسا میں پہلے لکھہ آیا ہوں ایک روز یہ بیٹھے بوستان خیال کا ترجمہ کر رہے تھے کہ ان کے معدہ میں درد اٹھا - پہلے بھی یہ درد ان کو اٹھہ چکا تھا اور قولنج تجویز کیا گیا تھا - لیکن اس مرتبہ اس کے ساتھہ بخار بھی آ گیا - درد کم ہو گیا - مگر بخار میں زیادتی ہوتی گئی - مرزا عبداللہ بیگ رات دن بھائی کی خدمت میں لگے رہتے تھے - دہلی کے مشہور حکیم محمد حسین خاں جو ان کے بڑے گہرے دوست تھے ان کا علاج کرتے تھے - لیکن موت کا کیا علاج آخر وقت آ ہی گیا - اور ۱۴ شعبان سنہ ۱۲۹۲ ھ (مطابق سنہ ۱۸۷۹ ع) کو ۷۲ سال کی عمر پا کر دنیا سے رخصت

ہوے - اور اپنے بھائی کے پہلو میں جگہ پائی - مرتے دم تک ان کے ہوش و حواس قایم تھے - اور ہرگز یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ موت کا انھیں کوئی ڈر ہے یا تکلیف کا کوئی اثر ہے - شاید ذرہ میں کراہنا بھی انھوں نے اپنی وضعداری کے خلاف سمجھا ہو - مرنے سے تھوڑی دیر پہلے مرزا عبداللہ بیگ کو اپنے پاس بلایا - اور ان کو وصیت کی کہ سب سے میرا کہا سنا معاف کرادینا - اس کے بعد ہی توبہ کی اور ختم ہوگئے —

ان کی موت کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے - لوگ تو اس کو مذاق سمجھینگے - لیکن میں پوری تصدیق کے بعد اس کو یہاں لکھ رہا ہوں - ان کے پوتے اور پوتیوں پر ایک کھلائی نوکر تھی - حیات بی نام تھا - قلعہ کی رہنے والی تھی - مگر غدر کے بعد سے ان کے ہاں آپڑی تھی - اس گھر کے تمام بچوں کو اسی نے پالا تھا - آخر زمانہ میں اس کے دماغ میں کچھ خلل آگیا تھا - اور اس کو جاگتے میں بھی عجیب و غریب صورتیں دکھائی دیتی تھیں - خیر - جس زمانہ میں خواجہ امان بیمار پڑے اس وقت یہ ان کی بہو کے ساتھ فیض آباد گئی ہوئی تھی - خواجہ قمرالدین خاں بھی وہیں تھے - یہ سب لوگ مرزا محمود بیگ (۱۸) ڈپٹی کلکٹر فیض آباد کے وہاں ٹھیرے ہوئے تھے - ایک دن رات کے کوئی چار بجے ہونگے کہ حیات بی نے چیخیں مار مار کر رونا شروع کیا - سب لوگ اٹھ بیٹھے - پوچھا کہ " ہیں حیات بی آخر یہ کیا ہے " اس نے جواب دیا " بی بی - کیا کہوں چھوٹے خوجم صاحب مرگئے - سب نے کہا " بڑھیا - اپنی عقل کے ناخن لے - یہ ڈھچر کیا ہو گیا ہے - اگر ان کے بیٹے نے سنا تو وہ کیا کہینگے - بڑھیا نے کہا " بی بی - میں کچھ جھوٹ تھوڑی بولتی ہوں - ابھی ابھی مجھ کو فرشتہ آسمان پر لیگئے تھے - کیا دیکھتی ہوں کہ سینکڑوں آدمی یہ بڑی بڑی

قینچیاں لئے بیٹھے ہیں ۔ سامنے کاغذوں کا ڈھیر ہے ۔ کاغذ نکالا ۔ قینچی سے کاٹا اور ایک طرف پھینکدیا ۔میں نے کہا بھائیوں کیا میرا کاغذ بھی کٹ رہا ہے ان میں سے ایک نے کہا" چل بڑھیا ۔ ابھی تودو برس جئے گی" اتنے میں ایک صاحب نے ایک کاغذ نکالکر کہا کہ یہہ خواجہ امان کا کاغذ ہے ۔کیا کاٹ ڈالوں ۔ دوسرے نے کہا ہاں کاٹ دو۔ ان کی روح یہاں آچکی ہے ۔ یہہ سننا تھا کہ میں نے چیخ ماری ان لوگوں نے دھکے دیکر مجھے نکال دیا ۔ اے ہے ۔ خواجہ صاحب مرگئے ۔ یہہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی اور ایسی روئی کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا ۔ اتنے میں صبح ہوگئی ۔ ابھی لوگ ناشتہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ خواجہ امان کے مرنے کی اطلاع آگئی ۔ اور لطف یہہ ہے کہ یہہ بڑھیا پورے دو برس کے بعد مری ۔ جو واقعہ تھا وہ میں نے بے کم و کاست لکھدیا ۔ یہہ کیا بات تھی ۔ اور کیونکر ہوئی اس کا تصفیہ اب آپ کرلیجئیے۔

بوستان خیال

خواجہ امان مرحوم کا سب سے بڑا کار نامہ بوستان خیال کا ترجمہ ہے ۔ جن لوگوں نے کبھی ترجمہ کا کام کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خود کچھہ لکھنے سے ترجمہ کرنا بدرجہا مشکل ہے ۔ اس میں اصل الفاظ کا خیال رکھکر مضمون کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ محاورہ میں فرق نہ آئے ایک نہایت دشوار امر ہے ۔ اسی واسطے جب تک کوئی خاص ضرورت ہی پیش نہیں آتی کوئی بھی اس مشکل کام میں ہاتھہ نہیں ڈالتا ۔ میرا خیال تو یہہ ہے کہ شاید ہی کسی زبان میں بوستان خیال جیسی ضخیم کتاب کا کبھی ترجمہ ہوا ہو ۔ کام کی زیادتی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ امان مرحوم نے کل سات جلدوں کا ترجمہ کیا ہے ۔ طباعت میں اس کی تقطیع اور ہرصفحہ میں (۳۰) سطریں ہیں ۔ قلم خاصہ باریک ہے ۔ آج کل کتابوں کی جو تقطیع اور قلم ہے اگر اس پر

یه کتاب لکھی جاتی تو اس کا ایک صفحه کم سے کم چار صفحوں پر آتا - هر جلد میں تقریباً ۵۰۰ صفحے هیں گویا هر جلد کی ضخامت زمانه موجوده میں ۲۰۰۰ صفحے هوتی اور سات جلدوں کے کل ۱۴۰۰۰ صفحات هوتے - هے آج کل کسی میں همت جو اتنے بڑے کام کو شروع کرنے کا اراده بھی کر سکے - یه کچھه پہلے لوگوں هی کا دل گرده تها که جس کام کو هاتهه میں لیتے تھے اس کے متعلق یه نہیں دیکھتے تھے که آخر یه کیونکر نبڑیگا - محنت کرتے تھے - وقت کے پابند رهتے تھے - الله مشکل آسان کر هی دیتا تها -

خواجه صاحب مرحوم نے بوستان خیال کے ترجمه کرنے کی وجه جلد اول میں اس طرح بیان کی هے '' واضح هو که یه خاکسار خواجه بدرالدین خان عرف خواجه امان دهلوی عفی الله عنه مدت دراز سے سرکار الور میں ملازم تها - بحسب اتفاق اس سرکار عالیجاه میں پندره جلدیں بوستان خیال کی تمام و کمال ترتیب وار موجود تهی - یه فقیر اکثر اوقات ان جلدوں کو مستعار کتب خانه سرکاری سے لا کر دیکھتا تها - ایک روز آقائے نامدار یعنی راجه راجگان سر دفتر قوم راجپوتان قدر دان هر علم و فن زینت بخش انجمن شعر و سخن - خورشید اوج حشمت و تاجداری رونق افزائے اکلیل ریاست و کامگاری سر خاب عدل و انصاف هزبر عرصهٔ جنگ و مصاف مهاراج دهیراج سر مهاراو راجه شیودان سنگه بهادر دام اقبالهم و ادام الله حشمتهم نے فرمایا - هماری مرضی مبارک هے که جس طرح میر تقی نے پندره جلدیں بوستان خیال کی زبان فارسی میں تصنیف کی هیں تو بهی بزبان اردو ابتداء سے آخر تک ان جلدوں کا ترجمه کر تاکه هم چهپوائیں اور تمام عالم میں شایع کریں که بیشتر علوم کی کتابیں عربی و فارسی وغیره زبان کی چهپیں - بجز اس کتاب لا جواب کے که یه اب تک به باعث کمیابی مشتہر نہیں هوئی - اس خاکسار بیهوده زبان هرزه بیان

نے حسب الارشاد ولی نعمت اس فسانہ کا ترجمہ شروع کیا - لیکن چونکہ مشیت ایزدی و تقدیر ربانی میں انجام ترجمہ ہونا اور اپنا ترجمہ نگار کو اس سرکار عالی سے اپنی عرق ریزی اور جگر خواری کا انعام و عطا پانا جاری نہ ہوا تھا فقط یہی دو جلدیں معزالدین نالہ کہ طلسم اجرام و اجسام سے مراد ہیں ترجمہ ہوئی تھیں کہ ناگاہ گردش روزگار غدار و زبونی طالع ترجمہ نگار سے ایک فتنہ عظیم سرکار الور میں برپا ہوا - اور ہر ایک ملازم قدیم چاشتہ خوار خوان نعمت وظیفہ مقرری سے معرض تخفیف میں آیا —

ترجمہ کرنے میں مترجم نے دو باتوں کا خیال رکھا ہے - اول یہ کہ محاورہ ہاتھ سے نہ جائے دوسرے یہ کہ جو عبارت فارسی میں ہے وہ بلا کم و کاست ترجمہ میں آ جائے - چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ "یہ طرز طبیعت نے قبول نہیں کی کہ افسانہائے مشہور و مروج کی مانند کچھ تک اور جگت سے زبان کا لطف ظاہر کرے - اور ایک ترکیب نامطبوع یا مطلب سامعہ خراش سے کتاب کو بھر دے - ہاں جن صاحبان تصانیف قصص کے ہاتھ مطلب خوشنما و دلچسپ نہیں آتا وہ ایسی ہی تمہید سے قصہ کو طول دیتے ہیں اور اس طرز کو خوش بیانی اور جودت زبان پر محمول کرتے ہیں ... اگر یہی لہجہ رندانہ اور یہی تقریر قلندرانہ اہل تکیہ کی مطبوع و مرغوب طبع ہے تو خیر - مصرع - گزشتم - از سر مطلب تمام شد مطلب ... بے شبہ جو اہل شہر کہ پابند زبان خاص کے ہیں خصوص اہل دہلی - وہ ایسے الفاظ غیر مربوط و گفتگو عوام سے حتی الوسع زبان کو باز رکھتے ہیں ... البتہ اس زبان اور اس تمہید کے افسانہائے بے سروپا سے وہی انسان خوش ہوتے ہیں اور ایسی ہی ہزلیات کے سلسلے کے مشتاق رہتے ہیں، کہ جو علم سے بہرہ

نہیں رکھتے - حاصل کلام جس تحریر یا تقریر میں آورد و ساختگی کا دخل ہوگا اور آورد بھی وہ کہ کوئی لفظ تک سے خالی نہ ہو بلا ریب وہ زبان اہل زبان کے نزدیک زبان حرام ہے - سوائے اس کے اس طرح کی تک بندی و زبان درازی الہی افسانوں کے واسطے لایق و خوشنما ہے جن کی تمہید ایسی ہوتی ہے کہ ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ خدا کا رسول بادشاہ - چڑیا لائی مونگ کا دانہ - چڑا لایا چاول کا دانہ - دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی - جس طرح کہ دایہ بچوں کے روبرو کہانیاں کہتی ہے بجلسہ ان افسانوں کی بھی ابتداء سے یہی صورت ہے نہ کہ یہ قصہ سر دفتر قصص - اگر احیاناً قصداً اس کے ترجمہ میں سوائے بیان مصنف کے کچھ بھی جودت طبع کی جاتی حسن قصہ ہرگز باقی نہ رہتا - خاکسار نے ترصیع بیان و درازی زبان سے قطع کی اور اہل دہلی کے روز مرہ کا مقلد ہوا - لیکن وہ روز مرہ کہ جو خاص صحابہ و اعزہ شہر کے بے تکلف و بلا تصنع استعمال میں ہے "

اسی ضمن میں انھوں نے مختصراً ان اصولوں کا بھی ذکر کیا ہے جو افسانہ نگار کو افسانہ لکھتے وقت پیش نظر رکھنے چاہئیے - تاکہ قصہ کے ختم تک پڑھنے والوں کا دل اچاٹ نہ ہو - اور جو دلچسپی ابتدا قصہ میں قایم ہوئی ہے وہ آخر تک باقی رہے - اس جزو کو بھی میں یہاں نقل کئے دیتا ہوں تاکہ مضمون کے فائدہ کے علاوہ خواجہ امان مرحوم کی طرز تحریر اور اسلوب بیان بھی قارئین کرام کے دل نشین ہو سکے - فرماتے ہیں کہ "نفس قصص و افسانہ کے واسطے چند مراتب لازم و واجب ہیں - ورنہ مضمون بے سر و پا سے کہ جس کی ابتدا و خبر کا پتہ نہ لگے سامعین و ناظرین قصہ ضرور بے لطف ہوں گے - کچھ مزا نہیں آنے کا - اول مطلب مطول و خوشنما جس کی تمہید و بندش میں تواردہ مضمون و تکرار بیان

نہ ہو - اور مدت دراز تک سامعین مشتاق رہیں - دوم بجز مدعاے خوش ترکیب و مطلب دلچسپ کوئی مضمون سامعہ خراش و ہزل مثل تعریف باغ و کوہستان یا مکان و آرایش مکان درج نہ کیا جاے - اور بیشتر اہل تصانیف قصص اسی مضمون بیہودہ سے افسانہ کو طول دیتے ہیں - سوم لطافت زبان و فصاحت بیان چہارم عبارت سریع الفہم کہ واسطے فن قصہ کے لازم ہے - پنجم تمہید قصہ میں بنجسہ تواریخ گزشتہ کا لطف حاصل ہو - نقل و اصل میں ہرگز فرق نہ ہو سکے یعنی صاحبان تصانیف قصص کو اس امر کا لحاظ ضرور ہے کہ اپنی تمہید خیالی کو بدلائل و براہین واقعہ اصلی کی طرز سے بیان کریں"

پہلے ہندوستان کیا ساری دنیا میں جو کتاب لکھی جاتی تھی اس میں زیادہ حصہ مکانوں اور مقاموں کی کیفیت بیان کرنے میں صرف ہو جاتا تھا - چنانچہ رینلڈز کے جو ناول ہیں ان سے میرے اس بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے - اب خدا خدا کر کے اس چیز میں کمی ہو رہی ہے - اور صرف ضرورت کے لحاظ سے ان باتوں کا تھوڑا سا ذکر مضمون میں کیا جاتا ہے - کیونکہ اس بے جا طوالت و لفاظی سے پڑھنے والا پریشان ہو جاتا ہے - اور داستان کا جو سلسلہ اس کے دل میں جمتا ہے وہ ان بے ضرورت حالات کی وجہ سہو ہو جاتا ہے - میں اس کا تو ہرگز قائل نہیں کہ ایسے امور کا ذکر ہی نہ کیا جاے - کیونکہ بغیر اس کے نہ تو اس زمانہ کی معاشرت کا پتہ چلیگا اور نہ قصہ کے آدمیوں کے حرکات و سکنات پوری طرح سمجھہ میں آئیں گے اور اس طرح جو نقش دلوں پر بیٹھے گا وہ بہت نامکمل ہو گا - لیکن میں کیا اب تو ساری دنیا کی راے ہے کہ فضول باتوں سے کسی داستان کا حجم بڑھانا اس کی اصلی خوبی کو ضایع کر دیتا ہے —

بہر حال ان تمام امور کو پیش نظر رکھہ کر خواجہ امان مرحوم نے

بوستان خیال کا ترجمه شروع کیا اور پہلی جلد (جس کے فارسی میں دو حصے تھے) کا ترجمه سنه ۱۲۷۵ھ (مطابق سنه ۱۸۶۶ م) میں یه کتاب پہلی مرتبه اکمل المطابع دهلی سے رضا خاں کے اهتمام سے طبع هوکر نکلی۔ اسد الله خاں غالب نے دیباچه لکھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ناصر الدین حیدر خاں نصرت جنگ جیسے لوگوں نے تقریظیں لکھیں۔ اور سالک اور رضوان جیسے شعراء نے تاریخیں لکھیں۔ غالب مرحوم نے تو یہاں تک کیا که اپنے دوستوں اور شاگردوں کو اس کتاب کے خریدنے کی دعوت دی چنانچه نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو لکھتے هیں که " خواجه بدرالدین خاں میرے بھتیجے نے بوستان خیال کو اردو میں لکھا هے۔ اس کا ایک اشتہار اور یہاں ایک اخبار نیا جاری هونے والا هے اس کے دو اشتہار اس خط کے ساتھ بھیجتا هوں۔ آپ یا آپ کے احباب میں سے کوئی صاحب کتاب کے یا اخبار کے خریدار هوں تو اشتہار کے مضمون کے مطابق عمل میں لائیں " غالب کو داستان سننے اور پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ پڑھنے کی کیفیت تو ان کے ایک خط سے معلوم هوتی هے جو انہوں نے میر مہدی مجروح کو لکھا هے۔ لکھتے هیں که " مولانا غالب علیه الرحمة ان دنوں میں بہت خوش هیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزه کی داستان اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی هے۔ ستره بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانه میں موجود هیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے هیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے هیں —

کسے کیں مرادش میسر بود اگر جم نباشد سکندر بود "

اور سننے کا یه حال تھا که هر جمعرات کو شام کے ۹ بجے سے ۳ گھنٹه تک ان کے هاں داستان هوتی تھی۔ یار دوست جمع هوتے۔ بچوں کو بھی

بلا لیا جاتا۔ خود سنتے دوسروں کو سناتے۔ سمجھاتے اور کہا کرتے کہ میاں دھلی کی زبان انہوں داستان کہنے والوں کے ھاتھہ میں ھے۔ ان مجلسوں میں میرے چچا مرزا عنایت اللہ بیگ (۲) اکثر شریک رھے ھیں۔ ان کا بیان ھے کہ اگر کسی وجہ سے میں نہیں جاتا تھا تو زبردستی آدمی بھیج کر مجھے پکڑوا بلاتے تھے اور جب تک داستان ختم نہیں ھوجاتی تھی۔ نہ اٹھنے دیتے تھے اور نہ سونے دیتے تھے۔ داستان گو پر ظاہر تھا کہ بوستان خیال یاد کر وہ تیار ھوکر آتا تھا۔ لیکن پھر بھی بڑے میاں کی یہ حالت تھی کہ وہ ذرا بہکا اور انہوں نے ٹوکا۔ جہاں کہیں طلسم میں نجوم۔ طب یا ایسے ھی کسی فن کی بات آئی۔ اور اس کے سمجھنے یا سمجھانے میں داستان گو کو دقت پڑی اور انہوں نے سلسلہ کلام خود لے لیا۔ بہر حال بڑی پاکیزہ محفل ھوتی تھی اور بہت سے علمی اور فنی نکات وہاں معلوم ھوجاتے تھے—

اس کتاب کے تسلسل داستان۔ لطف بیان اور خوبی زبان نے پڑھنے والوں کے دلوں پر ایسا اثر کیا۔ اور فرمایشوں کا وہ زور ھوا کہ جلد اول کو دوبارہ چھپوانا اور جلد دوم کو جلدی تیار کرنے کے لئے خود مطبع کھولنا پڑا۔ چنانچہ مطبع بدرالدجی قایم ھوا اور بوستان خیال کی جلد دوم سنہ ۱۲۸۳ ھ (مطابق سنہ ۱۸۶۶ ع) میں چھپ کر ھاتھوں ھاتھہ نکل گئی۔ لیکن کچھہ عجیب بات تھی کہ جس کسی رئیس کے نام پر اس کو معنون کیا گیا۔ وہ تھوڑے ھی دنوں بعد اس دنیا سے رخصت ھوا۔ غالب مرحوم کے قصیدے کا بھی یہی اثر تھا۔ چنانچہ انہوں نے چودھری عبدالغفور المتخلص بہ سرور کو لکھا ھے کہ "کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دھلی اور اسٹر لنگ صاحب بہادر سکرٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ھوے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ھوگئے۔ سکرٹری گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مرگئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دھلی نے

پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا ان کے ولی عہد نے چار سو روپئے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودہ کی سرکار سے بصیغہ مدد گستری پانسو روپئے سال مقرر ہوے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئیے ... دہلی کی سلطانت کچھہ سخت جان تھی - سات برس مجھہ کو روٹی دے کر بگڑی - ایسے طالع مرس نش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں - یاد رہے کہ متوسط یا مرجائے گا یا معزول ہو جائے گا - اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھہ کو کچھہ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔"

خواجہ امان بھی آخر غالب کے بھتیجے تھے - ان کو بھی اس قسمت میں برابر کا حصہ ملا تھا - چنانچہ جلد پنجم کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "گو یہ بیہودہ سرا تحریر و تقریر سے عاجز نہیں ہے اگر صرف کثیر ہمت پست کئے دیتا ہے - اس قلیل الاوقاتی میں ہر جلد تالیف جدیدہ کی ترتیب کا کس طرح اور کہاں سے سر انجام کیا جاے - مزید برآں مکروہات چند در چند زمانہ و افکار بالائی جدا منتشر الحواس کئے دیتے ہیں - یعنی جس رئیس قدر دان جوہر شناس کا دامن دولت وسیلہ جگر کاوی کرد اتے ہیں اور بہزار سعی و جہد ایک سرکار اعظم سے توسل و تعارف پیدا ہوتا ہے - یہ فلک بے مہر و نا انصاف اسی کو خاک میں ملا دیتا ہے اور اسی کے ساتھہ ہمارے بڑی تمام خیالات دور و دراز خاک میں مل جاتے ہیں - یہ شکایت بجز شومی بخت و سختی ایامی کس سے کی جاے اور اس شکایت بے سود سے کیا ہوتا ہے" ---

کچھہ یہی دقتیں تھیں کہ جلد اول کے شایع ہونے کے تقریباً دس برس

بعد جلد پنجم سنہ ۱۲۹۲ ھ (مطابق سنہ ۱۸۷۶ ء) میں نکلی - چھٹی جلد ذرا جلد طبع ہوگئی - مگر ساتویں جلد کے مسودے چوری گئے - اور پھر نئے سرے سے اس حصہ کا ترجمہ کرنا پڑا - ترجمہ کی نظر ثانی بھی نہیں کی تھی کہ وقت موعود آگیا - اور اس جہان فانی سے رخصت ہوئے ان کی بیٹی (۷) کہا کرتی تھیں کہ والدصاحب قبلہ بیٹھے بوستان خیال کی ساتویں جلد کا ترجمہ کر رہے تھے کہ کوئی دن کے دس بجے سینہ میں؟ ایسا درد اٹھا کہ بیچین ہوگئے - وہیں قلم رکھہ دیا - پلنگ پر جا لیٹے اور ایسے لیٹے کہ پھر سر کر ہی اٹھے - آخری الفاظ جو ان کی قلم سے نکلے یہ تھے کہ " بس اب تم " گویا یہ اپنے فرزند کو وصیت تھی کہ اب تم اس کام کو پورا کرو چنانچہ انہوں نے اس جلد کو تمام کرکے اور نظر ثانی کرکے سنہ ۱۳۰۰ ھ (مطابق سنہ ۱۸۸۳ ء) میں چھپوایا اور آٹھویں جلد کو بھی انہوں ہی نے مکمل کیا - ان کتابوں کی مانگ کچھہ ایسی زیادہ تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خود ان کے گھر والوں کے پاس ہر اس کا ایک ہی نسخہ رہ گیا - اور وہ بھی اب پھٹ پھٹا کر برابر ہوچکا ہے - ابھی تھوڑے دن کی بات ہے کہ ریاست رامپور کے کتب خانہ کو ان جلدوں کے خرید نے کی ضرورت ہوئی تھی - اشتہار دئے گئے - مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے پوری جلدیں دستیاب نہیں ہوئیں - اگر ہم لوگوں کے پاس ان کی کوئی یادگار رہگئی ہے تو وہ ان کے قلم کے لکھے ہوئے بوستان خیال کے مسودات ہیں - خواجہ قمرالدین خاں راقم یعنی ان کے فرزند نے اپنے مرنے سے پہلے اپنی اولاد میں یہ مسودے اس طرح تقسیم کئے تھے کہ اپنے بیٹے (۸) کو چار جلدیں اور بیٹیوں (۶ و ۹) کو دو دو جلدیں دی تھیں - ان جلدوں میں سے بھی ایک صاحب نئے

جلدیں دوسروں کو دکھانے کے لئے لے گئے تھے - وہ خدا معلوم کہاں غارت کردیں - اب صرف ۵ جلدیں یعنی جلد اول سیوم و ششم خواجہ امان مرحوم کے قلم کی اور جلد هفتم و هشتم ان کے فرزند کے هاتھ کی لکھی هوئی رہ گئی هیں - دیکھئے یہ کب تک رهتی هیں اور ان کا کیا حشر هوتا هے —

بوستان خیال کی مانگ یہاں تک بڑھی کہ بعض تاجر پیشہ لوگوں کو بھی اس کے چھپوانے کا خیال هوا - چونکہ اس کتاب کی رجسٹری هوچکی تھی اس لئے پہلے خود ان سے اور ان کے فرزند سے اس کے طبع کرنیکی اجازت چاهی - جب انہوں نے اجازت نہ دی تو پھر اس کے سواء اور کیا هوسکتا تھا کہ کسی دوسرے سے اس کا ترجمہ کرایا جائے - سب سے پہلے بسم‌اللہ لکھنؤ سے هوئی - وهاں کے ایک رئیس مرزا محمد عسکری صاحب عرف چھوٹے آغا صاحب نے مہدی نامہ کا ترجمہ کرکے سنہ ۱۲۹۷ ھ (مطابق سنہ ۱۸۸۰ ع) میں مطبع نولکشور میں چھپوایا - یہ بالکل جدید ترجمہ هے - وجہ یہ هے کہ خواجہ امان مرحوم نے اپنے ترجمہ کا آغاز معزالدین نامہ سے کیا هے جو بوستان خیال کی دوسری جلد هے - اب اس سوال کا جواب دینا کہ پہلی جلد کو کیوں چھوڑ دیا گیا ذرا مشکل هے لیکن پھر بھی میں اس بارے میں آگے چلکر کچھہ عرض کرونگا - مہدی نامہ پر مرزا محمد عسکری صاحب نے جو "گزارش" لکھی هے اس کو یہاں نقل کئے دیتا هوں - تاکہ اس جلد کے ترجمہ کرنیکی ضرورت کا حال معلوم هوسکے - وہ لکھتے هیں کہ " بخدمت جمیع ناظرین با تمکین عرض هے کہ جناب خواجہ امان صاحب دهلوی مرحوم و مغفور نے اس کتاب یعنی مہدی نامہ اور اسمعیل نامہ کا شاید کسی وجہ سے ترجمہ نہیں کیا اور بغیر

اس کتاب کے اور کتابوں کا کہ جن کا ترجمہ جناب خواجہ صاحب مغفور نے کیا ہے لطف نہ تھا۔ کیونکہ اکثر مطالب بغیر مطالعہ اس کتاب کے معلوم نہیں ہوسکتے۔ لہذا مسودہ اوراق ھرزہ سیاق اضعف العباد سراپا تقصیر بیہودہ زبان مرزا محمد عسکری المعروف بہ چھوٹے آغا عوض رسامے کہ باوجود کم استعدادی و نا قابلیت حسب الارشاد محب دلی شفیق ازلی جناب ڈاکٹر سید ناصر علی کے اس کتاب نادرہ زمانہ کا موافق اپنی زبان کے ترجمہ کیا الحمد اللہ کہ وہ انجام کو پہنچا " چونکہ بوستان خیال کا یہ تکملہ تھا اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں اس کو دوبارہ چھپوانا پڑا - اور اس کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۳۰۳ھ (مطابق سنہ ۱۸۸۶ ع) میں اسی مطبع سے شایع ہو -

پرانے کاغذات اور بوستان خیال کے مسودات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ امان مرحوم کا ارادہ تھا کہ آٹھوں جلدیں ختم کرنے کے بعد مہدی نامہ کا بھی ترجمہ کریں چنانچہ جلد ہفتم کے خاتمہ پر لکھتے ہیں کہ " اب اس کمترین جہان بے یار و مددگار کو فقط ایک جلد آخر یعنی جلد پانزدہم فارسی خاتمت الفوائیم نامی کا ترجمہ کرنا باقی رہا ہے .... باقی تمام منزل دشوار گزار جگر فرسا بمدد قلم عجلت رقم و بتائید بخت ساز گار طے ہوگئی - ہاں ان دونوں جلد ہائے اول یعنی مہدی نامہ اور اسمعیل نامہ کے ترجمہ کا بھی اس ترجمہ نگار مغز خراش نے ناظرین افسانہ سے وعدہ کیا ہے -

اگر عمر نا پائیدار وفا کرے گی اور نیز آلام روز گار سے فرصت حاصل ہوگی وہ جلد ہائے مذکورہ بھی معرض ترجمہ میں آئینگی - اور افسانہ فارسی کے مانند یہ جلدیں اردو کی بھی سلسلہ بلسلہ ہونگی - عجب نہیں کہ حسب شمار اردو کی دس جلدیں ہوں "

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خود جان بوجھ کر جلد اول کے ترجمہ کو ملتوی کیا تھا۔ اور ماری دانست میں یہہ ان کی عین دانائی تھی۔ بوستان خیال کی جان دراصل معزالدین نامہ اور خورشید نامہ ہیں - پہلی جلد یعنی مہدی نامہ اور اسمعیل نامہ میں شاہزادہ معزالدین کے آبا و اجداد کا حال اور ان کے کارناموں کا تذکرہ ہے - اور اس کا کوئی تعلق باقی جلدوں سے نہیں ہے - بلکہ اس جلد کو بقیہ جلدوں کا سلسلہ بھی نہیں کہا جا سکتا - علاوہ ازیں وہ داستان ایسی کمزور اور طلسم ایسے معمولی ہیں کہ ان کے پڑھنے سے انسان کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے - اس لئے اگر بوستان خیال کو مہدی نامہ سے شروع کیا جائے تو کتاب کے متعلق پڑھنے والے کی ایسی بری رائے قایم ہوگی کہ شاید وہ بقیہ جلدوں کو اٹھانے کی ہمت بھی نہ کرے - چنانچہ خود محمد تقی خیال نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مہدی نامہ اور اسمعیل نامہ کا بقیہ جلدوں سے سوائے اسکے اور کوئی تعلق نہیں ہے کہ اسمیں شاہزادہ معزالدین کے بزرگوں کا ذکر ہے - ماسواء اسکے خواجہ امان مرحوم کے طریقہ عمل سے ایک جدت یہہ پیدا ہو گئی ہے کہ پڑھنے والا شخص قصہ کے اور حالات معلوم کرنیکا خواہشمند ہو جاتا ہے اور وہی شکل پیش آتی ہے جو ڈکنز نے قصہ بلدین (A Tale of two Cities) ڈاکونن ڈائل نے مطالعہ خونیں (A study in Scarlet) میں سلسلہ قصہ کو بدل الٹ کر پیدا کردی ہے - اب رہا مرزا محمد عسکری صاحب کا یہہ کہنا کہ بغیر پہلی جلد پڑھے بقیہ جلدوں کا مضمون سمجھ میں نہیں آتا - تو اس کے ماننے کے لئے میں ہرگز تیار نہیں ہوں - کتابیں موجود ہیں - جن صاحب میں ہمت ہو وہ خود پڑھ کر دیکھ لیں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا وہ - خود واقعات بتا رہے ہیں کہ لوگوں کو پہلی جلد کی ضرورت نہ تھی - ورنہ فل سچ

جاتا کہ یہہ کیا بے سرا قصہ ہے - اور مترجم کو لا محالہ پہلی جلد کا ترجمہ کرنا پڑتا - اور جب ان کو ترجمہ کرنا ہی تھا - تو پھر وہ خود بجائے معزالدین نامہ کے مہدی نامہ سے بسم اللہ کیوں نہ کرتے - اب رہی یہہ بات کہ شاید یہ جلد ان کے پاس موجود نہ تھی تو وہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ مہدی نامہ اور اسمعیل نامہ (یعنی بوستان خیال کی پہلی جلد) خود ان کے ذخیرہ میں موجود تھی اور وہی جلد اس وقت میرے پاس ہے اور اسی کو دیکھکر میں مرزا محمد عسکری صاحب کے ترجمہ کے متعلق کچھہ عرض کرنا چاهتا هوں -

سب سے پہلے تو مرزا محمد عسکری مرحوم نے یہہ غضب کیا ہے کہ کتاب کے دیباچہ کا ترجمہ ہی نہیں کیا - درانحالیکہ یہہ بہت اہم چیز تھا - کیونکہ اس میں مصنف بوستان خیال یعنی محمد تقی خیال نے اپنا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے - شاید انہوں نے یہہ جزو اس وجہ سے چھوڑ دیا ہو کہ خواجہ امان نے معزالدین نامہ میں اس کا خلاصہ دیا تھا - اور مرزا محمد عسکری صاحب نے اپنی جلد کو خواجہ صاحب کی مترجمہ جلدوں کا تکملہ سمجھا تھا - لیکن سب سے عجیب چیز جو مجھے محمد عسکری صاحب کے ترجمہ میں نظر آئی وہ یہہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ترجمہ کرنے سے پریشان سے ہوگئے ہیں - پہلے تو اصل فارسی کتاب کا لفظاً لفظاً تتبع کیا ہے - لیکن آگے چلکر الفاظ چھوڑنے کی اور آخر میں تو سطریں کی سطریں بلکہ صفحے کے صفحے غائب کرنیکی نوبت آگئی ہے - شاباش ہے اس شخص کو جس نے اس جیسی سات کتابوں کا ترجمہ کرڈالا - اور ایک حرف کا اضافہ یا کمی نہیں کی - مثال کے طور پر میں یہاں اصل کتاب اور مرزا محمد عسکری کے ترجمہ کے نمونے درج کرتا ہوں - کتاب

مہدی نامہ کی ابتداء یوں ہوئی ہے-

اصل مضمون

راویان اخبار پیشین و ناقلان آثار مقرون به یقین هر صفحه تاریخ چنین ثبت کرده اند که نسبت صاحب قران واجب التعظیم شاهزاده معزالدین ابوتمیم بده واسطه بسید الصادقین حضرت ابو عبدالله جعفر ابن محمد صادق علیه و علی ابایه الصلوة والسلام می پیوندد صاحب مراة الجنان حمدالله مستوفی ذکر نسب شریف او از کتاب عیون التاریخ بدین موجب نقل کرده که مهدی که جد کلان صاحب قران بود اول ازین قبیله بر تخت نشست شروع کرده و محمد مهدی که محمد نام داشت پسر عبدالله بود که راضی لقب داشت .... و چون حضرت امام زاده رضی الله عنه که پسر بزرگ حضرت سیدالصادقین علیه السلام بود در حین حیات پدر عالی مقدار خود بجوار رحمت ایزدی پیوست و برادر محمد بن اسمعیل را ابو جعفر منصور روانقی بعد از شهادت

ترجمه مرزا محمد عسکری صاحب

راویان اخبار پیشین و ناقلان آثار مقرون به یقین صفحه تاریخ پر اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ نسب صاحب قران واجب التعظیم شاہ زادہ معزالدین ابو تمیم کا بعد دس پشتوں کے سید الصادقین حضرت ابو عبداللہ جعفر بن محمد صادق علیہ السلام سے ملتا ہے اور صاحب مراۃ الجنان حمداللہ متوفی نے ذکر ان کے نسب شریف کا کتاب عیون التاریخ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ مہدی صاحب قران کے جدکلاں تھے۔ وہی اس قبیلہ سے پہلے تخت نشین ہوے اور مہدی کہ محمد نام تھا پسر عبداللہ تھے اور لقب ان کا راضی تھا—

......

اور جب حضرت امام زادہ اسمعیل رضی اللہ عنہ پسر بزرگ حضرت سید الصادقین علیہ السلام کی حیات میں اپنے پدر عالی مقدار کے ساتھ جوار

جد بزرگوارش علیہ السلام کہ آن حضرت
را بروایت صحیح بزہر شہید کردند
بدست آوردہ دریکے از عمارت بغداد
بکنج گرفت کہ در ہمان کنج قبض
روح پاکش شد - وآن ملعون پیوستہ
برائے محافظت دنیائے خود با بنی
فاطمہ صلواۃاللہ علیہا کہ بالا ستحقاق
وارثان ممالک دین ودنیا بودہ این
سلوکہا می نمود ومنصور خلیفہ دویم
عباسیان بود —

رحمت ایزدی میں داخل ہوے اور ان
کے بیٹے محمد بن اسمعیل کو ابو جعفر
منصور دوانقی نے بعد شہادت ان کے
جد بزرگوار کے کہ ان حضرت کو بروایت
صحیح زہر سے شہید کیا گرفتار کر کے
ایک عمارت بغداد میں چن دیا چنانچہ
اسی دیوار میں روح پاک ان کی جناں
کی طرف روانہ ہوئی اور وہ ہمیشہ
حفاظت دنیا کے واسطے اولاد فاطمہ
صلواۃ اللہ علیہا کے ساتھہ کہ بالاستحقاق
وارث ممالک دین و دنیا کے تھے یہی
سلوک کیا کرتا تھا اور منصور خلیفہ
دوم عباسیوں کا تھا —

یہاں تک تو ترجمہ اصل کے مطابق ہے - اب آگے چلئے —

بعد ازاں مہتر شتاب را فرمودند
کہ نقد و جنس ایشان را بار کردہ
بلشکر رسانند تا باہل قافلہ دادہ شود
و صد سوار ہمراہ او گزاشت ہو صد
کس کہ زخمی بودند آنہارا رخصت کردہ -
اما بفضل الہی پنج شش کس معدودے
از غازیان اسلام درآن جنگ کشتہ
شدند و ہمہ سلامت ماندند القصہ شاہزادہ

بعد ازاں مہتر شتاب سے فرمایا کہ
ان کے نقد و جنس کو بار کر کے لشکر
میں لے جاؤ - القصہ ... دوسرے روز
شہزادہ اسی راہ سے وخیم بن ضخیم
کی طرف روانہ ہوا - لیکن اس طرف
وخیم حرامزادے نے کہ اپنے زور و قوت
پر نہایت مغرور تھا بعد جانے ویلہ کے
سلہم سے کہلا بھیجا کہ یہ امر جواں مردی

روز دیگر با هفت صد سوار از همان راه برسر و خیم لئیم روانه شد که فوج خوارزم بیشتر آنجا بودند - اما از آن جانب و خیم حرامزاده که از آل مروان ابن ملجم بود و در قوت و دلاوری ویله باو نمیرسید بلکه بزور و قوت او بیشتر می بالید و به همین سبب و خیم را برین دره مقابل سلیم نوجوان باز داشته بود - بعد از رفتن ویله بغارت قافله و خیم چه کرد که سلیم نوجوان را پیغام نمود که این جوانمردی نیست که شما زخم دار باشند و مایان بشما جنگ کنیم بهتر آن که تا زخم شما بهتر شود طبل جنگ موقوف باشد - و ویله نیز بیمار است تا آن وقت او هم چاق شود بالفعل قریب یک ماه جنگ موقوف باشد تا هر دو جانب صحت کلی رو دهد -

سے بعید ہے کہ تم زخمی ہو اور میں تم سے جنگ کروں - بہتر یہہ ہے کہ جب تک... تمہارا زخم اچھا ہو طبل جنگ موقوف رکھو اور ویلہ بھی بیمار ہے جب تک وہ بھی تندرست ہوجائے گا - بالفعل ایک ماہ جنگ موقوف رہے تاکہ دونوں جانب صحت ہو -

(مہدی نامہ صفحہ ۳۷۶)

بہر حال میں نے یہ دو نمونے یوں ہی اصل اور ترجمہ کہول کر دیدئے ہیں - جلد اول کے حصہ دوم یعنی اسمعیل نامہ کی تو یہ کیفیت ہے کہ صفحے کے صفحے ترجمہ سے رہ گئے ہیں - خدا معلوم مرزا محمد عسکری صاحب کا اصل فارسی نسخہ نامکمل تہا یا انہوں نے ارادۃً ایسا کیا ہے کہ زبان

درست رہے اور ترجمہ بھی ہو جائے۔ مگر اس کو ترجمہ نہیں کہتے اور نہ ایسا ترجمہ کرنا کوئی مشکل کام ہے —

بوستان خیال کے متعلق لوگوں کی اس قدر دانی کو دیکھہ کر دوسرے مطبع والوں کے منہہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اور چونکہ اس کی ساتویں جلد خواجہ امان کے انتقال اور مسودہ کا کچھہ حصہ چوری جانے کی وجہ سے معرض التواء میں پڑ گئی تھی۔ اس لئے حکیم محمد مقرب حسین خاں صاحب المتخلص بہ غنی نے اس کا ترجمہ گھسیٹ ڈالا۔ اور اپنے مطبع اخبار عالم و مظہر الزراعت واقع میرٹھہ میں چھپوا دیا۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ ابھی یہ جلد میرٹھہ میں چھپ ہی رہی تھی کہ خواجہ امان کے فرزند خواجہ قمرالدین خاں نے جلد ہفتم کو مکمل کر کے شایع کردیا اور اس طرح یہ دونوں ترجمے تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے سنہ ۱۳۰۰ ھ (مطابق سنہ ۱۸۸۳ ع) میں دو مطابع سے نکلے۔ اس ترجمہ کا نمونہ میں آگے چل کر دوں گا۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بھی اصل کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔ اس کا ایک حصہ تو ایسا ہے کہ گم شدہ مسودہ کا پتہ دیتا ہے۔ اور بقیہ حصہ میں حسب ضرورت اصل سے کمی اور بہت کچھہ کمی کردی گئی ہے۔ اور ساتھہ ہی خواجہ امان مرحوم پر اس کتاب کے تقریظ لکھنے والے سید سجاد حسین صاحب ریحانی رئیس میرٹھہ نے حملہ بھی کردیا چنانچہ فرماتے ہیں کہ "پہلے مترجم کا یہ حال سننے میں آیا ہے کہ کئی کئی مسودے کیا کرتے تھے اور راتوں کو نوابان دہلی کے پاس جا کر اپنی عبارت سنایا کرتے تھے اور اسقام و اغلاط کو رفع کیا کرتے تھے۔ اب محرر سطور ہذا نے جو کیفیت بچشم خود دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ حکیم صاحب قلم برداشتہ ترجمہ کیا کرتے تھے۔ بارہا

دیکھا ھے کہ ابھی ترجمه کر کے جزو ختم کیا اور کاپی نویس آئے اور حکیم صاحب نے ترجمه اس کے حواله کردیا.... جس طرح حکیم صاحب نے ترجمه نہایت اعلیٰ قسم کا فرمایا ھے اسی طرح کاغذ بھی اچھا لگایا اور چھپائی بھی اچھی فرمائی۔ بعض اهل مطابع کی طرح جوتے بالدھنے کے کاغذ پر کتاب کو نہیں چھاپا جیسا سابق میں دھلی میں چھاپا تھا"—

خیر مترجم میرٹھه کے رهنے والے تھے اردو تو اچھی لکھتے ھی ھوں گے اور ترجمه بھی اچھا کرتے ھوں گے۔ لیکن جو دو اعتراض خواجه امان مرحوم پر کئے گئے ھیں۔ وہ ذرا غور طلب ھیں۔ حکیم صاحب کا مسودہ تو میرے پاس نہیں ھے جس سے پتہ چلتا کہ وہ کس طرح قلم برداشته لکھتے تھے۔ البته "پہلے ترجم" کے مسودے میرے سامنے ھیں۔ اس میں تو مجھے کٹا چھٹا کہیں زیادہ نظر نہیں آتا۔ بلاک ملاحظه ھو یه وہ صفحه ھے جو تمام مسودوں کا ایک ایک کاغذ دیکھه کر سب سے زیادہ کٹا چھٹا صفحه نکال کر فوٹو کے لئے منتخب کیا گیا ھے۔ اس سے آپ خود اندازہ کرسکتے ھیں کہ مسودوں کی صحت وہ کس طرح کرتے تھے اور کس قدر کرتے تھے۔ اب رھا "نواہوں" کو سنانے کے لئے کتابوں کو لئے پھرنا تو اس کا حال خدا بہتر جانتا ھے یا ریحانی صاحب ساکن میرٹھه۔ کاغذ پر جو اعتراض ھے تو میرے خیال میں دھلی کے مطبع کے کاغذ سے حکیم صاحب کے مطبع کا کاغذ نه صرف کم قیمتی بلکه حد درجه کا ناقص ھے۔ اور اب تو اس کی یه حالت ھوگئی ھے کہ ھاتھه لگایا اور کاغذ کا ٹکڑا ھاتھه میں آیا ۔ خیر کچھه مضائقه نہیں ریحانی صاحب نے حق تقریظ ادا کر دیا اور اپنے شہر والے کی بات رکھه لی ۔

منشی نولکشور بیکنٹھه باشی عربی ۔ فارسی اور خاصکر اردو کے حق

میں جو کچھہ کر گئے ہیں ۔ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی ۔ ہرعلم و فن کی لاکھوں کتابیں محض ان کی وجہ سے دنیا میں رہ گئی ہیں ۔ جہاں کہیں اور جب کہیں ان کو کوئی کتاب مل گئی انہوں نے بلا تامل اپنے مطبع میں چھاپ دی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس مطبع کی کتابوں میں غلطیاں بہت ہوتی ہیں اور کاغذ بھی اچھا نہیں لگایا جاتا ۔ یہ سب صحیح مگر باوجود ان سب باتوں کے ماننا پڑیگا کہ اگر منشی صاحب اور ان کا مطبع نہوتا تو ہزاروں کتابیں اب تک اس طرح غائب ہوجاتیں کہ کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں ۔ ادھر تو مہدی نامہ چھاپنے سے ان کا شوق بڑھا ۔ اور ادھر بوستان خیال کی بقیہ آٹھوں جلدوں کے اسقدر جلد نکل جانے سے ان کو خیال پیدا ہوا کہ دو اڈیشن چھپنے کے باوجود بھی لوگوں کا شوق پورا نہیں ہوا ہے ۔ اس لئے مناسب ہے کہ پھر اس کو طبع کرایا جائے ۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ قمرالدین خان راقم سے اس کا حق طبع خریدنا چاہا ۔ لیکن ۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے کیوں اس کے دینے سے انکار کیا ۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ منشی صاحب کسی اور سے ترجمہ کرا کے اس کو اپنے مطبع سے شائع کریں ۔ اس واقعہ کا ذکر ان کے مطبع کی شائع کردہ بوستان خیال کی جلد دوم کے دیباچہ میں اس طرح کیا گیا ہے " ... منشی نولکشور صاحب بہادر سی ۔ آئی ۔ ای مالک مطبع اودھ اخبار ... کی رائے اس امر کی جانب مقتضی ہوئی کہ کتاب بوستان خیال کا ترجمہ زبان فارسی سے اردو میں کیا جائے ۔ تاکہ ہر ایک مشتاق کو لطف اس قصہ دلفریب کا حاصل ہو .... چنانچہ جلد اول بوستان خیال مسمی بہ مہدی نامہ جس کا ترجمہ ... مرزا محمد عسکری صاحب عرف چھوٹے آغا صاحب رئیس لکھنو نے بزبان فصیح و عبارت دلچسپ تحریر فرمایا تھا ۔ منشی صاحب ممدوح نے اپنے مطبع

میں چھپوایا اور دیگر جلدوں کے ترجموں کی تجویز پیش نظر تھی کہ حسن اتفاق سے نواب جعفر علی خاں صاحب برادر زادہ جناب آغا ججو صاحب نے کچھ جلدیں مختلف الوقائع اور ناتمام منشی صاحب کی خدمت میں ہدیتاً پیش کیں - جن کا ترجمہ افصح الفصحا ابلغ البلغاء سحر بیان شیریں زبان جناب نواب مرزا محسن علی خاں صاحب عرف آغا ججو صاحب متخلص ہندی فرمایا - مگر افسوس کہ ترجمہ پوری جلدوں کا نہونے پایا تھا کہ ناتمام چھوڑ کر اس دار ناپائدار سے راہی ملک بقا ہوئے اور اجزاء ترجمہ بھی ابتر جا بجا ہوئے .... غرض کہ بمقتضاے عالی ہمتی منشی صاحب نے بمشورہ جناب چھوٹے آغا صاحب بعد اخذ حق تالیف ان ناتمام جلدوں کی تکمیل کا حکم دیا ... جن جلدوں کا ترجمہ نہ تھا ان کا پورا ترجمہ کیا گیا - اور یہ سب کام بصلاح و صوابدید و بتوجہ خاص فیض اختصاص جناب چھوٹے آغا صاحب و تصحیح و ترتیب منشی پیارے مرزا صاحب (جو آغا ججو صاحب کے شاگرد رشید بھی تھے) انجام پایا " معلوم ہوتا ہے کہ بوستان خیال کی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ پہلا اڈیشن رمضان المبارک سنه ۱۳۰۶ هجری (مطابق مئی سنه ۱۸۸۹ ع) میں چھپنے کے بعد دوسرا اڈیشن نکالنے کی نوبت آئی - یہ ترجمہ بھی ایسا ہے کہ اس کو ترجمہ کہنے میں مجھے تو تامل ہوتا ہے - خواجہ امان مرحوم نے اپنے دیباچے میں لکھا تھا کہ وہ فارسی کے اصل نسخہ کا با محاورہ ترجمہ کردیں گے اور اپنی طرف سے نہ کچھ بڑھائیں گے اور نہ گھٹائیں گے - برخلاف اس کے جدید ترجمہ میں دوسرے قسم کا دعوی کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ " عبارت رنگین - مقفی و مسجع - فصاحت و بلاغت میں قلم توڑ دئے ہیں - اشعار برجستہ و حسب حال ایسے عمدہ طرز سے موقع و محل پر لکھے ہیں کہ سبحان اللہ - جہاں

جس رنگ کا تلازمہ باندھا اس کی تصویر کھینچ دی ہے ... اگرچہ خواجہ امان صاحب دہلوی نے بڑی نہایت عمدہ ترجمہ فرمایا ہے اور ناظرین والا تمکین کی نظر انور سے گزرا ہے۔ مگر جب اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ فصاحت و بلاغت۔ لطف زبان۔ نازک خیالیوں میں بدرجہا بڑھا ہوا پائیں گے ظاہر ہے کہ جب اصل کتاب ہی مقفی اور مسجع نہیں ہے تو ترجمہ کہاں سے ہوگا۔ اور جب خود فارسی نسخہ میں تلازمہ کا خیال نہیں رکھا گیا تو پھر ترجمہ میں کہاں سے آنے لگا۔ غرض ہے تو یہ ترجمہ لیکن اردو کی غزارت۔ مترجم کے شعریں۔ الفاظ کی بہتات اور بے ضرورت فقروں کی ٹھوسم ٹھاس سے اس کو کسی طرح بھی ترجمہ نہیں کہا جاسکتا یہ بوستان خیال تو ضرور ہے اور اس میں قصہ بھی وہی ہے لیکن یہ وہ بوستان خیال نہیں ہے جو محمد تقی خیال نے فارسی میں لکھی تھی۔ یا جو ترجمہ کے لئے مرزا حجو صاحب کے سپرد ہوئی تھی۔ نمونہ کے طور پر میں تینوں ترجموں کی چند سطریں درج کرتا ہوں۔ ان سے سب کا فرق بآسانی ظاہر ہوجائے گا۔ ان تینوں مطبوعہ کتابوں کی تقطیع برابر کی ہے۔ خط بھی تقریباً یکساں ہے۔ مگر جو عبارت خواجہ امان مرحوم کے ہاں صفحہ ۲۲ پر ہے وہ لکھنو والے ترجمہ کے صفحہ ۴۲ پر اور میرٹھ والے نسخہ کے صفحہ ۱۳ پر ہے۔ خود اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا حجو صاحب نے ترجمہ کو وسعت دی ہے اور حکیم محمد مقرب حسین خاں صاحب نے اس کا اختصار کیا ہے —

ترجمہ خواجہ امان مرحوم جلد ہفتم ۲۲

راوی سامعہ خراش۔ خیال آفرین بیان کرتا ہے کہ جب صاحب قران

گردوں شکوہ بمعیت زادہ ان خدارس و سرداران مذکور بالا حکیم افریطوس الٰہی کے در گنبد پر پہنچے - اس روز حکیم افریطوس نے تمام گنبد میں فرش ملوکانہ بچھوایا .... وہاں سے یہ دونوں شخص پا پیادہ ایک طرف روانہ ہوے - ایک ساعت کامل مسافت میں گزری بعد ازاں ایک ایسے مقام پر پہنچے کہ وہاں ایک درخت چنار کا نہایت سر بلند تھا - اضمار راز دار نے صاحب قران سے کہا کہ اب تم آنکھیں بند کر لو اور میرے ہمراہ تشریف لاؤ — ....

ترجمہ مرزا حجو صاحب مرحوم

جلد هشتم صفحه ۴۲

جادو بیانان هنروفن - سحر سازان معرکہ سخن اس داستان افسون بنیان کو اس طرح نوک اعجاز رقم کرتے ہیں کہ جب شہر یار والا جاہ صاحب قران گردوں بارگاہ نے بہ ہمراهی سرداران و شاہزادگان و زاہدان خدا آگاہ در گنبد پر مجمع فضائل لا متنا ہی حکیم افریطوس الٰہی کے نزول اجلاس فرمایا حکیم افریطوس الٰہی نے بصیغہ باطن و بقوت علم قبل سے آمد صاحب قران اعظم معہ ہمراهیان معزز و محترم معلوم کرکے تمام گنبد مجید کو اسباب زینت و آرائش سے مثل بارگاہ شاہی مزین و

ترجمہ مقرب حسین صاحب مغفور

جلد هفتم صفحه ۱۳

راوی نکو گفتار و مخزن اسرار گزارش کرتا ہے کہ جس وقت صاحب قرآن اعظم معہ جمعیت مذکورہ حکیم افریطوس الٰہی کے دروازہ گنبد پر پہنچا حکیم صاحب نے تمام گنبد میں فرش شاہانہ بچھوایا تھا - ... وہاں سے دونوں پا پیادہ ایک سمت روانہ ہوئے - ایک ساعت مستقیمہ وہاں پہنچے جہاں ایک درخت چنار نہایت رفیع سر بہ فلک کشیدہ تھا - اضمار رازداں نے کہا اب تم چشم بند میرے ساتھ چلے آؤ -

پیراستہ کرا رکھا تھا .... وہاں سے یہ
دونوں معظم و مکرم پیادہ پا ہوے اور ایک
سمت نامعلوم روانہ ہوے - طے الارض
کرتے جاتے تھے بعد تھوڑی دیر کے ایک
ایسے مقام پر پہنچے جہاں ایک درخت
چنار نہایت تناور اور سر بلند تھا -
صاحب قران اعظم اس درخت کی
تناوری اور بلندی دیکھ کے کمال
متعجب ہوے اور اضمار راز داں سے
پوچھا کہ اے راز داں روشن رواں یہ
درخت کیسا ہے - اضمار راز داں نے
کہا کہ اے شہر یار عالی وقار اس کی
بھی حقیقت واضح ولایح ہو جاے گی -
اب تم اپنے دیدہ ظاہر بین کو بند
کر لو اور میری معیت میں چلے آؤ -

چونکہ مجھے مقابلہ کرکے ترجموں کے اچھے برے ہونے کا تصفیہ نہیں کرنا بلکہ صرف ترجمہ کرنے کا فرق دکھانا ہے اس لئے اس سے زیادہ نمونے دے کر مضمون کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتا - نمونہ بالا سے ظاہر ہوگا کہ حکیم صاحب نے گو اختصار پر کمر باندھی ہے - مگر پھر بھی فارسی کے اصل نسخہ سے بہت کم گریز کی ہے - اب رہا مرزا حجو والا نسخہ تو اس کی حالت کچھ جداگانہ ہے اس میں عبارت کے اضافوں کے ساتھ محض تحریر کو مسجع و مقفیٰ بنانے کے لئے الفاظ اس قدر بڑھا دئے ہیں کہ اب اس کو

ترجمہ کرنے میں بھی تامل ہوتا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ مرزا حجو صاحب نے اردو کے اشعار کس طرح اپنے ترجمہ میں چسپاں کئے ہیں اور بلحاظ فن وہ کس پایہ کے ہیں۔ میں ایک نمونہ دے کر اس بحث کو ختم کرتا ہوں —

" ترجمہ خواجہ امان صاحب جلد پنجم "

راوی کہتا ہے کہ اس روز مرسلاق دیو پردہ قاف کو گیا تھا۔ تا نصف شب اپنے برادر خوردہ کے ہاں مہمان رہا۔ اس نابکار نے حیوانات قوی الجثہ اور شراب غلیظ سے اکثر دیو ان قاف کی دعوت کی تھی۔ جب نصف شب گزری۔ مرسلاق دیو۔ اپنے بھائی سے خواہان اجازت ہوا اور کہا میں اسوقت پردہ دنیا میں اسی کوہ پر جاؤنگا اور شراب کے نشہ میں اس آدمزاد کا نغمہ خوش سنوں گا۔ ہرچند اس دیو مہماندار نے کہا کہ یہہ کیا وقت جانے کا ہے —

مرسلاق دیو نے نہ مانا۔ بعد نصف شب کوہ پر پہنچا یہاں یہہ دیکھا کہ آزادہ شیربہ ذوالعالی تمام نغمہ سرائی میں مصروف ہے دل میں کہا آج کی شب یہ آدمزاد عجب صدائے دلکش

" ترجمہ مرزا حجو صاحب جلد ششم "

اب دو کاہے دیو کے عرض کئے جاتے ہیں کہ جب وہ حرامزادہ پر غریو یعنی مرسلاق دیو قاف میں گیا — اخوان الشیاطین میں سے ایک کا مہمان ہوا۔ سارے دن اور آدھی رات تک مرے ہوئے ہاتھی۔ ریچھ سور۔ بلیاں۔ چوہے۔ گھونسے کھا چکا تھا۔ انگور میوے جو پُر آب چشموں میں پڑے پڑے بغیر آتش جوش کھایا کئے تھے جن میں تعفن سے بلبلے اُٹھتے تھے اُنکی شراب پیا کیا۔ نشہ میں یہہ ترنگ سوجھی کہ چلوں آدمزاد کا گانا سنوں۔ بھائی سے رخصت ہوا۔ حرا کی طرف چلا۔ بدمستی میں پہاڑوں سے ٹکراتا پچھلی رات کو کوہ پر پہنچا۔ گانے کی آواز کان میں آئی۔ ایسی دلکش روشن کہ جانور آشیانوں سے گرے پڑتے تھے۔ جی میں

سے غزل خوانی کر رہا ہے - پھر حال
کسی گوشہ مخفی سے اس کا نغمہ
سنو اور علی الصباح شکایت کرو کہ
ہمارے روبرو کبھی بایں خوش الحانی
غزل خوانی نہیں کی - ناگاہ سرسلاق
دیو کی نظر شاہزادہ اکلیل الملک
فلک رفعت پر گئی - کیا دیکھتا ہے کہ اور
ایک جوان تازہ وارد آفتاب جمال آرد شیر
کے پاس بیٹھا ہے اور آرد شیر اس کے
روبرو نغمہ سنجی کر رہا ہے - حیران ہوا
کہ یہ کون شخص ہے اور اس کوہ قلب
دشوار گزار پر کس طرف سے آیا -
بجز اس کے اور کچھ خیال میں نہیں
آتا کہ اول میں خدا پرست تھا اب
جو ابلیس پرست ہوا ہوں خداوند
ابلیس بنظر بندہ نوازی ہر ماہ میرے
واسطے دعوت غیبی بھیجتا ہے - ظاہر
ہے کہ اس دن چالیس آدمی پس و
پیش بلائے کوہ آئے اور میرے شکم
کا لقمہ ہوئے آج کی شب یہ جوان
آدم زاد فربہ جسم کوہ پر آیا - ہزار
ہزار شکر ابلیس لعین کا بجا لایا اور
کہا واہ - پہلے کبھی یہ عطا نہیں ملی -
آج بہت کچھ جوش ہے - معشوقہ کا
غم بھولا - خوب ہوا - ہوا پر سے نگاہ
کی آرد شیر کو دیکھا - سوچا آپ کو
ظاہر کرنا اچھا نہیں - مزہ جاتا رہیگا -
سچ ہے آدمی دیو سے کیوں کر نہ
ڈرے ہزار کچھ ہوگا پھر بھی نہیں
ہوسکتا - خلقی شے سے کوئی کیا کرے -
ایک گوشہ میں چھپنا اور یہ گانا سننا
بہتر ہے - صبح کو گلہ کروں گا -
کہوں گا میرے آگے ایسا کیوں نہیں
گانا - خفا بھی ہوں گا - ناگاہ اس پر
نگاہ کی نظر شاہزادہ فلک جاہ پر
جا پڑی - دیکھا ایک نوجوان حسین
اور بیٹھا ہے - حیران ہوا یہ کون ہے -
کہاں سے آیا ہے - دل میں کہا - اہاہا
تو نے جو خدا پرستی چھوڑ اور دامن
ابلیس کو پکڑا اس لئے خدا تجھ پر
مہربان ہوا - چالیس بھیجا کرتا ہے -
آگے بھی بہت سے آئے - میں نے کھائے
پھر آج کی رات ایسا پر گوشت موٹا
تازہ چربی دار پٹھا بھیجا ہے اس کے

دل میں کہا - وقت شب ظاہر ہوتا
مصلحت نہیں - علی الصباح ان جوانوں
کے پاس چلو اور جوان اول یعنی
آردشیر کو اس جرم و خطا پر لقمه
دھن کراو که میرے روبرو کبھی
ایسی نغمه سرائی نہیں کی - القصه باقی
شب سرسلاق دیو آردشیر کا نغمه
سنتا رہا - اور قبل طلوع آفتاب خواب
غفلت میں مبتلا ہوگیا —

دین کا دین کس سے ادا ہوسکتا ہے -
ہوا میں لگا چرخ مارنے پھر زمین پر
گرا - بے مغزی کے لئے سر خاک پر
رکھ دیا - ناک رگڑی - بولا :

اے خداوند آب کے کیڑے
فیض تجھ میں تو ہے سمندر کا
تیرے پانی میں چل رہے ہیں جہاز
ہے تیری ذات گنج گوہر کا
تیرا بندہ سوائے شکر کبھی
نه کرے گا گلہ مقرر کا

کل ان کے سامنے جائے گا - ایک کو
کھائے گا - دوسرے سے شکوہ کرے گا -
غرض دیر تک یہی جھک مارا کیا -
گانا سنتا رہا - قریب سحر وہ خفته
بخت سو گیا —

اس نمونه سے نه صرف ترجمه کا فرق ظاہر ہوتا ہے بلکه یه بھی معلوم ہوتا ہے که مکروہ الفاظ اور بے ضرورت اشعار سے مرزا حجو صاحب مرحوم نے قصه کو بے لطف کردیا ہے - اور بعض حصے تو اس کے ایسے ہوگئے ہیں که پڑھ کر نفرت ہوتی ہے - سرسلاق دیو کی غذا کے متعلق جانوروں کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ ہرگز ایسی نہیں ہے که کوئی بھلا آدمی پڑھ کر کتاب کو بند نه کردے - ممکن ہے که اس زمانه کے لوگوں کا یه مذاق ہو - مگر ہمارے زمانه میں تو کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ایسی باتوں کو پڑھے اور اسے کراہت

نہ آئے ۔ برخلاف اس کے خواجہ امان مرحوم کے ترجمہ میں متانت غضب کی ھے اور کوئی لفظ ایسا نہیں آیا جو اب بھی اہل شام کے کانوں کو برا اور شرفاء کو ناگوار معلوم ہو ۔ یا جو اصل فارسی قصہ سے ذرا بھی ادھر ادھر ہوا ہو ۔ قصہ مختصر یہ کہ جن باتوں کو خواجہ امان مرحوم نے اپنے دیباچہ میں مکروہ بتایا ھے اور جن سے احتراز کرنے کا مشورہ افسانہ نویسوں کو دیا ھے ۔ وہ باتیں مرزا حسو صاحب مرحوم کے ترجمہ میں شروع سے آخر تک بھری پڑی ہیں ۔ اگر " فصاحت و بلاغت ۔ لطف زبان اور نازک خیالی " اسی کا نام ھے تو ہم ایسی فصاحت و بلاغت سے باز آئے اور ایسے لطف زبان اور نازک خیالی کو ہمارا دور ہی سے سلام ھے ۔

محمد تقی جعفری متخلص بہ خیال | اب اس بحث کو چھوڑ کر میں اس اصل قصہ کی طرف رجوع کرتا ہوں ۔ یہ تو میں پہلے ہی لکھ آیا ہوں کہ بوستان خیال فارسی زبان میں محمد تقی جعفری متخلص بہ خیال نے لکھی تھی ۔ انہوں نے اپنا حال بہت وضاحت کے ساتھ مہدی نامہ کے شروع میں دیا ھے اور اس کا اختصار خواجہ امان مرحوم نے اپنے ترجمہ کی جلد اول میں کیا ۔ یہاں میں دونوں تحریروں کو ملا کر مصنف کا حال لکھتا ہوں ۔ تاکہ اس کی پوری حالت اور کتاب لکھنے کی کیفیت معلوم ہوسکے ۔

محمد تقی خیال لکھتے ہیں کہ مجھے شروع ہی سے قصے اور افسانے سننے کا شوق تھا اور جہاں کہیں سن پاتا کہ کسی کو کوئی نیا قصا یاد ھے ۔ اس کے پاس جاتا اور اس سے کسی نہ کسی طرح سنتا ۔ ابھی جوانی کی سرحد میں قدم ہی رکھا تھا کہ ظالم عشق سے واسطہ پڑا ۔ غنیمت یہ ہوا کہ میرے دلدار کو بھی قصے سننے کا شوق اور مجھ سے بھی کہیں زیادہ شوق تھا ۔ میں اس کے پاس جاتا ۔ روز کوئی نہ کوئی قصہ سناتا ۔ آخر کہاں تک جتنے افسانے مجھے

یاد تھے سب اس نے سن ڈالے اور پھر حکم دیا که جہان کہیں سے هو قصے یاد کر کے لا اور سنا - غرض محض اس کی خاطر اور صحبت قایم رکھنے کے لئے میں نے هزاروں کتابوں کی ورق گردانی کی - ادهر ادهر سے پوچھه پوچھا کر قصے یاد کرتا - اپنی طرف سے کچھه ملا کر ان کو بڑھاتا اور اس کو سناتا - ابھی اس صحبت کو ایک سال نه گزرا تھا که میری اس سے جدائی هوگئی - هر چند میں نے ملنے کی کوشش کی کچھه حاصل نه هوا - شہر گجرات (احمد آباد) جو میرا وطن تھا مجھه پر پردیسوں کی قبر کی طرح تنگ هو گیا اور میں دارالخلافه (شاہ جہاں آباد دهلی) کی طرف روانه هوا - محمد شاہ بادشاہ (عہد حکومت (سنه ۱۱۳۱ ھ م) سنه ۱۷۱۹ ع سے سنه ۱۱۶۱ ھ م سنه ۱۷۴۸ ع تک) کے جلوس کا سنه ۷ (مطابق سنه ۱۷۲۶ ع) تھا جب میں یہاں پہنچا - اور سنه ۸ جلوس (مطابق سنه ۱۷۲۷ ع) سے لگا کر سنه ۱۱ جلوس (مطابق سنه ۱۷۳۰ ع) تک نوکری کی تلاش کرتا رہا - والد سے ترکه میں مجھے بہت سی فارسی اور عربی کتابیں ملی تھیں - انکو پڑھتا اور تلاش روزگار کرتا - غرض اسی زمانه میں مجھے ایسا نلزله هوا که اب اس کا خیال کرنے بدن میں تھر تھری آتی هے - آٹھه مہینه تک بخار میں مبتلا رہا - دهلی کے مشہور طبیب حکیم امام الله خاں کا علاج رہا - اس سے بخار تو رفع هوگیا - لیکن سینه میں ناسور هوگیا اس ناسور سے اسقدر بو آتی تھی که کسی خوش بو سے نه دبتی تھی - آخر ایک دن خواب میں کیا دیکھتا هوں که خامس آل عبا علیه السلام تشریف لائے - اور میرے ناسور پر اپنی انگلی مبارک سے لعاب دهن لگا دیا - خواب سے بیدار هوکر جو دیکھا تو ناسور کا نام و نشان تک نه تھا - میں اسی صحت و مرض کی حالت میں اکثر ایک قہوہ خانه

میں جاتا تھا جو میرے مکان کے قریب ہی تھا۔ وہاں بہت سے صاحب فہم و ادراک جمع ہوتے تھے۔ ہر شخص کو اختیار تھا کہ چاہے وہاں کچھ بولے یا خاموش بیٹھا انکی باتیں سنتا رہے کسی کو کسی کے حال سے غرض نہ تھی نہ بیکار ہے یا باکار۔ ان لوگوں میں ایک شخص ایسا تھا کہ قصہ گوئی کا فن جانتا تھا اور اسپر اس قدر نازاں تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا اس نے دوسرے لوگوں کے ہزاروں قصوں کو اپنی طرف منسوب کر لیا تھا۔ میں نے بھی اس سے ۳-۴ قصے سنے اور وہ بھی نا تمام۔ لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ یہ دوسروں کے قصے اپنے بتا کر سناتا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ مگر اس سے قصہ کا لطف جاتا رہتا ہے۔ میں نے اس پر بروقت پردے میں اعتراض بھی کئے۔ لیکن وہ بیوقوف کچھ نہ سمجھا بلکہ اس کو اپنی تعریف سمجھ کر خوش ہو گیا اور کہنے لگا کہ " انسان * حسب قدر علم و فضل میں دستگاہ پیدا کر سکتا ہے۔ مگر فن قصہ گوئی ایسا دقیق و مشکل ہے کہ بغیر مناسبت طبیعت ہر گز حاصل نہیں ہوتا۔ اہل صحبت نے بھی اس کے قول کی تصدیق کی " میں خاموش ہو گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دوستوں نے مجھ سے غزل کی فرمایش کی۔ میں نے غزل پڑھنی شروع کی اور وہ وہیں بیٹھے منھ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بات یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اس ساری مجلس میں ہر شخص میری ہی طرف متوجہ رہے۔ ایک

---

* اس میں جس قدر حصہ قوسین میں ہے وہ خواجہ امان مرحوم کے دیباچہ سے ہے اور باقی خود محمد تقی خیال کے لکھے ہوئے مقدمہ سے لیا گیا ہے۔

دن ایسا اتفاق ہوا کہ کسی دوسرے کی کہی ہوئی داستان اس نے اپنی کہہ کر بیان کردی - خدا کی قدرت سے ایک صاحب ایسے بھی موجود تھے جو یہ داستان دوسری جگہ سن چکے تھے - انہوں نے کہا کہ یہ داستان تو فلاں شخص کی ہے - بے حیائی سے کہنے لگا کہ یہ ایک پرانا قصہ ضرور ہے - لیکن رد و بدل کر کے میں نے اب اس کو اپنا کر لیا ہے - اس کے بعد پھر ایک دن اس نے رہی فن قصہ گوئی کا جھگڑا شروع کیا - مجھے بڑی حیرت ہوئی اور اس کے فقرے ناگوار بھی گزرے - میں نے کہا کہ "اے حضرت آپ کیا فرماتے ہیں - جو انسان اہل علم و صاحب کمال ہیں وہ فن قصہ کو ایک فعل بیہودہ جانتے ہیں - ان کو درس و تدریس اور تصنیفات علمی سے اس قدر فرصت کہاں نصیب ہے کہ اپنی اوقات ایک خیال بیکار و فکر زائد میں ضائع فرمائیں اور بر تقدیر اس طرح کچھ خیال بھی آجائے پھر اس تمہید کا افسانہ رنگین تصنیف کریں کہ گوش فلک نے بھی نہ سنا ہو - بشر کیا چیز ہے" کہنے لگا کہ آپ کی باتیں دیوانگی کی ہیں جب تک خود نہ دیکھ لونگا - یقین نہ کرونگا - میں نے عرض کی کہ " یہ ہیچمدان بے سرمایہ محض ارباب فضل و کمال کی کفش برداری کا رتبہ نہیں رکھتا اگر ارشاد ہو ایسا فسانہ دلچسپ و رنگین مضامین سنائے کہ تمام عمر نہ سنا ہو" اور جس کے سننے سے دوست خوش ہو جائیں اور دشمن جل مریں سنکر کہنے لگا کہ زبانی جمع خرچ سے کیا ہوتا ہے اگر کچھ دم میں دم ہے تو لکھ کر لاو اور سناو - اور ساتھ ہی دوسروں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا کہ میرے اس یار نے اس کام کو بھی شاعری - تاریخ گوئی یا منشی گری سمجھ لیا ہے - چونکہ وہ سب اس کے ممنون احسان تھے - اس لئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور میں خاموش ہو گیا - جب نوبت یہاں تک پہنچی تو میں نے

بھی سوچا کہ چلو میں بھی کچھ لکھہ ڈالوں - چنانچہ ایک قصہ کی تمہید لکھہ کر میں نے چند خاص خاص دوستوں کو سنائی۔ انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور بڑھانے کی فرمائش کی - میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور ایک روز اس مسودہ کو لے کر اسی مجلس میں گیا " جب صاحبان صحبت داستان مقرری کے استماع سے فارغ ہوے - میں نے کہا - صاحبوں ایک جگہ سے ایک افسانہ تازہ میرے ہاتھہ آیا ہے اگر مرضی مبارک ہو دو چار ورق اس کے سناؤں - اہل جلسہ نے کہا - بسم اللہ شروع کیجیئے ہم خود مشتاق ہیں جسوقت یہ افسانہ عجیب و غریب انھوں نے سنا تو اہل مجلس نے متفق اللفظ نہایت تحسین و آفرین کی اور کہا الحق ایسی تمہید مطبوع دل تمام عمر ہم نے نہیں سنی - کہ جس میں بعینسہ تواریخ ماضیہ کا لطف آتا ہے "ان حضرت کو خود نئے قصوں کی تلاش تھی - چونکہ جو تنخواہ ان کو ملتی تھی وہ ان کے لئے کافی نہ تھی اور یہ یہ امیروں کی جوتیوں کے صدقہ سے کچھہ اور پیدا کرلیتے تھے - اس لئے وہ بھی میرے قصہ کو سن کر بہت خوش ہوے اور دوسروں کے ساتھہ خود بھی میری تعریف کرنے لگے - مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ میری کہی ہوئی داستان ہے تو فوراً پلٹ گئے اور کہنے لگے کہ اس شخص نے فارسی میں یہ قصہ کہا ہے اور اچھا قصہ وہی ہے جو اردو میں کہا جاے - کبھی کہتے کہ اس داستان میں لڑائی کا ذکر ہے اور لڑائی تو بس حضرت امیر حمزہ پر ختم ہے - کبھی فرماتے کہ اس افسانہ کا شاہزادہ دو جگہ عاشق کیوں ہوا غرض ایسی ہی مہمل باتوں اور بیجا اعتراضوں کی بوچھاڑ وہ بڑی دیر تک کرتے رہے اور آخر کو نوبت یہ پہنچی کہ انھوں نے اودھم مچا دیا - اگر کوئی میری داستان کی تعریف کرتا اور نرم مزاج کا آدمی

ہوتا تو اس کو ڈانٹ دیتے اور کہتے کہ تو کیا جانتا ہے ہم ۲۰ برس سے یہ کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی بد مزاج شخص تعریف کرتا تو ابرو پر شکن ڈال کر خاموش ہو جاتے۔ اہل جلسہ میں بعض ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ یہ شخص مفت میں غل مچا رہا ہے۔ اس لئے وہ اس کے منہ لگنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اور کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح یہ گفتگو ختم ہو۔ بعض ایسے تھے کہ لاپروا ہی کی وجہ سے انھوں نے میری داستان دل لگا کر نہیں سنی تھی۔ وہ لوگ اسی شخص کو ماہر فن سمجھتے تھے۔ اور اس کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہتے تھے۔ غرض یہ جھگڑا بڑی دیر تک ہوتا رہا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی بڑا مزا آیا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے ایک دلدار نے جو میرے ہمراہ احمد آباد سے آئی تھی اور میں بھی اس سے کمال مالوف و مانوس تھا۔ ان لوگوں کی ناانصافی کو سن کر مجھ سے کہا کہ جہاں حضرت امیر حمزہ کی داستان ہوتی ہے وہاں تم بھی اس نئے قصہ کو سنایا کرو۔ چونکہ مجھے اس کی خاطر بہت عزیز تھی۔ میں راضی ہوگیا۔ آخر اہل جلسہ نے یہ قرار دیا کہ پہلے وہ صاحب اپنی داستان کہیں اور پھر میں اپنا قصہ سنایا کروں۔ وہاں کے انصاف پسند لوگ ہمیشہ میری داستان کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک دن ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ شخص فلاں رئیس کے ہاں سے داستان گوئی کی تنخواہ پاتا ہے اور وہ بھی اس کو فن قصہ گوئی میں کامل سمجھتے ہیں۔ وہیں چل کر تم بھی اپنی داستان سناؤ۔ میں راضی ہوگیا۔ لیکن شرط یہ لگائی کہ میں داستان ضرور سناؤں گا مگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ میری تصنیف ہے آخر جب اس رئیس کو جا کر میں نے اپنی داستان سنائی انھوں نے بہت ہی پسند کرکے سب لوگوں کے سامنے میری بڑی تعریف

۔ ایک عجیب بات اور سنو کہ ایک بڑے عالی قدر اور صاحب اقتدار
ر ان کو قصہ کے چار ورق لکھ کر دے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ
تمام افسانوں اور داستانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میرے اس
کو پورا کر دیجئے۔ ان صاحب نے یہ کاغذ مجھے دئے۔ میں نے کہا کہ
میں ایک ورق کی کمی ہے۔ فرمانے لگے پھر آپ اس کمی کو نکال دیجئے۔
ن ہے کہ اس طرح ان امیر سے مجھ کو کوئی فائدہ پہنچ جائے۔ ہاں
کا خیال رہے کہ ایک آدھ ورق لکھنے سے کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔
نے کہا اگر آپ کا یہ خیال ہے تو بسم اللہ کاغذ قلم دوات منگوائیے۔
ابھی لکھے دیتا ہوں۔ اب جو میں نے ان کی تحریر کو دیکھا تو
دان اللہ۔ نہ املا درست ہے نہ انشا درست۔ لکھنا پڑھنا بھی کچھ معمولی
جانتے ہیں۔ خیر میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے دو چار صفحے گھسیٹ
۔ یہ دیکھ کر وہ تو حیران ہو گئے اور اسی وقت اپنے نام سے یہ کاغذ
امیر کے پاس بھیج دئے۔ وہاں سے خوشنودی کا پروانہ آیا۔ اور ساتھ
اس اضافہ شدہ قصہ کی بہت کچھ تعریف بھی کی گئی۔ اب کیا تھا
صاحب میرے سر ہو گئے کہ داستان پوری کر دو۔ مجھے بھی اس کے لکھنے
مزا آنے لگا تھا۔ روز تھوڑا بہت لکھ کر دے دیتا۔ وہ بھی میری بہت
وداری کرتے۔ یہاں تک کہ داستان کے چار جزو ہو گئے۔ اور قصہ ختم
۔ اور ان امیر نے بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ ان
حہ کی مراد بر آئی یا نہیں۔ لیکن سنتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد
ن نے لوگوں سے کہا کہ یہ غریب میرے پاس سبق لینے آیا کرتا ہے۔
ایک دفعہ تو باتوں باتوں میں انہوں نے خود مجھ سے یہ کہہ دیا
اس قصہ کو ہم اور تم دونوں نے مل کر خوب لکھا ہے۔ یہ صاحب

سنه ۲۹ جلوس (مطابق سنه ۱۷۴۲ ع) میں دکن کی طرف چلے گئے —

غرض ان تمام جهگڑون میں بوستان خیال کے چند جزو مرتب هرگئے - اور میری تقدیر نے یهی یاوری کی که مجهکو نواب مؤتمن الدوله * مرحوم کے فرزند نواب رشید الدین خان بهادر المسمی به مرزا محمد علی کی خدمت میں پهنچا دیا - جب انهون نے یهه داستان سنی بهت خوش هوئے اور مجهے اسکی تکمیل کا حکم دیا - میںنے اس کتاب کے شروع کر نیکی تاریخ " فرمایش رشیدی " کهی اور جب اس کا ایک گلشن تمام هوا تو ملاحظه میں گزرانا - اس قصه کی خبر انکے بڑے بهائی مرزا محمد المخاطب به نواب محمد اسحاق خان کو هوئی - انهون نے بهی اسکو دیکها اور اسقدر عنایتیں فرمائیں که بیان نهیں هوسکتیں - اسکے بعد تهوڑے هی دنون میں دوسری جلد بهی تیار هوگئی - میں تیسری جلد لکهه رها تها که ان دونون امیرون نے اس کتاب کو بارگاه عالی میں پیش کردیا - اور مجهے " بادشاه کی ملازمت سے سرفراز کروایا - بادشاه نے بهی عطا فرما نے

۱۱۵۵ ه

* انکے والد شوستر سے هندوستان آئے اور دهلی میں آکر محمد شاه بادشاه کے داروغه باور چیخانه نجابت هوگئے - غلام علی خان خطاب ملا - موتمن الدوله هندوستان هی میں پیدا هوئے اور محمد شاه کے هان خانسامان هوکر بڑا عروج پایا انکا انتقال سنه ۱۱۵۲ ه میں هوا - انکے ۳ لڑکے اور ایک لڑکی تهی - لڑکی کا بیاه تو بادشاه کے حکم سے نواب صفدر جنگ کے فرزند نواب شجاع الدوله سے هو گیا - بڑے بیٹے مرزا محمد کو انکے باپ کی طرح بادشاه بهت عزیز رکهتے تهے - پهلے اسحاق خان کا اور بعد میں نجم الدوله کا خطاب دیکر بخشی چهارم مقرر کردیا - محمد شاه کے بعد احمد شاه نے بخشیگری کی خدمت کے علاوه دهلی کی کروڑگیری کا انتظام بهی انکے سپرد کیا - سنه ۱۱۶۳ ه میں اُن کا انتقال هوا - موتمن الدوله کے منجهلے بیٹے کا نام مرزاعلی اور خطاب افتخارالدوله اور چهوٹے کا نام مرزا محمد علی اور خطاب رشیدالدین خان سالارجنگ تها - عالمگیر ثانی کے زمانه میں یهه دونون دهلی سے نکل کر نواب صفدر جنگ کے پاس گئے - مگر انکے وهان پهنچنے سے پهلے نواب کا انتقال هوگیا - نواب شجاع الدوله انکی جگه گدی پربیٹهے - سنه ۱۱۶۸ ه میں انهون نے سالارجنگ کو اپنا بخشی مقرر کر دیا —

کتب خانہ خاص یہ ارشاد کیا کہ ہماری مرضی مبارک ہے کہ اس افسانہ نادرا لحقیقت کو طول دیا جائے - میں نے عرض کیا پھر و مرشد اگر سرکار سے چلد کاتب سپرد ہوجائیں پھر فدوی حتی الوسع طوالت قصہ میں قصور نہیں کرنے کا - بادشاہ نے پندرہ کاتب زود نویس خوش خط سپرد کئے - ہنوز دو جلدیں مہدی نامہ اور اسمعیل نامہ کی تصنیف کی تھیں کہ جن میں شاہزادہ معزالدین موسوم حقیقی افسانہ کے آبا و اجداد کا حال درج ہے کہ اس اثناء میں بادشاہ محمد شاہ نے رحلت فرمائی - اور میں نواب سراج الدولہ * صوبہ بنگال کے پاس پہونچا - نواب سراج الدولہ نے بھی کمال عزت و توقیر کی اور یہ فرمایا کہ اس افسانہ رنگین کو طول دو - " غرض قصہ یہاں تک بڑھا کہ پندرہ جلدوں کی نوبت آئی - اور کامل پچیس سال میں ختم ہوا -

مجھے باوجود تلاش یہ پتہ نہیں چلا کہ محمد تقی خیال کا کب اور کہاں انتقال ہوا - البتہ ان کی کتاب کا دیباچہ دیکھنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سنی المذاہب تھے - چناچہ مناجات میں صحابہ کرام کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ : -

الہی بجاہ و جلال پیمبر | کہ مارا شفیع است در روز محشر
تصدیق اکبر بہ فاروق اکبر | بآں جامع مصحف و شاہ حیدر
بزہرا کہ لخت جگر خواندش احمد | بآں ہردو نورہ و چشم پیمبر
بہ اعزاز ہر یک ازیں نامداران | بقدر و کمال امامان دیگر
باصحاب شاہ شہیداں کہ بیشک | گزشتہ بہر رضائے تو از سر

* نواب سراج الدولہ صوبہ دار بنگالہ ایک ایسے تاریخی شخص ہیں کہ ان کے متعلق کسی نوٹ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے - یہ وہی ہیں جن کے سر کلکتہ کے بلیک ہول کی کہانی ملتصق جاتی ہے -

برائم ز جمعیت دل کرم کن بعالم عطا ساز در روز محشر
زیادہ ست عصیان من گرچہ لیکن بود بحر رحمت ز ہر شے فزوں تر

بوستان خیال کی جلدیں

اس کتاب کی تقسیم بھی کچھ عجب پیچ در پیچ ہے۔ چنانچہ خود مصنف کتاب اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ بوستان خیال کے دو گلستان یعنی حصے ہیں۔ گلستان اول میں مقدمہ اور دو گلشن ہیں پھر گلشن اول کے دو گلزار ہیں اور یہ دونوں گلزار مل کر ایک جلد ہوتی ہے۔ گلستان اول کے گلشن دوم کے بھی دو گلزار ہیں۔ لیکن ان دو گلزاروں کی دو جلدیں ہیں۔ گویا اس طرح ۳ جلدیں اور ایک مقدمہ مل کر گلستان اول مکمل ہوتا ہے۔

گلستان دوم کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ اس کے دو حصے ہیں پہلے کا نام معز الدین نامہ اور دوسرے کا خورشید نامہ اور خورشید نامہ کی ۳ جلدیں ہیں۔ بہر حال اس طرح یہ دونوں گلستان پندرہ جلدوں میں ختم ہوئے اور اس سارے مجموعہ کا نام بوستان خیال رکھا گیا ہے۔ مترجموں نے اس کا ترجمہ کرنے میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ گلستان اول کو تو ایک جلد بنایا ہے۔ اور بقیہ ۱۴ جلدوں کو بلحاظ ضخامت اس طرح تقسیم کیا کہ ۱۴ جلدوں کی ۸ جلدیں رہ گئی ہیں۔ ان جلدوں کی صراحت نقشہ ذیل سے ظاہر ہوگی۔

مترجمہ خواجہ امان مرحوم	نام جلد
جلد اول	حدائق الانظار
جلد دوم	ریاض الابصار
جلد سوم	شمس الانوار
جلد چہارم	بحر الالطاف

جلد پنجم	نجم الاسرار
جلد ششم	مصباح النہار
جلد ہفتم	ضیاء الانوار
جلد ہشتم	سراج الاضمار (مترجمہ خواجہ قمرالدین خاں راقم)

مطبوعہ مطبع نول کشور	نام جلد	نام مترجم
جلد اول	مہدی نامہ و اسمعیل نامہ	مرزا محمد عسکری
جلد دوم	روضۃ الابصار	مرزا محسن علی عرف آغا حجو
جلد سیوم	ضیاء الابصار	ایضاً
جلد چہارم	شمس النہار	ایضاً
جلد پنجم	مطلع الانوار	ایضاً
جلد ششم	خزینۃ الاسرار	ایضاً
جلد ہفتم	نور الانوار	ایضاً
جلد ہشتم	مشرق الانوار	ایضاً
جلد نہم	تفریح الاسرار	پیارے مرزا

حکیم محمد مقرب حسین خاں نے جلد ہفتم کا ترجمہ کرکے اس کا نام کاشف الاسرار رکھا تھا—

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ خواجہ امان مرحوم بھی سات ہی جلدوں کا ترجمہ کرکے ختم ہو گئے اور آٹھویں جلد کا ترجمہ ان کے فرزند خواجہ قمرالدین خاں کو کرنا پڑا۔ اور بجنسہ یہی حال مرزا حجو صاحب کا ہوا کہ سات جلدوں کو ختم کرکے رخصت ہوئے۔ اور آٹھویں جلد کی تکمیل ان کے شاگرد پیارے مرزا صاحب کو کرنی پڑی—

بوستان خیال کا قصہ

بوستان خیال کا خلاصہ کرنا میرے بس کا کام نہیں ہے۔ بھلا کئی ہزار صفحے کی کتاب کو چند سطروں میں لکھ دینا کوئی آسان کام ہے۔ پھر بھی چونکہ بغیر اس کے مضمون پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔ جلد اول سے تو بقیہ جلدوں کا کوئی تعلق ہی نہیں کیوں کہ اس میں شاہزادہ معزالدین اور ان کے آبا و اجداد کا حال اور ان کے کارناموں کا ذکر ہے۔ اصل کتاب جلد دوم سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی کیفیت یہ ہے آں حضرت صلی اللہ و علیہ وسلم کی پیدایش سے بہت پہلے ایک بادشاہ تھا۔ اس کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ ہر طرح کا عیش و آرام نصیب تھا۔ لیکن اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ آزردہ رہا کرتا ہے۔ اس نے ایک دن اپنے ہاں کے ایک بڑے حکیم اسقایفوس کو بلایا اور کہا زایچہ کھینچ کر دیکھو کہ میری قسمت میں کوئی اولاد ہے بھی یا نہیں۔ اس نے زایچہ کھینچا۔ اور ستاروں کی گردش کا حساب لگا کر کہا کہ آپ کے ہاں دو لڑکے توام پیدا ہوں گے۔ ان میں سے ایک کے طالعوں میں سخت گردش پڑی ہیں۔ میں دو تختیاں بنا کر دیتا ہوں۔ جس وقت وہ پیدا ہوں اسی وقت یہ دونوں تختیاں بڑے لڑکے کے بازووں میں باندھ دی جائیں۔ اور ایک دم کو اس سے جدا نہوں۔ ورنہ وہ ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں پھنس جائے گا۔ چنانچہ اس کی ہدایت کے بموجب یہ دونوں تختیاں پہلے ملکہ کے گلے میں ڈالی گئیں۔ اور جب نو مہینے بعد اس کے ہاں توام بچے پیدا ہوئے تو ملکہ

---

* اس داستان کو پڑھ کر مدت ہوگئی ہے - محض یاد پر خلاصہ لکھ دیا ہے۔ اب دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہیں - اس لئے کسی غلطی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں —

لے گئے سے ان تختیوں کو اتار کر بڑے لڑکے کے بازوؤں میں باندھ دیا گیا۔ بڑے لڑکے کا نام خورشید تاج بخش اور چھوٹے کا نام بہرمنیر رکھا گیا۔ یہ دونوں بچے بڑے ناز و نعم سے پلے۔ مگر شروع ہی سے دونوں کی طبیعتیں بالکل مختلف تھیں۔ بڑا اگر عیش و عشرت کا دلدادہ تھا تو چھوٹے کو شہسواری۔ تیر اندازی اور ہر طرح کے مردانہ کھیلوں سے عشق تھا۔ بڑا اگر محلوں کی صحبتوں کو پسند کرتا تھا تو چھوٹا دن رات سیر و شکار میں رہتا تھا۔ غرض یہ دونوں بڑھتے بڑھتے جوان ہو گئے۔ ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ بہرمنیر شکار کو گیا چند مصاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔ ایک جنگل لق و دق میں کیا دیکھتے ہیں کہ سنگ مرمر کا ایک بہت خوبصورت تخت رکھا ہے۔ شاہزادہ کو اس پر بیٹھنے کا شوق ہوا۔ لوگوں نے منع کیا کہ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے۔ ایسے اچھے تخت کا ایسے لق دق میدان میں ہونا خالی از اسرار نہیں ہے۔ شاہزادہ نے نہ مانا۔ اور آخر اس پر بیٹھ ہی گیا۔ اس کا تخت پر بیٹھنا اور تخت کا پرواز کرنا۔ جتنے مصاحب تھے پریشان ہوگئے کہ اب بادشاہ کو کیا جواب دیں گے۔ غرض بادشاہ کے پاس اطلاع دینے کے لئے ایک آدمی بھیج کر شاہزادہ کی تلاش میں خود یہ لوگ نکل گئے۔

اب بڑے بھائی شاہزادہ خورشید تاج بخش کی کیفیت سنئیے کہ انھوں نے ایک رات خواب دیکھا کہ ایک بڑے محل میں گئے ہیں اور وہاں ایک شاہزادی چندے آفتاب چندے ماہتاب بیٹھی ہے۔ یہ اس کو دیکھتے ہی عاشق ہو گئے۔ اور وہ بھی ان پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی۔ اس شاہزادی کا نام ملکہ زہرہ جبیں خطائی تھا۔ صبح کو یہ اٹھے رات کا خواب کچھ یاد رہا کچھ نہیں یاد رہا۔ دوسری رات کو خواب میں پھر

وہی نقشہ پیش نظر ہوا۔ غرض چھ روز تک ان کو یہی خواب دکھائی دیا۔ اور دن بدن ان کا عشق بڑھتا گیا۔ آخر ساتویں دن تو یہ نوبت ہوئی کہ یہ چند مصاحبوں کو ساتھ لے شاہزادی کی تلاش میں گھر سے نکل گئے۔ دونوں بھائی جو تخت پر بیٹھ کر اُڑے تھے اِن کو تخت لے جا کر ایک طلسم میں جا اتارا۔ یہ طلسم ایک حکیم نے بنایا تھا اور اپنی لڑکی کا جہیز اس میں رکھ کر یہ قرار دیا تھا کہ جو اس طلسم کو فتح کرے گا اس کی شادی اس کی لڑکی سے ہوگی۔ حکیم نے بذریعہ اپنے علم کے یہ معلوم کر لیا تھا کہ بدر منیر نامی شاہزادہ یہ کام کرے گا اور اسی لئے اس نے یہ تخت بنا کر اس جنگل میں رکھ دیا تھا —

اب دونوں بھائیوں اور ان کے ہمراہیوں نے طلسم فتح کرنے شروع کئے۔ اور بے حد و بے قیاس دولت ان کے ہاتھ آئی۔ ان کی نئی نئی شادیاں بھی ہوئیں اور آخر دونوں کے دونوں زر و جواہر سے مالا مال اپنے ملک کو واپس آئے۔ اسی مال میں شمع دان سلیمانی بھی شاہزادہ بدر منیر کے ہاتھ آیا۔ گھر آنے کے بعد ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قدر مال و دولت کو لے کر اب کیا کریں۔ اس لئے انہوں نے پھر حکیم اسقلیفرس کو بلایا اور اس کی صلاح پوچھی۔ اس نے پھر زایچہ کھینچا اور کہا کہ ایک زمانہ میں سرزمین عرب میں ایک نبی پیدا ہوں گے۔ جن کا دین دوسرے تمام ادیان کو باطل کرے گا۔ ان کی اولاد میں ایک لڑکا معزالدین نامی پیدا ہوگا۔ اور اس کی شادی تم دونوں بھائیوں کی اولاد میں دو لڑکیوں سے ہوگی۔ یہ سن کر شاہزادہ خورشید تاج بخش نے کہا کہ تم ایک طلسم بنا کر یہ تمام زر و مال اس میں رکھ دو۔ تاکہ وہ اپنی شجاعت۔ دلیری اور عقلمندی سے اس طلسم کو فتح کریں۔ اور ہمارے خاندان کی لڑکیوں کا شوہر

ہونیکے قابل اپنے آپ کو ثابت کریں - چنانچہ طلسم باندھ کر تمام مال و دولت اس میں رکھی گئی - اور اس کے ساتھہ ھی ایک کتاب میں وہ تمام واقعات لکھے گئے جو ان دونوں بھائیوں کو طلسم فتح کرنے میں پیش آئے تھے - شرط یہ قرار دی گئی کہ شاھزادہ معزالدین سب سے پہلے شمعدان سلیمانی حاصل کریں - وہ جلایا جائے اور اس کی روشنی میں ان دونوں بھائیوں کے کارنامے جو شاھنامہ خورشیدی کہلاتے تھے بادشاہ ادریس کے خاندان کا آدمی پڑھے - اور ساتھہ ھی ساتھہ شاھزادہ معزالدین طلسم فتح کرتے رھیں - جب یہ داستان ختم ہو اور طلسم فتح ھوجاے اس وقت شاھزادہ کی شادی خورشید تاج بخش اور بدر منیر کے خاندان میں ھوجاے - چنانچہ شاھزادہ معزالدین پیدا ھوے اور ایک قصہ میں خورشید تاج بخش کی اولاد میں جو ملکہ شمسہ تاجدار تھی اس کا حال سن کر عاشق ھوگئے - اس وصیت کی تعمیل کرکے سب زر و جواھر حاصل کیا - ملکہ شمسہ تاجدار اور بدر منیر کی اولاد میں جو ملکہ نو بہار تھی اس سے شادی کرکے ھنسی خوشی رھنے سہنے لگے --

خیر قصہ کا خلاصہ تو میں نے لکھہ دیا مگر جس طرح قصہ میں قصہ اور فسانہ میں فسانہ اس داستان میں پھنسایا گیا ھے اور جو جو کارگزاریاں ان شاھزادوں - ان کے مصاحبوں اور ان کے عیاروں کی دکھائی گئیں ھیں - وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ھیں - اس کا ایک شمہ بھی نہ سمجھہ سے بیان ھوسکتا اور نہ اس مضمون میں اس کی گنجایش ھے - کتاب میں واقعات کا تسلسل اور عبارت کی روانی اس غضب کی ھے کہ ایک دفعہ کتاب کو اٹھا کر ساری جلدیں پڑھے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاھتا - شروع میں ذرا طبیعت الجھتی ھے لیکن چالیس پینتالیس صفحے پڑھنے کے بعد ممکن نہیں کہ کوئی کتاب کو چھوڑ سکے اور سارے کاموں سے ھاتھہ اٹھا کر اس کے پیچھے

نہ پڑ جائے۔ مگر ظا امون نے کتاب کی تقطیع اس قدر بڑی رکھی ہے اور ہر جلد کی ضخامت اتنی زیادہ کردی ہے کہ بیٹھہ کر پڑھنا مشکل ہے اور اگر لیٹ کر پڑھو اور کتاب کو سینہ پر رکھ لو تو تھوڑی دیر میں پیٹ دکھنے لگتا ہے۔ مگر پھر بھی پڑھنے والے کی یہہ حالت ہوتی ہے وہ اٹھتا ہے بیٹھتا ہے پہلو بدلتا ہے۔ مگر کتاب کو ہاتھہ سے نہیں چھوڑتا۔ میں بھی اس مصیبت میں گرفتار ہوچکا ہوں۔ اور آپ صاحبوں کو صلاح دیتا ہوں کہ جب تک ترک دنیا نہ کرلیجئے۔ اس وقت تک اس کتاب کو خدا کے واسطے ہاتھ نہ لگائیے۔ اگر خدا نخواستہ یہ کتاب آپ سے لپٹ گئی۔ تو پھر اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہی نہیں نا ممکن ہے اور کچھہ تعجب نہیں کہ ایک دفعہ کیا پانچ سات دفعہ بھی آپ اسکو پڑھیں اور سیر نہوں —

بوستان خیال کیا ہے

بوستان خیال محض حضرت امیر حمزہ جیسا قصہ نہیں ہے۔ جس میں سوائے خرافات کے اور کچھہ نہیں۔ یہ ایک ایسی علمی کتاب ہے جس میں دنیا بھر کے علوم و فنون بھردئے گئے ہیں۔ ہیئت۔ ہندسہ، نجوم، اقلیدس، تاریخ، طلسم، طب، منطق غرض کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس کا اس میں ذکر نہ ہو۔ اور جس کو پوری طرح اس میں بیان نہ کیا گیا ہو۔ خواجہ امان مرحوم اس کتاب کے متعلق اپنے دیباچہ میں ... لکھتے ہیں کہ " کوئی فسانہ اس تمہید کا متقدمین یا متاخرین نے تصنیف نہیں کیا کہ جس میں علم ہیئت و ہندسہ اور علم نجوم و طب اور تواریخ و طلسم وغیرہ علم متعارفہ کا صرف ہو اور ابتداء طلسم اسطرح شروع ہو اور بنیاد طلسم اسطرح قایم کی جائے کہ کرہ خاک سے تا منزل اعلی جو ۱۲ منزلیں ہا یں تفریق و تقسیم قرار دی جائیں کہ چار منازل عناصر اور سات منازل کواکب سیارہ اور ایک منزل فلک کرسی اور ایک منزل فلک سادہ یعنی

فلک اطلس کہ جس کو فلک اعظم خطاب دیتے ہیں اور منتہی المنازل منزل اعلیٰ کہ بلا شبہ مکان خاص باری عزاسمہ کا ہے - اسی سبب سے اس طلسم کا نام اجرام و اجسام مقرر ہوا کہ طلسم کرہ خاک سے تافلک ہشتم ہر منزل میں تمام کائنات کا نمونہ معہ استقامت و رجعت اور منسوبات و مد اولات اور نحوست و سعادت کواکب بطریق عالم ا جاب و بطرز افسانہ بیان کیا اور فلک کرسی سے ظہورستان تک طلسم اجسام میں موافق علم طب مزاج انسانی باین شکل تشریح کی کہ اول حدود اربعہ یعنی شرقی و غربی اور جنوبی و شمالی اس ملک کے موافق خاصیت ہر خاط کے مقرر کئے - بعدازان ہرسمت اس بادشاہ کے تفویض ہوئی - مگر ایک عنصر خاص کہ خاصیت غالب رکھتا تھا - ہر گاہ ہر عنصر تین برجوں سے متعلق ہے لا جرم بادشاہ عناصر اپنے رب النوع کے فرمانبردار ہوئے اور رب النوع موکلان کواکب سیارہ بروج دوازدہ کانہ سے عبارت ہے اس لئے نام ان بادشاہوں کے موافق اسمار عنا صر مقرر ہوئے " - غرض اس کتاب کو اگر کوئی شخص غور سے پڑھے تو علوم و فنون میں اگر ماہر نہ ہو جائے تو کم سے کم یہ تو ضرور ہوگا کہ ان سے ایک حد تک واقف ضرور ہو جائیگا - اور قصہ ہی قصہ میں بہت کچھ حاصل کر لیگا -

خواجہ امان مرحوم کی زبان

میرا یہ کہدینا کہ خواجہ امان مرحوم کی زبان دھلی کے شرفاء کی خاص زبان تھی کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا - میرا یہ لکھدینا کہ اپنے زمانہ میں وہ بہترین زباندان سمجھے جاتے تھے ہرگز تشفی بخش نہیں ہوسکتا - ان کی زبان کے نمونے میں پہلے بھی دے آیا ہوں اور آگے چل کر بھی ایک نمونہ دونگا مگر ان مختصر ٹکڑوں سے کسی حالت میں بھی ان کی زبان کا اندازہ نہیں لگا یا جا سکتا - ان کی ترجمہ کی ہوئی بوستان خیال کی

ایک جلد بھی مل جائے تو اسکو پڑھ کر دیکھیے که وہ کیا زبان لکھتے تھے اور آجکل بھی کوئی ایسا ھے جو ایسی صاف پاکیزہ اور شستہ و رفتہ زبان لکھہ سکے ۔ انکے ترجمه کے متعلق هندوستان کے مشہور ادیبوں کی لکھی هوئی تقریظیں دیکھیں که وہ لوگ انکی زباندانی کے متعلق کیا فرماتے هیں ۔ وہ تو وہ خود انکے مد مقابل یعنی مطابع نولکشور والوں نے پہلی مطبوعه جلدوں میں تسلیم کیا ھے که ,, کئی برس هوئے سخنور بیعدیل خواجه بدرالدین خان صاحب عرف خواجه امان صاحب دهلوی مرحوم نے اسکی چار پانچ جلدیں ترجمه کی تھیں که بوستان علیین کی سیر پر راغب هوئے ۔ وہ دهلی کی زبان کے استاد تھے ۔ انکا کیا کہنا ۔ ،، جب انکے ترجمه کے توڑ پر ترجمه کرنے والے انکی زباندانی کو مانیں تو پھر ایسی زبان کے متعلق کچھه زیادہ لکھنا لا حاصل ھے ۔ لیکن میں یه ضرور کہونگا که اگر تعداد الفاظ کی بناء پر کسی کی قابلیت کا اندازہ لگا یا جائے تو یه کہنے میں هرگز تامل نہیں هو سکتا که یه وہ شخص تھے جنہوں نے اردو زبان میں اتنے الفاظ استعمال کئے هیں که نه پہلے کس نے کئے تھے اور نه موجودہ زمانه میں شاید کوئی اتنے الفاظ استعمال کرتا هو۔ اورجتنی اصطلاحات علمیه انکے هاں جمع هوگئی هیں ۔ اتنی شاید هی کسی اور کتاب میں جمع هوئی هوں ۔ بهرحال میرا کہنا یه ھے که اگروا قعی آپ انکی زباندا نی کا اندازہ لگانا چاهتے هیں تو کسی کے کچھه لکھنے یاجو نمونے دئے گئے هیں انکو دیکھنے پر هرگز نه لگا ئیے بلکه همت کر کے انکی ترجمه کی هوئی بوستان خیال کی ایک جلد کو دیکھه ڈالئے ۔ آپکو خود معلوم هو جا ئیگا که وہ کیا تھے اور کیا کام کرگئے هیں اور اسکے ساتھه یه افسوس بھی هوگا که هم لوگ اپنوں کو بھول کر محض تقلیداً دوسرے ملک والوں کی تعریف کرتے هیں درآنحالیکه همارے هاں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ھے هاں یه ضرور ھے که هم کو انکا علم نہیں اور اگر علم

ہے بھی تو اسطرف ہم توجہ نہیں کرتے —

*نمونہ ترجمہ

" شہزادہ نے فرمایا اول یہ بیان کرو کہ تمارا بادشاہ شترکینہ ہے یا جلد تر مزاج کی اصلاح ہوجاتی ہے - شہزادہ کے اس سوال سے محفوظ اور سعید خوب ہنسے بعد ازاں عرض کیا اے شہریار ہم نے اول ہی خدمت شریف میں التماس کیا ہے کہ نہ بادشاہ کو ہم نے اپنی آنکھہ سے دیکھا اور نہ کان سے آواز سنی اور حضرت ہربارہم سے احوال بادشاہ کا پوچھتے ہیں - خدا جانے اس استفسار سے حضور کو خوش طبعی منظور ہے یا واقعی فرماتے ہیں - شہزادہ نے کہا یہ دروغ سریح تمہارا میرے قیاس میں نہیں آنیکا - یعنی میں جس مکان میں تھا تم بھی موجود تھے - خیر دیکھانے کے مقدمہ میں یہ عذر تمہارا درست ہے کہ سرنگون استادہ تھے - نہ دیکھا ہوگا مگر کانوں سے ضرور سنا ہوگا کہ جو ملکہ نوبہار نے صبح دلکشا سے کہا اور صبح دلکشا نے جواب دیا - محفوظ نے تبسم کیا حاشا ہمیں اس حال سے مطلق آگاہی نہیں اور نہ کوئی صدا ہمارے کان میں آئی - اے شہریار جسوقت ہم اس مکان حیرت نشان میں جاتے ہیں - بصارت و سماعت اور گویائی بالکل جاتی رہتی ہے - شہزادہ نے فرمایا میں باور نہیں کرنے کا - تم دیدہ و دانستہ اغماض کرتے ہو - خیر اب تفصیل اپنے بادشاہ کے ممالک کی میرے روبرو بیان کرو - سعید نے کہا اے شاہزادہ عالیقدر اس سرزمین کے ممالک باختر کے مانند بے حساب ہیں - شہزادہ نے پوچھا زمین باختر کس جانب ہے - سعید نے کہا لفظ باختر لغت میں جانب غرب کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ایک ملک وسیع ہے - جسکے شہر و بلاد کا شمار نہیں ہوسکتا یعنی

* اس نمونہ کیلئے مصحف فال کی طرح جلد اول کھولی اور صفحہ ۳۷۳ نقل کردیا —

جو کتب باختر کے حال میں نظر سے گزرے ہیں انہیں مختلف نام
شہر و بلاد کے درج دیکھے اور کسی کتاب میں نام دوشہروں کا مکرر نہ پایا -
اسی وجہ سے غلام نے عرض کیا کہ اس زمین کے بھی شہرو بلاد زمین باختر کے مانند
بیشمار ہیں - شہزادہ نے پوچھا تاریخ باختر میں کیا حال لکھا ہے - سعید نے
کہا باختر جلد دوم ایک تاریخ ہے اس میں حال بطریق اختصار ملک کے سلاطین
کا درج ہے - اور عوام الناس اسکو رموز حمزہ بھی کہتے ہیں - شہزادہ نے فرمایا
شاید قصہ حمزہ کا واقعی اور نفس الامر ہے - سعید نے عرض کیا جو دل زبان
پر بشر کے بطور اخبار جاری ہو البتہ مصداق اسکا ایک عالم میں ہوتا ہے -
خواہ بالفعل خواہ بالقوی یعنی زمانہ حال میں ہے یا زمانہ ماضی میں‌تھا -
اسیطرح اپنے حال پر غور فرماو کہ تم نے عالم عجائبات میں کیا کیا
تماشائے غیر مکرر چشم مبارک سے دیکھا اور کیا کیا معاملات
تازہ نظر سے گزرے - اگر نقل اپنی کسی بشر کے روبرو کروگے اس کو ہرگز یقین
نہیں آئے گا - اور حقیقت میں تمہاری نظر سے گزرا ہے - شہزادہ
نے فرمایا درست کہتے ہو - بعد ازاں شہزادہ سعید کے مکان میں‌آیا -
اور فرمایا اے لوح دار میرے خاطر سے ایک بار لوح میں دیکھو کہ
مواصلت ملکہ نوبہار کی میری قسمت میں ہے یا نہیں اور جو غبار ملال
میری طرف سے ملکہ کی طبیعت میں جائے گیر ہوا ہے آیا صاف بھی ہوگا
یا اسی صورت سے آزردہ رہیگی - سعید نے جواب دیا پیر و مرشد ہر چند
میں بغیر مطالعہ لوح کے بھی خدمت شریف میں گزارش کرتا ہوں کہ
ضرور بالضرور اپنی آرزوئے قلبی کو پہنچوگے مگر ہاں حاصل کاریہ دفع
ہونے غبار خاطر ملکہ کے ایک امر دشوار ہے - شہزادہ نے کہا - یہی
عنایت فرماو کہ وہ دعا مجھے بتادو جسکا بیت المعمور کے حرم میں

ورد کرتے هیں اور اسکی برکت سے هر ایک آدمی کی مراد حاصل هوتی هے - سعید نے کہا - بسرو چشم - مجھے بتانے میں دعا کے کچھ عذر نہیں لیکن درنیولا بیت المعور کی راہ جانوراں موذیہ سے آباد هو رهی هے - پھر آپ کس طرح وهاں پہنچینگے - شہزادہ نے فرمایا - سبحان‌الله - مصرع - چه مردے بود کزز نے کم بود - هر گاہ ملطقہ تمھاری دختر غور موسم میں اسی راہ سے بیت المعمور پہنچی پھر میرا جانا کیا مشکل هے - میں محفوظ سے کہونگا - اس نے اول بھی مجھے مسجد میں پہنچا دیا تھا - سعید نے کہا محفوظ اس وقت اس کام پر معین تھا شاید اب عذر کرے - شہزادہ نے فرمایا - تم نے خوب آگاہ کر دیا - ورنہ میں محفوظ سے ناحق آزردہ هوتا - وہ دعا مجھے بتادو - آیندہ من دانم و کارمن - یا بتانا دعا کا وهی بادشاہ کی اجازت پر موقوف هے - سعید نے کہا نہیں - دعا محض واسطے تعلیم کے هوتی هے - آخیر الامر سعید نے وہ اسم بزرگ شاهزادہ کو بتا یا - شہزادہ دوسرے دن یاروں سے رخصت هو کر اسی بیابان کی راہ سے بیت المعمور کی طرف روانہ هوا - اس دفعہ اثنا راہ میں دیکھا کہ فی الحقیقت وہ دشت پر خار شیر و پلنگ اور مار و کژدم وغیرہ جانوران موذیہ کی کثرت سے آباد هے الا کوئی جانور شاهزادہ کے درپے ایذا نہوا - شاهزادہ روز سوم بصحت و سلامت بیت المعمور میں پہنچا اور اول دو رکعت نماز ادا کی بعد ازاں حوض میں داخل هوکر ورد اسم شروع کیا - هنوز اعداد اسم تمام نہیں هوئے تھے کہ ناگاہ دروازے سے مسجد کے ایک جوان صاحب جمال به لباس درویش مسجد میں آیا - اور اس نے شاهزادہ کو به محبت تمام سلام کیا - شهزادہ نے جو غور سے دیکھا کیا دیکھتا هے کہ وہ فقیر اقبال شاہ هے - شهزادہ بعد تمام کرنے اوراد اسم کے اقبال شاہ سے بغلگیر هوا -

بعد ازاں پوچھا اے برادر گرامی قدر تمہارے تغیر لباس کی کیا وجہ ہوئی - اقبال شاہ نے کہا اے شہریار میں تم سے رخصت ہوکر براہ راست اپنے مرشد ,,ہادی الہدایت" کے مقام پر پہنچا - ملازمین نے شہزادہ مقبل کے وہ کف مستی مرشد کا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تہا میرے واسطے علیحدہ رکہا تہا - میں نے دیکہا کہ اس نعمت پر تمام مریدوں میں باہم فساد برپا ہورہا ہے اور ہر ایک خواہاں نعمت ہے - ہر کارہ وہ کف میرے مقدر میں تہا - عین وقت وہاں پہنچا - اور میں نے وہ مایہ حیات جاودانی کہا یا - ایک لحظہ کے بعد یکایک میری حالت غیر ہوگئی اور دل میں نور عربی روشن ہوا - یعنی تمام صفات وقدرت ملکوتی ایزد جلشانہ نے مجہے عطا فرمائے - اب جس مقام میں منظور ہوتا ہے بے زحمت ومشقت جاپہنچتا ہوں حتے کہ ظاہرو غائب ہونا بہی میرے اختیار میں ہے - جب یہہ مرتبہ اعلیٰ اور درجہ بلند پایا میسر آیا ایک روز میں نے مرشد کی خدمت میں حال تمہارا مفصل گزارش کیا اور یہہ بہی کہا کہ میں شہزادہ معز الدین سے وعدہ موثق کر آیا ہوں کہ تجہے منزل مقصود تک پہونچادونگا - اگر حکم ہو ایفاء وعدہ کروں - مرشد نے فرمایا کیا مضائقہ ہے بالفعل بیت المعمور میں جاکر شہزادہ کو منزل مقصد کی جانب روانہ کردے - حسب الحکم مرشد تمہاری خدمت میں حاضر ہوا - شہزادہ نے فرمایا اے برادر خوشا حال تمہارا کہ اس مراتب اعلیٰ کو پہونچے مگر کیا حیرت کی بات ہے کہ مقبل کے واسطے تم نے کیا کیا کارنمایاں کئے اور کس کس ملک و مرز میں میں پہرے الا مقبل کی تقدیر میں دختر سے شاہ ظہورستان کے کتخدا ہونا مقدر نہ تہا - بلکہ حال اس عروس کا بہی اسیطرح مذبذب رہ کہا - اگر میں اپنے

سر گزشت تمہارے روبرو بیان کروں واللہ نہایت متحیر ہو - اقبال شاہ نے کہا فرماؤ میں بھی سنوں کہ کیا سرگزشت ہے - شہزادہ نے حال سپہر کاہ چہارم کا اور ملاقات کرنا صبح ۵ لکشا سے اور آوارہ ہونا اپنا مفصل بیان کیا —"

خاتمه — ابھی یہ جو بوستان خیال کے ایک صفحہ کی نقل ہے - اس میں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ اس ساری عبارت میں کہیں وہ رنگ نہیں ہے جو آجکل ہماری اردو پر چھایا ہوا ہے - نہ تو اس میں الفاظ جو - جسنے - جسکو - تو وغیرہ کی بھرمار ہے - اور نہ عبارت میں کوئی الجھن اور پیچیدگی ہے - بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوآدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں - یہی وہ خوبی تھی جسکو ہم انگریزی پڑھ کر کھو بیٹھے ہیں اور انگریزی کے فقروں کی ترکیبوں کی نقل نے ہماری عبارت کو نہ صرف بے لطف بلکہ مضحکہ خیز بنا دیا ہے - کاش کوئی اپنی اردو درست کرنیکے لئے ہی بوستان خیال جیسی کتاب کو پڑھے اگر اور کچھ حاصل نہ ہوگا تو کم سے کم یہ تو سمجھ میں آجائیگا کہ اردو کیا ہے —

خدا بخشے خواجہ امان مرحوم کے پوتے خواجہ امیرالدین خان اکثر کہا کرتے تھے - کہ " میرا جی چاہتا ہے کہ بوستان خیال کو چھوٹے چھوٹے ناولوں کی شکل میں چھپوا دوں - تاکہ لوگوں کو یہ تو معلوم ہوجائے کہ اردو ادب میں کیا کچھ ذخیرہ ہے جو ہماری بے توجہی سے ردی میں پڑا ہوا ہے - " میں نے خود بھی اس کتاب کو صرف داستان کا لطف اٹھانے کیلئے پڑھا تھا اور کبھی اس کی ادبی خوبیوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی - اب جو میں نے اس کے کچھ حصے یہ مضمون لکھنے کیلئے پڑھے تو واقعی میری آنکھیں کھل گئیں - اور دل میں خیال آیا کہ چچا امیرالدین مرحوم

صحیح فرماتے تھے یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ اصلاح زبان اور درستی اسلوب بیان کیلئے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں اسکو شایع کیا جائے تاکہ اس زمانہ کے لکھنے والے اپنی روش کو درست کرسکیں - اوریہہ جان جائیں کہ اردو کسکو کہتے ہیں اور اردو کس طرح لکھتے ہیں - ہے کوئی اللہ کا نیک بندہ جو اس کار خیر سے زبان اردو پر احسان اور موجودہ زمانہ کی طرز تحریر کی مشکل آسان کرے -

داغ بے داغ

از

جناب طالب الہ آبادی

" اردو کے مطلع پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں ' ادب کی فضا گھٹا ٹوپ اندھیاری میں ملفوف ہے ، بدگمانیوں کے بادل گرج رہے ہیں ' غلط فہمیوں کے طوفان امنڈے چلے آتے ہیں ' فیصلہ حیران ہے معیار سرگرداں ہے ؛ فہم تصویر ہے درک آئینہ ہے ' -

یہ سب کچھ ہے لیکن جب کبھی حقیقت کی بجلی دامن ابر میں کوندہ جاتی ہے تو دم زدن کے لئے ساری کائنات جگمگا اٹھتی ہے - برق کی اِس آتشیں تصریر میں نور ہے نار نہیں ہے ساز ہے سوز نہیں ہے اس سے بے حس پیکر تڑپ جائینگے مگر جلینگے نہیں ' ولولہ انگیز ہے زلزلہ انگیز نہیں ہے -

کاش میرا قلم " برق گیر " بن سکے اور میں اس آتشیں تصریر کو سمیٹ کر اپنی کلک دو زبان میں بھر لوں اور پھر صفحہ ' کاغذ پر بکھیر سکوں ؛ ماہرین سائینس برق خاطف کو قید کر کے حیات انسانی میں چار چاند لگا چکے ہیں ' کیا عجب کہ حقیقت کی آتشیں تصریر محفوظ ہو کر بکھرے گی تو حیات روحانی میں ایک نئی جان نہ دوڑ جا ے گی "

سلسلہ خیالات کا سلسلہ ابھی یہیں تک پہونچا تھا کہ

نسیم نے کہا " دیکھئے تو چائے ٹھنڈی ہوچلی یہ آج آپ کس فناتے میں بیٹھے ہیں
سلیم چونک اٹھا، پیالہ اٹھا کر ایک گھونٹ چاء پی مگر لبوں پر مُہر سکوت لگی ہوئی تھی —

شمیم - مجھے تو آج بھائی سلیم کے تیور اچھے نہیں دکھائی دیتے - کسی گہرے فلسفے کی ادھیڑ بن میں ہیں یا کسی انکشاف کی چھان بین ہے، کچھہ ہو رنگ بیڈھب ہیں —

سلیم اب بھی خاموش رہا نسیم نے بات روک لی —

چار بجے تک تو یہ اچھے خاصے تھےمگر وہ دیکھئے سرھانے ،، گلزار داغ ،، کھلا ہوا ہے جب سے اس کی سیر فرمائی ہے اپنے آپے میں نہیں ہیں اور کیوں ہوں، داغ کی غزلیں نہیں ہیں ، تیز تھرے کی بوتلیں، اور کوک شاستر کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں جسکا جو جی چاہے کہے ، مگر میرا بس چلے تو داغ کا نام شاعروں کی فہرست سے خارج کردوں اور داغ کا کلام بحق سرکار متانت ضبط کرکے جلادوں ،

شمیم - (جھلا کر) نسیم زرا سنبھل کر باتیں کرو ، آدمیت سیکھو ، میں تو سمجھا تھا کہ دل لگی ہی دل لگی ہے مگر آج کی طرز گفتگو تو کچھہ اور ہی کہ رہی ہے ' خیر گالیاں اور کوسنے تو ہو چکے مگر یہ تو بتاو کہ واقعی داغ کے کلام کے متعلق تمہاری آزاد اور متین راے کیا ہے۔

نسیم - تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ نہ میں داغی ہوں نہ داغیہ - پھر مجھہ سے کیوں پوچھتے ہو —

شمیم - اس واسطے کہ میں بے چارہ ایک عربی مدرسہ کا طالب علم ہوں' سنا ہے کہ انگریزی پڑھنے والوں کے چار آنکھیں ہوتی ہیں ' وہ ہر فن مولا اور ہر رنگ کامل ہوجاتے ہیں' نام خدا آپ بی - اے بھی

هیں شاعر اور ادیب بهی هیں —

سلیم - (بهوں سکیڑ کرتے هوئے) دیکھو بهائی بحث بہت اچھی چیز هے ' تبادلۂ خیالات روحانی صیقل هے ' دلائل اور براهین کے ساتھ آپس کی گفتگو مخزن معلومات هے مگر زوائد سے احتراز اور ذاتیات سے پرهیز ضروری هے نہیں تو بحث شیطان کی آنت اور گفتگو بات کا بتنگڑ هوکر رہ جائیگی شمیم صاحب آپ جانتے هیں که انگریزی میں نے بهی پڑھی هے اور نسیم صاحب بهی جانتے هیں که عربی اور فارسی کی باقاعدہ تعلیم مجھے دی گئی هے ' ان دونوں طرق تعلیم میں' مقابلتاً جو خرابیاں بهی هوں - مگر یه خرابی هرگز نہیں هے که وہ کسی کو متعصب اور ضدی بنادیں اگر آپ 'داغ' کے متعلق گفتگو کرنا چاهتے هیں تو شوق سے کیجئے ان باتوں سے تو کوئی نتیجه نہیں ' —

نسیم - واہ ملا صاحب واہ ' تالیف قلوب کی کیا اچھی راہ نکالی هے مگر (مسکرا کر) میری نگاہ میں تو کلام داغ کی بہترین اور جامع ترین تعریف صرف یه هے که وہ سراسر پوچ هے بیکار هے ' مخرب اخلاق هے اور حیا سوز هے ' —

شمیم - الفاظ نرم تو هیں مگر گرم زیادہ هیں ' میں آپ کو (غصے سے لال هو کر) یقین دلانا چاهتا هوں که ' داغ ' کی شاعری آپ کی پرواز سے بلند هے وہ سرا سر پر مغز هے ' مفید هے ' معلم اخلاق هے اور حیا پرور هے —

سلیم - محض چند الفاظ کے الٹ پهیر کو جواب نہیں کہتے ' اپنے تعصب اور اعتقاد کو بهانگ دهل ادا کردینا کوئی دلیل نہیں ' میں آپ

دونوں سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں —

نسیم - اور شمیم دونوں بول اٹھے - وہ کیا ؟

سلیم - وہ یہ کہ آپ لوگوں نے داغ کا مطالعہ یوں کیا ہے 'یا جیسے آج کل کے مدیر اور ناقدین' کتاب کی صورت اور فہرست' رنگ اور وزن' طباعت اور کتابت 'تصویر اور قیمت دیکھ کر لا ابن جوزی تنقیص اور تقریظ لکھ دیا کرتے ہیں وہی رنگ ہے —

نسیم - میرے نصاب میں جتنا کچھ کلام داغ داخل تھا وہی میں نے پڑھا ہے اور اب ایک حرف بھی نہیں پڑھنا چاہتا - سنکھ یہ مزہ ہو جاتا ہے (شمیم کی طرف چشمک کرکے مسکرا دیتا ہے)

شمیم - (ہنسکر) چہ دانند .... ادرک - یہ سلیم اور سرور کی ڈال (سلیم سے) میں نے کچھ زیادہ پڑھا تو نہیں مگر اکثر گانے والوں سے اور بہت سے ریکارڈ میں سنا ضرور ہے چاہتا یہی ہوں کہ فرصت ملے تو پورے کلام سے مستفید ہوں —

سلیم - اگر آپ لوگ مفروضات اور کلیات سے قطع نظر کرکے' واقعات اور حقایق کی روشنی میں بحث کیجئے تو شاید میں بھی شریک رہ سکوں نہیں تو بقول داغ :—

نہیں ہوتی بلا سے طاعت زیادہ ؛ بس اب خالہ آیا کہ دوات زیادہ

سلیم - یہ کہتا ہوا جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا —

شمیم - بھائی کتنا لطیف شعر ہے اور آپ نے کس قدر موقع سے اسکو پڑھا ہے - زرا کی زرا بیٹھ جائیے اور پھر ایک بار پڑھ دیجئے —

سلیم - یہ مکرر ارشاد کی فرمایش تو کچھ مشاعرے ہی میں موزوں ہوتی ہے - آپ لوگ تو مباحثہ نہیں مجادلہ پر تیار نظر آتے ہیں - بیٹھوں تو کیا بیٹھوں —

نسیم بالکل صحیح ۔ جانے کس خوشگو کا شعر آپ نے داغ کی طرف منسوب کرکے پڑھ دیا اور زبردستی مرعوب کرکے داد و تحسین کی طلبگاری ہوئی ہے اور ہماری صحبت سے بیزاری ہوئی ۔ آپ کو ثابت کرنا پڑے گا کہ شعر داغ ہی کا ہے ' بھلا داغ اور ایسا شعر !۔

سلیم (مسکرا کر) قرآن اور انجیل میں تحریف کے افسانے تو بہت سن چکا تھا مگر آپ کا حسن ظن بھی ایک ہی ہے ۔ ادب کا کوئی معمل تو ہے نہیں کہ قطع و نشتر تحلیل اور تشریح سے ثابت کرسکوں' تعصب نے ذوق سلیم کو معطل کر رکھا ہے آپ خود ، داغ کی زبان اور طرز ادا سے مانوس نہیں ہیں ورنہ لفظ لفظ کہہ رہا ہے کہ میں داغ کی فکر نظم اور نظم فکر کا نتیجہ ہوں ' اب رہ گیا صرف ایک معیار وہ یہ ہے کہ میں اپ کو گلزار داغ میں یہ شعر چھپا ہوا دکھادوں غالبا اپ کو تسکین ہو جائیگی ۔ اگرچہ میرے نزدیک کسی چیز کا چھپ جانا یا مسودہ کی حالت میں رہنا دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے نہ پہلی صورت ثبوت صحت و صداقت ہے نہ دوسری شکل دلیل غلطی و کمی ہے ۔

نسیم یہ تو منطقی اصول ہیں اور بالکل صحیح ہیں مگر روزانہ کی زندگی محض منطق و فلسفہ نہیں ہے اگر آپ دیوان داغ میں بعینہ یہ شعر دکھادیں تو جانوں ۔

' گلزار داغ ' لایا گیا اور صفحہ ۱۸۷ پر سلیم نے وہی شعر دکھا دیا

نسیم نے فاتحانہ انداز سے نسیم کی طرف دیکھا نسیم نے ندامت بھرے تبسم سے

یہ سچ ہے کہ اسوقت میدان آپ ہی کے ہاتھ رہا ۔ مگر نرم کے باتی

میرے پاس محفوظ ہیں آخر میں بازی میری ہی رہےگی اور زبان بیزبانی سے یہی نکلے گا کہ (ع) فتح کا تاج رکھدیا سر پہ میری شکست نے ۔

شمیم ۔ تو بسم‌اللہ ۔ دیر ہی کیا ہے ۔ یہی گو ہے یہی چوگان اور یہی میدان بھی ہے آئیے دو دو ہاتھہ ہو جائیں' فرصت بھی ہے اور گلزار داغ بھی موجود ہے —

گلزار داغ کا پہلا صفحہ کھولا جاتا ہے اور پہلے شعر کو نسیم گلکھوں سے دیکھ، کر خاموش سا ہو جاتا ہے ۔ شمیم ایک خاص لحن ایک نرم مگر پر جوش لہجے میں جھوم جھوم کر پڑھتا ہے —

عدوئے سا مری فن دیکھے اعجاز رقم میرا
عصائے مولوی ہے حمد خالق میں قلم میرا

اللہ اللہ کیا شعر کہدیا ہے اور دیکھئے لسان الغیب کی طرح ان کے دیوان سے بھی فال لی جا سکتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ خاص اسی موقعے کے لئے یہ شعر نظم ہوا ہے اور اتنا پر اثر ہے کہ حمد کے سکے ایک طرف بٹھاتا ہے اور عدو کو ایک طرف سبک کرتا ہے —

نسیم ۔ شعر برا تو نہیں ہے مگر اچھا بھی نہیں ہے ۔ ذرا مصرعے برابر کے ہیں اور سامری اور موسیٰ کا تقابل ہے بس اور کچھہ نہیں ۔ مگر یہ تو بتائیے کہ کہاں نیزے کی ایک پور کا ھلکا سا دبلا پتلا مرزقی بالشقیہ (قلم) اور کہاں موٹا تگڑا لانبا چوڑا مستلقا (عصائے مولوی) یہ ہے جناب داغ کی شاعری' اوریہ ہے حسن فکر اور لذت تقابل' ۔ اسکے علاوہ چند بامعنی الفاظ ایک جگہ ہیں اور کچھہ نہیں —

سلیم ۔ میری نگاہ میں آپ دونوں خوش اعتقادی اور بد گمانی کے انتہائی مرے پر ہیں اور آپ کا (شمیم کا) یہ کہنا کہ لسان الغیب اور داغ کا کلام

دوش بدوش ہے بالکل غلط ہے اس لئے کہ لطف زبان، لذت شوخی، چاشنی معاملات اور تصویر کشی جذبات یہی خصوصیات کلام داغ کے ہیں۔ اور حضرت آپ کا قلم اور عصا والا اعتراض بھی محض ہٹ دھرمی اور جہالت ہے اس لئے کہ دو چیزوں میں تمام صفات کا مشترک یا مشابہ ہونا لازم نہیں انگریزی شاعری میں بھی روے محبوب کو چاند سے تشبیہ دیتے ہیں جن میں محض حسن نور وجہ شبیہہ ہوتا ہے ورنہ آپ تو علم طبقات سے واقف ہیں خوب جانتے ہیں کہ محبوب اور ماہ کی جسامت میں کتنے کروڑ گنے کا فرق ہے۔ داغ کا شعر صاف ہے، اچھا ہے مگر نہ اعجاز کلام ہے نہ حاصل زبان اور نہ ذات کلام ہے نہ تفصیل نظم سامری اور موسیٰ کے واقعات کی طرف جو لطیف اشارات ہیں وہ واقف مخاطب کے ذہن کو جلا دیتے ہیں اور لطف شعر کئی گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے —

نسیم ۔ ہاں اچھا مگر دیکھئے تو دوسرا شعر کس قدر پھیکا اور سست ہے۔ اس طرح داغ کے یہاں ۷۵ فیصدی بھرتی کے اشعار ہوتے ہیں جن کا نہ کوئی مصرف ہے نہ حاصل ۔

شمیم ۔ بالکل جھوٹ آپ داغ کے دیوان میں ایک شعر بھی سست یا پھیکا یا بھرتی کا نہیں دکھا سکتے یہ محض آپ کی سمجھ کا فتور ہے آپ کی عقل کا قصور ہے کیوں بھائی سلیم صاحب آپ کا کیا خیال ہے ؟ نسیم کی آنکھوں پر تو تعصب کے پردے پڑے ہوے ہیں —

سلیم ۔ مسکرا کر ۔ یہ تو وہی ہوئی نہ سوت نہ کپاس ، جلاہوں سے لٹھم لٹھا ابھی شعر کا تو کہیں پتہ نہیں اور شعر پر بحثیں ہو گئیں ۔

نسیم ۔ (منھ بنا کر) سنئے فرماتے ہیں —

برنگ بوئے گل ہے ہر نفس یاد الٰہی میں
قیامت تک بھرے گی دم نسیم صبحدم میرا

محض آورد ہی آورد ہے - تنافر لفظی ہے اور سستی پیکر شعر کے رگ و پے میں بھری ہوئی ہے —

شمیم - چہ خوش رعایت کو تنافر کہنا آپ ہی کا کام ہے - ذرا بست دیکھئے آورد کا کہیں نام بھی نہیں - کتنے پیارے انداز سے کہا ہے دوسرے مصرعہ میں جو دعویٰ ہے پہلے مصرعہ میں اس کی مکمل دلیل موجود ہے —

سلیم - آپ لوگ جوش تائید و تردید میں اپنے آپے سے گذر جاتے ہیں ' یہ شعر پہلے مطلع سے سولہ بیس نہ سہی تو اٹھارہ بیس ضرور ہے تنافر تو نہیں ہے مگر دلیل بھی مکمل نہیں اس لئے کہ " بوئے گل کی یادالٰہی میں مصروفیت " بجائے خود محتاج برہان ہے —

شمیم - بخشش کی شان اور جود معبود کی وسعت دیکھئے کسقدر عمدہ کہا ہے —

تری بندہ نوازی ہفت کشور بخش دیتی ہے
جو تو میرا جہاں میرا عرب میرا عجم میرا

نسیم - بڑی مشکل ہے اگر ان اشعار پر میں ادبی زاویۂ نگاہ سے ناقدانہ نظر ڈالوں تو آپ کہیں اعتقاد اور اسلام کے رنگ میں نہ رنگ لیں ، ورنہ بھائی سچ تو یہ ہے کہ یہ شعر دیوان سے خارج ہوجانے کے لائق ہے اس واسطے کہ پہلے مصرعہ میں "ہفت‌کشور" سے صاف پتہ چلتا ہے کہ داغ کی جغرافیہ دانی بالکل محدود تھی اُن کو صرف وہی تقسیم معلوم تھی جو آج سے دوسو برس پہلے ہی متروک کردی گئی تھی اور دوسرے مصرعے میں " جہاں میرا " کہنے کے بعد عرب میرا اور عجم میرا کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ' کل ' کا ذکر کرکے بعض اجزا کو ظاہر کرنا یہ ایک طرح کی

سمجھی جاسکتی ہے جیسے آپ کہیں کہ شمیم صاحب بحر جود ہیں اور چشمۂ سخاوت بجائے اسکے بہتر طریقہ یہ ہوتا کہ عرب میرا اور عجم میرا کے بعد جہاں میرا کہا جاتا ۔ دیکھئے اسی بات کو اقبال کس لطف سے کہتے ہیں ۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اسلام کی برکت اور دولت بھی خدا داد ہی ہوتی ہے ۔

شمیم (تیکھے ہوکر) آپ کے نزدیک شاعر نہوا جغرافیہ کا مدرس ہوا ۔ حضرت شاعرانہ طرز ادا اور جغرافیائی انداز بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے سارا جہاں کہہ دینے سے اور ہفت کشور سے جو کچھ مفہوم مترتب ہو سکتا ہے سب واضح ہو گیا ہے اب رہا دوسرا اعتراض بلندی سے پستی کی طرف آنے کا وہ بھی سطحی نظر کا پھیر ہے ورنہ جاننے والے جانتے ہیں اور علم اللسنہ کے شیدائی خوب واقف ہیں کہ عرب و عجم ملکر سارے جہاں کا جواب ہیں اس لئے کہ عرب ہمیشہ غیر عرب کو خواہ وہ روئے زمین کے کسی حصہ کا باشندہ ہو عجم ہی کہتے رہے اسمیں وہی نکتہ ملحوظ خاطر ہے ۔

سلیم میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ نسیم صاحب نے زرا تیزی سے تنقید کی ہے مگر جو تاویل شمیم صاحب نے کی ہے وہ بھی کچھ دور از کار معلوم ہوتی ہے ۔ کیا عجب ہے کہ اگر قافیے کی مجبوری نہ ہوتی تو داغ سا فہیم شاید اس مفہوم کو اس ترتیب سے ادا نہ کرتا ۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ شعر غزل میں کیوں داخل کیا گیا ۔ شمیم صاحب کا

یہ ارشاد کہ داغ کا ہر شعر آیت وحدیث ہے ' میری سمجھ سے باہر ہے اور نسیم صاحب کا یہ حکم لگانا کہ ۷۵ فیصدی بھرتی کے اشعار ہیں یہ بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا میرے نزدیک اردو کے تمام شعرا میں بالخصوص اور دوسری زبانوں کے شعرا میں بالعموم نرم گرم شعر ملتے ہی ہیں ، غالب نے اپنا دیوان انتخاب کے بعد چھپوایا اسی لئے نرم اور کمزور شعر نسبتاً انکے یہاں کم ہیں - انتخاب کی ضرورت داغ کے یہاں بھی ہے جو انتخاب داغ مروج ہے وہ تو کچھ ایسا اچھا نہیں - اور یہ کام بھی کچھ اتنا آسان نہیں ہے کہ جو چاہے کرے خود مصنف اپنے اشعار منتخب کرے تو دوسری بات ہے ورنہ بڑی دقت نظر کی ضرورت ہے کیونکہ منتخب اشعار صاحب انتخاب کے صرف ذاتی رجحان اور خلقی میلان کے آئینہ دار بن کر رہ جاتے ہیں ہر شخص اپنے مذاق اور اپنی پسند کے اشعار چن لیتا ہے —

تھوڑی دیر کے لئے سکوت ہو گیا —— ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن -

نسیم - لے لو یہ تو آٹھ بج گئے اور ابھی حضرت جنت مکان داغ مرحوم کے صرف تین شعر پر نظر ڈالی جاسکی ہے —

شمیم - جی ہاں اگر یہی لیل و نہار ہیں تو بھورھی ہو جائیگی - مجھے تو خیر مگر آپ کے لئے یہ شب بیداری کھل جائیگی - دیکھئے لسان الغیب کیسے نہ کہوں ، مقطع ملاحظہ ہو —

جلوں کا حشر تک اے داغ میں سوز محبت سے
نہ دیگی ساتھ تا روز جزا شمع حرم میرا

نسیم - خیر ذاں بازیوں کا تو بندہ قائل نہیں ہے مگر یہ شعر خوب کہا ہے واقعی بہت نفیس ہے شعر صرف ردیف وقافیہ صنائع اور بدائع زبان اور

محاورہ ، حروف و الفاظ وزن اور بحر کے مجموعہ کا نام نہیں اس میں ان سب کی ترتیب سے وہی روح آجانی چاہئے جس کے لئے چکبست کہتے ہیں کہ ۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشان ہونا

یا جیسے فلاطون معیار حسن کو رنگ و بو سے جدا صرف تناسب جسمانی و رو حانی سمجھتا ہے اسی طرح شعر بھی تناسب ترنم و مفہوم کا پیکر ہونا چاہئے ۔

شمیم ۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے ۔ بڑا داغ کی خوش نصیبی کہ آپ کی چشم تنقید نے ایک شعر پر تو صاد بنایا ۔ وقت بہت گزرتا جاتا ہے ۔ میری نگاہ میں بہترین طریقہ یہی ہوگا کہ سلیم صاحب اپنے نشان بنائے ہوئے شعر پڑھتے جائیں اور جہاں کہیں آپ کو کوئی اعتراض کوئی شبہہ یا کوئی کلام ہو وہاں تبادلہ خیالات ہو جایا کرے ۔

نسیم ۔ مجھے منظور ہے اگر سلیم صاحب کو کوئی خاص تکلیف نہو تو کم سے کم میں اُنکا شرمندہ احسان ہونگا ۔

شمیم ۔ اور میں بھی ۔

سلیم ۔ میں بڑی خوشی سے ہر خدمت کے لئے تیار ہوں اور مجھے بھی آپ حضرات کی بدولت یہ معلوم ہوجائے گا کہ میری نگاہ انتخاب کہاں تک ہے دیکھوں کیا کیا گل کھلتے ہیں ۔ ہاں سنئے :—

یہاں بھی تو وہاں بھی تو زمیں تیری فلک تیرا
کہیں ہم نے پتہ پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

نسیم ۔ کہنے میں بات آہی جاتی ہے ,, ہرگز ،، زائد ہے ۔

خسیم۔ نہیں تو۔ معانی میں بڑا زور پیدا ہو جاتا ہے —

سلیم۔ 'ہر گز' سے کوئی خاص زور تو پیدا نہیں ہوتا بغیر 'ہرگز' کے بھی مفہوم مکمل ہوتا مگر ہرگز زائد اور بے لطف بھی نہیں ہے —

صفات و ذات میں یکتا ہے تو اے واحد مطلق
نہ کوئی تیرا ثانی ہے نہ کوئی مشترک ٹھہرا
کسی کو کیا خبر کیوں خیر و شر پیدا کئے تو نے
کہ جو کچھ ہے خدائی میں وہ ہے لاریب و شک ٹھہرا

خسیم۔ بے مثل کہا ہے، بے نظیر کہا ہے۔ قادر، حکیم۔ صانع۔ اور علیم کی تعریف اتنے مختصر لفظوں میں اس سے اچھی نہیں ہو سکتی — یہ اعتقاد بھی ظاہر کیا ہے کہ لاریب وشک خدائی کی ہر چیز ٹھیک ہے پھر اپنی سادگی حیرانی عجز اور بے خبری کی تصویریں صرف ایک لفظ 'کیوں' میں کھینچ دی ہیں — میری کوریلی (انگلستان کی زبردست ناول نویس جسکی سیرت نگاری میں اکثر مابعد الطبیعات اور معاشرت کے پیچیدہ مسائل کا حل ہوتا ہے) کے بقول آخری 'کیوں' کا جواب ناممکن ہے — صوفیوں کا نازک مسئلہ 'ہمہ اوست' کا نور افشاں ہے بارکلے ایسے فلسفی کی خوش اعتقادی (کہ خیرو شر محض اضافی الفاظ ہیں) ہویدا ہے ہم ظاہر میں جس چیز کو انفرادی یا قومی یا وطنی حیثیت سے شر سمجھتے ہیں وہی دوسروں کے لئے خیر ہے روزانہ زندگی میں صدہا واقعات اسی قسم کے گزرتے رہتے ہیں۔ کسی جگہ کی فصل جس پانی سے سرسبز ہوتی ہے اسی پانی سے دوسری جگہ کی فصل برباد ہوتی ہے۔ اسی طرح تمام شر کو وسعت دیتے جائیے تو شر باقی ہی نہیں رہتا۔ اب پیدائش شر کی مصلحت خود خدا ہی کی طرح پیچیدہ اور ہمارے

و قوت و خبر سے بالا تر ہے' بقول اکبر اله آبادی :—

کھر کیا جو ذہن میں لا انتہا کیونکر ہوا

جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

هیوم کی تسکیک کا بھی مسکت جواب اسی شعر میں موجود ہے اس لئے کہ حقیقتاً ہمیں جس منزل پر پہنچ کر زرا سا سکون حاصل ہوتا ہے وہ منزل اسی اعتراف کی ہے کہ ہمارے محدود ذہن میں وہ لا محدود آهی نہیں سکتا - ورنہ جب تک دنیا قائم ہے بحثیں تو ہوتی ہی رہیں گی -

شمیم - وہ مارا ' آگئے حضرت جہلتے کے نیچے -

سلیم - نسیم صاحب واقعی میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں یہ مسائل اور یہ مفاہیم میری نگاہ میں نہیں تھے - مگر یہ تو بتائیے کہ پیدائش خیر وشر کا نزاکت آفریں مسئلہ کچھ سلجھا بھی یا اپنی جگہ پر رہ گیا -

شمیم - کیوں سلجھا کیوں نہیں - نسیم صاحب نے کتنی خوبصورتی سے تمام پہلوؤں پر نور افشانی فرمائی ہے -

سلیم - جو کچھ ہو ' میری سمجھ میں تو صرف یہی آتا ہے کہ شعر مزے کا ہے داغ کے شان شایاں ہے ورنہ یوں تو شکسپیر کے دو دو لفظ پر پوری پوری کتابیں لکھدی گئی ہیں اور آپ جس مصرعے یا فقرے کے معانی بیان کرنے پر آجائیں تو دس دس من مفہوم ٹھوک ٹھوک کر بھرا کئے جاسکتے ہیں - میں نسیم صاحب کی طلاقت کا تو ضرور قائل ہوگیا اور معلومات کی دھاک بھی بیٹھ گئی ورنہ اور تو کچھ معلوم نہیں ہوا - اچھا آگے سنئے :—

نہ جلتا طور کیوں کر کس طرح موسی نہ غش کھاتے

کہاں یہ تاب و طاقت جلوہ بیکسی مرهمک تھا

نسیم - یہ مردم تو مردم مردمک کیا بلا ہے - ؟

شمیم - اِس کا ت کو تصغیریہ کہتے ہیں —

نسیم - جیسے چشمک اور کودک —

شمیم - ھلس کر۔ اپنی قواعد دانی کے ثبوت تو نہ دیجئے - اس جگہ کاف سے سبکی اور حد مقصود ہے سننے والے کا ذہن فوراً مقابل معہود کی طرف راجع ہوتا ہے یعنی وہ لا محدود نور جس کے جلوے کی تاب پتلی کو نہیں ہے —

سلیم - اگر آپ لوگ یوں ہی بال کی کھال نکالتے رہے تو بس ڈیر ہی خیر ہے - بھائی وقت بڑی قیمتی چیز ہے - سمجھ سمجھ کر باتیں کیجئے مردم اور مردمک دونوں ایک ہی معنے میں استعمال ہوتے ہیں ضرورت قافیہ کی وجہ سے یہاں مردمک کا استعمال ہوا ہے —

۱۵۵ یہ ہے کہ وقت مرگ اسکی مشکل آسان ہو
زباں پر داغ کے نام آئے یارب یک بیک تیرا

نسیم - سلیم صاحب برہم نہوں تو کچھ کہوں ؟

سلیم - شوق سے —

نسیم " یک بیک " بھی صرف ضرورت شعری کی وجہ سے ہے ورنہ مصرعہ ایک الگل چھوٹا رہ جاتا، جب یہ ہے تو آخر بھرتی کے یہ الفاظ کہاں تک کام دیں گے —

شمیم - داغ کے یہاں ایک نقطہ بھی بھرتی کا نہیں ہوتا —

نسیم - اس سے تو میری تسلی نہیں ہوئی —

سلیم - اچھا تو سنئے - " یک بیک " کا صرف اس شعر میں بہترین ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ نزع کے عالم میں دنیا کے تمام جھگڑے اور واسطے اپنے

پورے پورے رنگوں میں مرنے والے کے پیش نگاہ رہتے ہیں - اس ہجوم سے تکلیف جاں کنی اور بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ خیال مرگ اور آرزوے زیست میں کشمکش ہوتی رہتی ہے ، یک بیک ' اللہ کا نام زبان پر آجاے تو تمام تکلیفیں تمناے وصال کی بدولت دور ہو جائیں گی اور تلخیء مرگ شیریں شوق سے بدل جائیں گی —

سلیم - لاے گا کعبہ سے تو مفت ثواب اے زاہد
حصہ پہلے سے ٹھہر جاے یہیں یاروں کا '

نسیم - رندوں کی زبان سے یہ مصرعے ادا ہوے ہیں اور تو کچھہ ہے نہیں - اور پھر " یاروں کا حصہ ٹھہر جانا " بھی کس قدر بازاری اور سوقیانہ محاورہ ہے - مذاق سلیم سے گرا ہوا ہے —

شمیم - ہنس کر اردو کے لغوی معنی ہی بازار کے ہیں - " سوقیانہ ، اور بازاری بھی چلو ان بدنصیب الفاظ میں ہیں جنہیں آج کل کے نقادین بے ضرورت اور بے محل استعمال کردیا کرتے ہیں رہا مذاق سلیم کا سوال وہ بھی کچھہ اتنا آسان نہیں ہے - میرے نزدیک ہر شخص اپنے ہی مذاق کو سلیم بلکہ اسلم سمجھتا ہے اور اس کو حق بھی ہے - اس کے برعکس کسی کو کسی کے مذاق پر معترض ہونے کا اس وقت تک کوئی حق نہیں ہے جب تک صاحب مذاق کے افتاد مزاج سے ملک یا قوم ادب یا زبان کا کوئی صریح نقصان نہ ہوتا ہو اور اس صورت میں بھی مذاق پر تو اعتراض ہو ہی نہیں سکتا - محض اشاعت سے خیالات کی روک تھام ہوسکتی ہے -

سلیم - میں نے تو محض ظرافت کی شوخی اور چشمک کی چٹکی کی وجہ سے اس شعر کو پسند کیا تھا آپ لوگ تو اسے اخلاقیات اور نفسیات کے دنگل بنائے دے رہے ہیں - آگے سنئے

اشک خوں آنکھ سے جلتے ہوئے اُگلے تڑپکے
کہ جہاں ہوں میں وہاں فرش ہے انگاروں کا

نسیم۔ بہت کمزور کہا ہے، دیکھئے کسی اور نے اسی محاورہ کو کیسی خوبصورتی سے کہا ہے—

چن کے افشاں جو نظر یار نے کی تاروں پر
آسماں رشک سے لوٹا کیا انگاروں پر

شمیم۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی کہ کمزور کہا ہے مضبوط کہا ہے۔ جو شعر آپ نے مقابلہ میں پڑھا ہے اس کا پہلو ہی دوسرا ہے۔ یہاں ہجر کی تکلیف کا سماں دکھایا گیا ہے وہاں آسماں کو رشک سے لوٹتا کہا ہے۔ یہاں زمین پر انگاروں کی چتا روشن ہے وہاں آسماں پر ستاروں کے انگارے دہک رہے ہیں کہتے ہیں ہم زمیں کی تم آسماں کی—

سلیم۔ اچھا اور سنئے—

چوس لیتے ہیں مرے زخم زباں پیکاں
چھوڑ دیتے ہیں منھ چوم کے سوفاروں کا

شمیم۔ نسیم صاحب کو اس شعر میں بھی چوسا چاٹی اور بوس و کنار کے مرقعے ہی مرقعے نظر آتے ہوئیے—

نسیم۔ میں لفظوں کا پجاری نہیں ہوں، مگر دوسرے مصرے کی کوئی خاص خوبی میری سمجھ میں نہیں آئی—

سلیم۔ خاص اور عام خوبی تو میں نہیں جانتا دوسرے مصرے میں بڑی نازک اور حسین سی بات کہی گئی ہے۔ تیر جب زخم میں پیوست ہو کر نکلتا ہے تو اس پر فطرتاً خون کی سرخی نظر آتی ہے۔ اسی

سرخی کی وجہ داغ صاحب یہ بتاتے ہیں کہ زخموں نے تیروں کا منہہ چوم کر چھوڑ دیا ہے اسی لئے کہ حسن محبوب اور انگوری گالوں پر محبت کے بوسہ کا سرخ دھبہ ہوکر نمایاں ہے —

کر میرے بت ہوش ربا کو نہیں دیکھا
اس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا

نسیم - تو گویا مطلب یہ ہے کہ داغ کا معشوق اور خدا ہم رتبہ اور برابری والے ہیں ؟ —

شمیم - جی نہیں بلکہ محبوب مجازی میں اسی کا جلوہ ہے - ہم لوگ اس نور مطلق کا بلا واسطہ درک کر ہی نہیں سکتے - مصنوع ہی سے صانع کا پتہ چلتا ہے - داغ کا معشوق اس کی صنعت اور قدرت کا مکمل نمونہ ہے - اس کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے مجاز کے زینوں سے بام حقیقت پر چڑھنا —

سلیم - تصوف اور سلوک کے مسئلے تو بہت پیچیدہ ہیں پھر کیف اس شعر میں میرے نزدیک داغ نے اپنے محبوب کی انتہائی تعریف کردی ہے کہ گویا دست قدرت نے اس کو حسن و کمال کے سانچے میں ڈھال دیا ہے —

سمجھا ہے شب ہجر عدو کو وہ قیامت
ظالم نے ابھی روز جزا کو نہیں دیکھا

نسیم - دیکھئے اسی مفہوم کو کسی اور نے کس خوبی سے کہا ہے —

ظالم و مظلوم کے انداز کھل ہی جائینگے
حشر میں جب رنگتیں ابھر یںگی ہر تصویر کی

شمیم - میرے خیال میں تو پہلا شعر کہیں بڑھا ہوا ہے - ظالم کی سادگی !

عدو کو جزا ئے قیامت کی تنبیہ اور کمسن محبوب کو پردہ ھی پردہ میں یہ بتانا کہ ھجر عدو کی رات سے روز جزا کہیں زیادہ حشر انگیز ھے یہ داغ ھی کا کام تھا

نسیم :- آپ ایسے خوش اعتقاد اور خوش فہم جو معانی چاھیں وہ نکالیں ورنہ داغ تو ھمیشہ سامنے کی کھلی ھوی سادہ سی سادہ بات کہتے ھیں اور کچھہ نہیں

سلیم - کبھی کبھی یہ ضرور ھوتا ھے ھمیشہ نہیں - مگر داغ کی سادگی غضب کی معنی آفریں ھوا کرتی ھے - ناتقہ سنج خوب جانتے ھیں کہ مشکل تحریر بہت آسان ھے اور بیان کی سادگی بہت مشکل ھے بات یہ ھے کہ سادگی بیان کا انحصار سادگی خیالات پر ھے آپ جتنا سلجھا ھوا اور مربوط نظم خیال رکھتے ھونگے آپ کے الفاظ بھی ویسے ھی سلجھے ھوے ھونگے سادگی کے لئے متانت خیال کے ساتھہ زبان پر قدرت بھی ھونی چاھئے - سادگی کے معنی صرف یہ نہیں ھیں کہ چند سادہ الفاظ ایک جگہ جمع ھو جائیں نہیں سادگی کے معنی یہ ھیں کہ آپ جس خیال کو ادا کرنا چاھیں ایسا صاف ادا کردیں کہ سننے والے کو سمجھنے میں زرا سا بھی الجھاؤ نہ ھو ' اور وہ جتنا غور کرے اتنے ھی نکات نکلتے چلے آئیں - سادگی دماغ سامع کے ساتھہ بالکل وھی کام کرتی ھے جو بصارت آنکھوں کے ساتھہ یا بجلی کی رو پیکر بیمار کے ساتھہ کر دیتی ھے - فطرت کا کام یہی ھے کہ وہ صلاحیت پیدا کردے پھر تو آپ کی طبیعت پر منحصر ھے کہ آپ جو کچھہ چاھیں وھی دیکھیں - یہی حال داغ کی شاعری کا بھی ھے کہ ظاھر میں تو ایک نورانی صفات اور سادہ پردہ نگاھوں کے سامنے رھتا ھے مگر دیکھنے والے اپنے درک اور ذوق کی مناسبت سے اس پردہ عکاس پر رنگینوں کی ایک مکمل فلم دیکھہ لیتے ھیں —

جنت ہے مگر خانۂ دشمن بھی الہی
آتے ہوئے اس گھر میں قضا کو نہیں دیکھا

شمیم - نسیم صاحب - آپ کے چہرے سے نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کو یہ شعر پسند آیا ہو نسیم خاموش رہتا ہے —

شمیم - دیکھئے تو کس حسن سے بدلہ لیا گیا ہے - کہتے ہیں کہ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ صرف جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں پیک اجل کی رسائی نہیں ہے - مگر دشمن کا گھر بھی محبوب کے آنے جانے سے جنت ہی بن گیا ہے جب ہی خانہ عدو میں دخل مرگ نہیں ہے - کاش یہ سمجھ نہ ہو اور کاشانۂ دشمن نذر موت ہو جائے -

سلیم - اتنا تو بتادے مجھے اے ناصح مشفق
دیکھا ہے کہ اس ماہ لقا کو نہیں دیکھا

شمیم - اللہ اللہ کیا بات کہی ہے - واقعی اگر ناصح مشفق نے اس ماہ لقا کو دیکھ لیا ہوتا تو غالب کے بقول :—

یہ کہاں کی دوستی ہے جو بنا ہے دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

ناصح مشفق بھی یا تو ہمدم و ہم ساز ہو جاتا یا چپ ہو جاتا - واقعہ ہی اگر ناقدین داغ کے محبوب معنی کو ایک نظر بھی دیکھ لیں تو اعتراض در کنار سو جان سے حسن کلام کے فدائی ہو جائیں - ماہ لقا ہی مخاطب کو ماہ کنعان کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور بے اختیار یوسف اور زلیخا کا قصہ یاد آجاتا ہے —

نسیم - یہ آپ کیا بے تکی باتیں کر رہے ہیں - بھلا خوب یوسف کی کہانی کو اس سے کیا غرض —

شمیم ۔ آپ تو بعض وقت بڑی تیزی سے کام لیتے ہیں ارے بھائی حسن تو کیا ہوتا ۔ جب مصر کی امیر زادیاں اور خود زلیخا کی سہیلیاں ملکہ پر نکتہ چینی کرنے لگیں کہ ایک زر خرید غلام پر کیوں عاشق ہو ۔ زلیخا کا کلیجہ سنتے سنتے پک گیا تو ایک روز چالیس حسین عورتوں کو ایک مجلس میں جمع کیا سب کے ہاتھوں میں ایک ایک لیمو اور ایک ایک چھری دیدی اور کہا کہ جب میں کہوں اسی وقت ان لیموں کو تراش کر دو ٹکڑے کر دینا ۔ یہ کہکر حضرت یوسف کو آواز دی کہ زرا آفتابہ لانا حضرت یوسف اندر آئے زلیخا نے ندا دی ہاں اب لیمو کاٹیئے ۔ حضرت یوسف فورا ہی چلے گئے تھے مگر برق حسن اپنا کام کر چکی تھی خرمن حواس جل چکا تھا ، لیمو تو سب کے سب سلامت رہے مگر چھریاں اپنے کام سے غافل نہیں رہیں اور ہر ایک نے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں ۔ جب چونکیں تب خبر ہوئی —

یہی حال سطحی نظر رکھنے والے نا قدین اور ظاہر پرست معترضوں کا بھی ہے ۔ اگر ان کو ایک جلوہ بھی نظر آجائے تو سا رے جھگڑے آپ سے آپ مٹ جائیں —

سلیم ۔ جب داغ کو دیکھا کسی بت خانہ میں پایا
گھر میں کبھی اس مرد خدا کو نہیں دیکھا

دامن دل کیا بچے اُس کے خرام ناز سے
چاک ہوجائے اگر دامان محشر زیر پا

پائمالی سے نشان قبر کی آیا نہ چین
رکھ لیا ظالم نے میرا نام لکھ کر زیر پا
توڑ کر اے محتسب میخانہ سے باہر نہ پھینک
آ نہ جائیں ریزۂ مینا و ساغر زیر پا

شمیم۔ سبحان اللہ۔ کس حسن سے محتسب کو روک رہے ہیں کہ شیشے کے ریزے کہیں کبھی کسی راہ رو کے پاؤں میں چبھ کر قیامتیں نہ برپا کریں —

خوف ہے اس کو نہ عالمگیر ہوے وقت ذبح
ہاتھ بسمل کا دبا لیتا ہے اندر زیر پا

وہ صراط عشق پر اے داغ ہو ثابت قدم
عشق کی ہو جس نے رکھہ کر تیغ و خنجر زیرپا

شمیم۔ بالکل سچ ہے۔ عشق و محبت کا راستہ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور باریک ہے —

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

بعد استاد ذوق کے کیا کیا
شہرت افزا کلام داغ ہوا

ثبات بحر جہاں میں اپنا فقط مثال حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا
پڑے ہوے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اس کی آنکھوں کے صدقے جس نے وہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا
جو تجھہ کو پایا تو کچھہ نہ پایا یہ خاکداں ہم نے خاک پایا
جو تجھہ کو دیکھا تو کچھہ نہ دیکھا تمام عالم خراب دیکھا

خواب غفلت سے داغ غش تھے دکھائے غفلت نے کیا تماشے

کہ سوتے سوتے جو چونک اٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

حاصل ہوئے مزے ترے ہاجر کے غیر کو

سر پر ہمارے مفت کا احسان رہ گیا

اے حشر امتیاز کہ ہم ہیں شہید ناز

مردوں کی طرح ہم کو اٹھایا نہ جائے گا

نسیم ۔ تو پھر آخر کس طرح اٹھایا جائیگا ۔ حشر میں بھی مردے زندہ ہو کر اٹھیں گے —

شمیم ۔ مگر شہید ناز تو خود ہی زندہ ہیں بھلا زندہ کیا زندہ ہوکر اٹھیں گے وہ تو اور ہی شان سے اٹھیں گے خمار دوآتشہ محبت کے متوالے میکدہ حشر میں بھی انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھیں گے —

سلیم ۔ چھپ رہیں گے حیا سے وہ کب تک

غصہ الزام سے تو آئے گا

نسیم ۔ واہ واہ کیا زبان ہے چھپہ رہیں گے کی جگہ چھپ رہیں گے کیسا حسین اختصار ہے اسی پر زبان دانی کے دعوے

شمیم ۔ بھلا ایسی گرفت کا جواب خموشی سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے —

سلیم ۔ رات بھر کہتے رہے اے داغ ان سے دل کا حال

ایک شب میں اسقدر اخلاص باہم ہوگیا

نسیم ۔ لیجئے یہ بھی تیز شاعری شروع ہوگئی ۔ مصحفی نے تو صرف اتنا

ہی کہا تھا کہ —

حجاب نو عروسان بردر شوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند

مگر داغ صاحب تو اور بھی بڑھ گئے - پہلی ہی رات میں ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ رات بھر دل کا حال ہی سناتے رہے —

شمیم - نے مسکرا کر سلیم کی طرف دیکھا —

سلیم - نسیم صاحب تم نے بھی تو عجب نہال اور رنگین طبیعت پائی ہے - فقرے فقرے سے شوخی ٹپکتی ہے - داغ کے شعر سے تو یہ حیا سوز پہلو کہیں سے ظاہر نہیں ہوتا - تمہارے ذوق نگاہ کو کیا کہوں - اچھا یہ تو بتاؤ کہ شیرینی اور تلخی چیزوں میں ہے یا زبان میں — ؟

نسیم - بھئی وہی منطق اور فلسفہ - شیرینی میٹھی چیزوں میں اور کڑواہٹ تلخ اشیاء میں ہے - زبان محض درک کا آلہ ہے —

سلیم - ہم تو آج تک یہی سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہے زبان ہی میں ہے - تو آخر یہ بتائیے کہ ایک ہی چیز بعض کو کم میٹھی اور بعض کو زیادہ میٹھی کیوں معلوم ہوتی ہے یا وہی چیز بعض کو کڑوی بعض کو میٹھی اور بعض کو پھیکی کیوں لگتی ہے یا وہی چیز ایک ہی آدمی کو صحت کی حالت میں میٹھی اور بیماری میں پھیکی یا کڑوی کیوں معلوم ہوتی ہے -

نسیم : جس کی جیسی قوت ذائقہ ہوتی ہے چیز بھی ویسا ہی اثر کرتی ہے -

سلیم : پھر تو ہمارا ہی خیال صحیح نکلا کہ خود چیزوں میں کوئی کیفیت موجود نہیں بلکہ قوت ذائقہ یا زبان پر سارا دار و مدار ہے -

نسیم : نہیں یہی غلطی تو آپ کرتے ہیں اور یہی مغالطہ منطقی مغالطہ ہے - یہ بلکل

صحیح ہے کہ کیفیت ذائقہ ایک ہی چیز کی بدلتی رہتی ہے مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خود شے میں کوئی ذائقہ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلاحیت درک یوں ہی مختلف رہتی ہے اور مختلف حالات کے بدلنے رہنے سے یا عادت اور مشق کی بدولت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے - آپ خود نکتہ رس ہیں لہذا مثالیں دے کر سمجھانا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں —

شمیم - ہاں سلیم صاحب یہ بات تو بہت زیادہ قرین عقل ہے اس لئے کہ کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی —

سلیم - یہ تو مان لیا مگر آپ کو خود اپنے قول کے مطابق یہ ماننا پڑے گا کہ جس چیز کو آپ بعض حالات کے ماتحت یا اپنے ذوق اور درک کی وجہ سے حیا سوز سمجھتے ہیں وہ دوسرے کے لئے حیا سوز نہ ہوگی اور بہتوں کے لئے کم حیا سوز ہوگی —

شمیم - جی ہاں یہ مانتا ہوں —

سلیم - تو پھر داغ کے کلام میں اگر حیا سوز اشعار بھی موجود ہیں تو ان کی اشاعت قابل تنقید ٹھہرے گی نہ کہ خود کلام —

شمیم - وہ کیسے —

سلیم - وہ اس طرح کہ جس حیا سوز کلام سے آپ ایسا وسیع النظر ذرا بھی متاثر ہوگا وہی لڑکوں پر یا کم پڑھے لکھوں پر برا اثر ڈالے گا —

شمیم - یہ بالکل سچ ہے —

سلیم - تو پھر اب یہ سوال ادبی نہیں رہ گیا معاشرتی بن گیا - لڑکوں کو ایک خاص سن تک ایسا صاف و سادہ کلام نہ پڑھایا جائے اس کی ذمہ داری والدین ، قوم اور حکومت پر ہے نہ کہ شاعر پر —

فہیم ۔ تو کیا اسکے معنی یہ ہوئے کہ ادب میں کیسی ہی نحش اور حیا سوز
چیز کیوں نہو اسکی اشاعت ضرور ہونی چاہئے —

سلیم ۔ نہیں یہ مطلب تو ہرگز نہیں ۔ اس لئے کہ ادیب اور شاعر بھی سماج
ہی کا ایک رکن ہوتا ہے مگر سوال اشاعت سے پہلے بعض امور پر
نگاہ ڈال لینی چاہئے ۔

فہیم ۔ وہ کیا ؟

سلیم کچھ کہنے ہی جارہے تھے کہ شمیم نے معترض ہو کر کہا اگر آپ
لوگ مناسب سمجھیں تو ان مباحث کو آخر کے لئے ملتوی رکھیں ورنہ سررشتہ
سلسلہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور ہم کہیں کے کہیں پہونچ جائینگے نسیم نے اس بات
میں سر ہلا دیا اور سلیم آگے پڑھنے لگے —

اسکی طرف سے دل نہ پھرے گا کہ ناصحو
اب ہو گیا یہ جسکا طرفدار ہو گیا

فہیم ۔ بھلا اس شعر میں شاعرانہ نزاکت کیا ہے ؟

شمیم ۔ استحکام وفا کو وضعداری کے پیرایہ میں ظاہر کیا ہے اور کتنی خوبصورتی
سے کہا ہے کہ اچھا ہو یا برا ابتو دل اسکی طرف ہو ہی گیا —

جسکی بغل میں شب کو وہ ہو اسکو دیکھئے
جسوقت آنکھ کھل گئی دیدار ہو گیا

نسیم ۔ وہ تو دیکھئے میں نے پہلے ہی کہدیا تھا کہ مخرب اخلاق اشعار کی داغ
کے یہاں کمی نہیں ہے

فہیم ۔ اخلاق کا سوال بھی آزادئی رائے، اور اشاعت ادب وغیرہ سے کم پیچیدہ
نہیں ہے اسکو بھی فی الحال ملتوی رکھئے ۔ مگر دیکھئے شخصیت پرستی کو
دخل نہ دیجئے ۔ اردو کے اور شعرا نے بھی اسی قسم کے مضامین کثرت سے نظم کئے ہیں

غالب سا نغز گو کہتا ہے —

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

ذرا آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ داغ کی تصویر زیادہ صاف ہے یا غالب کی۔ یہ ضرور ہے کہ داغ نے بہت صاف کر کے کہدیا ہے 'بغل' اور 'شب' کا لفظ بڑی بہت صاف ہے ورنہ جو شوخی اور مدھوشی غالب کے معشوق میں ہے داغ کا معشوق اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر ایک صاحب اور فرماتے ہیں

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اگر آپ بغل اور شب کو بالکل نوچتھے معنی میں نہ لیں تو کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی —

نسیم: اچھا تو پھر اس کے دوسرے معنی کیا ہوں گے؟ یہی کہ خیال یار میں مخمور داغ رات کو جس وقت چونک اٹھتا ہے معشوق کی تصویر خیالی کا دیدار کر لیتا ہے —

شمیم: جی ہاں یہی معنی ہوں گے۔ ماشاءاللہ آپ نے اردو شعرا کی تو اچھی سیر کی ہے۔ اردو تو اردو فارسی میں بھی بلکہ ساری ایشیائی شاعری میں ناظم اپنی قوت فکر، تخیل اور استقرا سے زیادہ کام لیتا ہے، یورپ کی شاعری میں مشاہدہ اور ذاتی عنصر کا زیادہ حصہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس اردو شاعری میں بالخصوص طبع آزمائی اور سحر بیانی تخیل اور تصور سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زمانے کا رنگ بھی ہمیشہ شاعر کے کلام پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ آپ اگر 'امیر' اور 'داغ' کے یہاں اکبر کی ظرافت؛ اقبال کی متانت اور صفی کی نزاکت

دیکھنا چاہیں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی اور آپ کو کوئی حق بھی نہیں ہے کہ رنگ عصر سے جدا ہوکر کلام کا مطالعہ کیجئے۔

سلیم: اللہ رے اس کا حسن ترقی بلا کی ہے
ہر موے زلف موے کمر سے نکل گیا
اس نے لیا جو آئینے میں بوسہ اپنا آپ
اللہ ری نازکی لب گلفام ھل گیا

شمیم: جذبات فطری کی کتنی سچی ترجمانی کی ہے ' ایک نازک مگر بیخود شباب اور سرمست نشۂ جوانی کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ہوتے ہی صبح کاش نہ مرتا شب وصال
افسوس ہے کہ یار بہت منفعل گیا

نسیم: سلیم صاحب جیسا آپ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا ہے کہ آپ ہماری گفتگو کو قلمبند کر کے مضمون کی شکل دیں اور کسی رسالے میں اشاعت کے لئے بھیجیں تو ناظرین سے اتنی التجا ضرور کر دیں کہ دو چار منٹ کی تکلیف اٹھا کر "یار کے منفعل ہونے کی وجہ" مدیر رسالہ کے پاس لکھ کر ضرور بھیجدیں۔ تمام رائیں اکٹھا ہوکر چھپ جائیں گی تو لطف آجائے گا۔

سلیم: بھائی یہ ترکیب بادی النظر میں تو بہت معقول معلوم ہوتی ہے۔ اچھا آگے سنئے۔

میں تفتہ جان آگ تو سیماب ہے وہ شوخ
اے دل ترا غضب ہے جو تو متصل گیا
میں نے تو اپنے واسطے کی تھی دعائے وصل
الٹا ہوا اثر وہ رقیبوں سے مل گیا

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ھمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

پیام وصل ھے کیوں اب رقیب کے ھاتھوں
نکالا تھا، مجھے آپ نے نکال دیا

ھمیم - بالکل یہ معلوم ھوتا ھے کہ کسی سے گفتگو ھو رھی ھے اور تغزل کے اصلی معنی بھی عورتوں سے بات چیت کرنے کے ھیں

نہیں عدو تو خیال عدو ھے خلوت میں
کسی بہانے سے تم نے نہ اس کو ٹال دیا

لئے تو چلتے ھیں حضرت دل تمھیں بھی اس انجمن میں لیکن
ھمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ھمیں سے پہلوتہی نہ کرنا

رھے ھو جس طرح دل میں رھو نظروں میں بھی یونہی
کہاں کی ایسی گھبراہٹ ھے ٹھہرو، دم تو لو، جانا

ھمیم - اس شعر کو، جلیل، مانکپوری کے اس شعر کے ساتھ پڑھئے تو لطف آئے

کھ کے پیچھے ھم آنکھوں میں پھیرنے کے لئے
دل میں آبیٹھے دلبر مرا ملنے کے لئے

جلیل صاحب پیچھا رھے ھیں۔ راستہ وھی ھے مگر داغ چاھتے ھیں کہ جاں کنی کے وقت بھی دم کے ساتھ آنکھوں میں پھیرے رھیں

بظاھر ھے دوئی پر اصل میں وحدت ھی وحدت ھے
نہ جانا ایک تو نے ھائے غافل دو کو دو جانا

ھمیم - یہ شعر کلام داغ کی مکمل تفسیر ھے - صاحبان نظر کے لئے مجاز و

حقیقت ایک ہی ہے۔ ان کے لئے سادہ الفاظ کے حجاب کوئی حجاب ہی نہیں ہیں

کسی کی شرم آلودہ نگاہوں میں یہ شوخی ہے
اسے دیکھا، اسے دیکھا، اِدھر تاکا اُدھر جھانکا

ہمیم۔ "قاتل" اور "دو" کی تشبیہ کے بعد اب نسیم صاحب آپ کو بھی اور آپ کے تمام ہمخیال حضرات کو اختیار رہے چاہے کسی کو "معشوقۂ بازاری" سمجھو لیجے یا ناظورہ فطرت

کیا ہے ایک دست آزاد نے وار دو جانب
زلیخا کے جگر تک پاک ہے یوسف کے داماں کا
سر محفل مجھی سے تجھ کو ظالم پردہ کرنا تھا
پھر اس پر یہ قیامت غیر کے دامن سے منہ ڈھانکا
رہی ان کی ہماری دل ہی دل میں گفتگو جب تک
مزا آتا رہا کیا کیا شکایت ہائے پنہاں کا
ہوئی ہیں دیدۂ مشتاق سے گستاخیاں کیا کیا
پہلے کو رخ نہ تھا مری طرف ان کے نگہباں کا
کھلا ہے جوہر آئینہ کیا کیا صورت غنچہ
لیا ہے جب سے بوسہ تو نے اپنے روئے جاناں کا
جو ہوسکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

نسیم۔ یہ پہلا شعر کیا ہے مسئلہ جبر و اختیار کا بے مثل حل ہے اور اس قابل ہے کہ دنیا ہمیشہ اس کو اپنے سامنے رکھے ایک طرف تو

۔ اس سے تحریک عمل اور آرزوئے کامیابی کے چشمے جاری ہوں دوسری طرف انسان کو بتایا گیا ہے کہ سائنس اور حکمت کی تمام تحقیقات انکشافات اور اکتشافات کے ساتھ ہی ساتھ اپنی حدوں اور مجبوریوں کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ آدمی تمام عالم میں اشرف المخلوقات ہے مگر اس کی ہستی مخزن ہستی کے سامنے وہی حیثیت رکھتی ہے جو سمندر کے سامنے قطرے کی ہوتی ہے مگر اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ آدمی صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ جائے ۔ نہیں اس کو ہر شعبے میں گامزن اور رواں عمل پیرا ہونا چاہئے ۔ آج تک جس طرح آدمی نے فطرت کے ہزارہا راز دریافت کرلئے ہیں، سمندروں پر ستاروں پر، ہواؤں پر اور معدنیات پر برابر فتح حاصل کرتا جارہا ہے یہی سلسلہ آئندہ بھی ہے اور خاص حدوں تک یہ تمام کامیابیاں ہوتی ہی جائیں گی اس لئے کہ " جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا " بالکل سچ ہے —

ہم پرسش کہو کیا وہاں جب یاں یہ صورت ہے
ادا اک حرف مطلب نازکی سے ہو نہیں سکتا
چمن میں ناز بلبل نے کیا جب اپنے نالے پر
چٹک کر غنچہ بولا کیا کسی سے ہو نہیں سکتا

۴۸۴ ۔ اس شعر میں بھی تحریک عمل کا لطیف ترین طریقہ استعمال کیا گیا ہے ۔ جو چیز کسی ایک کے لئے ممکن ہے وہی کسی دوسرے کے لئے بھی ناممکن نہیں ہے ۔

نہ رونا ہے طریقہ کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا
پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

شمیم ۔ ہماری آپ کی روزآنہ زندگی اسی شعر کی شاہد ہے و غربت کی پریشانی ہو یا کسی قسم کی پریشانی ہو ۔ جب سلطان جسم دماغ ہی برہم رہتا ہے تو نظام عمل میں درستی اور ربط کی امید ہی فضول ہے ۔

کب سے شب فراق ہوں مشتاق دید کا
خورشید ہو گیا ہے مجھے چاند عید کا

نسیم ۔ اس کا مطلب تو بتائیے ؟

شمیم ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی اور خیال میں تھے ۔

نسیم ۔ ہاں میں ابھی تک ,, آدمی سے ہو نہیں سکتا " کے لطف لے رہا تھا ۔

شمیم ۔ خیر اب تو چونکئے ۔ مطلب بہت صاف ہے ۔ جب کوئی بہت دنوں تک نہیں ملتا تو کہتے ہیں کہ آپ تو عید کا چاند ہو گئے یعنی اشتیاق کے باوجود بھی ۳۶۴ دن تک درشن نہیں ہوتے ۔ اسی محاورے کا فائدہ اٹھا کر داغ بھی کہتے ہیں کہ سحر ہی نہیں ہوتی آفتاب کیا عید کا چاند ہو گیا کہ نکلتا ہی نہیں ۔

سلیم ۔
ہوتا ہے قفل میکدہ اے میکشو نوید
رہنے دو محتسب کو محافظ کلید کا
پھر سے ہو گئیں تری وعدہ خلافیاں
پھر اعتبار ہے مجھے عہد جدید کا

شمیم ۔ واقعی محبت کی مجبوری بھی عجب مجبوری ہوتی ہے ۔

بلبل کی داستاں سنی گوش گل نے کب
انسان ہی کو لطف ہے گفت و شنید کا

شمیم ۔ ہاں ابھی تک تو ماہر نباتیات سرجگدیش چندربوس نے بھی اسکو

تردید نہیں کی - اگرچہ وہ دنیاے نباتات میں روح اور جان، جذبہ اور حس، فنا و بقا مسرت و غم کا پتہ لگا چکے ہیں اور خود اپنے ایجاد کردہ آلات سے ثابت کرچکے ہیں —

سلیم ۔ قاصد مرے سوال کا کوئی نہیں جواب
کاغذ بدل گیا ہو نہ خط کی رسید کا

ہمہم ۔ انسانی فطرت کا قاعدہ ہے کہ مایوسی میں بھی ڈھارس کی کوئی نہ کوئی سبیل سوچ ہی لیتا ہے، پھر داغ کی حیرانی بھی درست ہے اور معشوق پر الزام بھی نہیں ہے بلکہ کاغذ بدل جانے پر ساری بات ختم کردی گئی ہے۔

رکھنا وہ روک روک کے اڑتی نگاہ کو
رہنا وہ تھام تھام کے دل مدعو دید کا

اے داغ کیوں نہ سمجھو کو شفاعت کی ہو امید
میں ہوں محب حسین کا دشمن یزید کا

ہمہم ۔ سلیم صاحب آپ نے یہ خوب کیا کہ اس شعر کو بھی اپنے انتخاب میں شامل کردیا اگرچہ آج کل اردو کی صحافت میں تفرقہ انگیزی اور دل آزاری کا بازار خوب گرم ہے کہیں "ارگس بے حجاب" اور غالب بے نقاب، پر مضامین کا سلسلہ نکلتا ہے کہیں آتش کے سنی یا شیعہ ہونے پر صفحے کے صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں کاش یہ لوگ فساد برپا کرنے کے بجائے اپنی قوت فکر و استدلال کسی اچھے کام میں صرف کریں - تنقید کا یہ شعبہ کہ شاعر یا ادیب سنی تھا یا شیعہ اور اپنی پچ یا اپچ میں فرقہ دارانہ جذبات کی نشر و اشاعت میری نگاہ میں تو ادب کے لئے کچھ مفید نہیں ہے ۔ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے ۔

شاعر کے مذہب کے متعلق ایک مصرعہ میں ایک دریا بند کر دیا ہے فرماتے ہیں! —

جس وقت جو خیال ہے مذہب وہی ہے وہی

اور سوءوت ہی دوسری جگہ مذہبی بحث کو ادبی بحث سے جدا رکھنے کیلئے اپنے خاص پسند رنگ میں کیا خوب کہتے ہیں —

فالتو عقل مجھہ میں تھی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں.

سلیم - نہ میسر ہوئی کہیں خلوت
کچھہ ہمیں بھی کلام کرنا تھا

بلا سے اضطراب و درد ہی بنکر ٹہر رہنا کسی صورت سے تم رہنا مرے دلمیں مگر رہنا

کہاں عشق ہے اے داغ محو ہو جانا مجھے خبر ہی نہیں نفع کیا ضرر کیسا

ہمہم - ہاں خبر ہی کیسے ہو سکتی ہے!

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

اور پھر یہ تعلیم بھی ہے کہ عشق بے لوث ہی عشق ہے -

سلیم - منع مجھ کو ہی کیا رات کو مجھہ سے ہی کہا
میں گدا ہی کے کیا در پہ وہ درباں سمجھا

وصل کا وعدہ اشا رے سے نہیں ہوتا ہے
میں ترے سر کی قسم کچھہ نہ میری جاں سمجھہ

نوشتہ میرا بے معنی تو دل بے مدعا میرا مگر اس عالم اسباب میں میں بے سبب آیا

جان زلف سیاہ نے مارا تیر کافر نگاہ نے مارا

شمیم - چاہے نگاہ کو کافر سمجھئے چاہے کسی کو کافر نگاہ سمجھئے شکار کا پورا سامان اکٹھا ہے پھر ردیف اور قافیہ کی چستی اور نشت کی خوبی نے چار چاند اور لگا دئے ہیں

سلیم - کیا کیا مغز کا ہم کا داں
سجھہ کو اس خبر ھواہ نے مارا

خوش ہے کافر بھی اس کی رحمت پر ھائے اس اشتباہ نے مارا

شمیم - جانے کیوں اس موقع پر 'داغ' کو 'سعدی' یاد نہ آئے تھے...

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب گبر و ترسا وظیفہ خورداری
دوستان را کجا کنی محروم تو کہ با دشمنان نظر داری

سلیم - لیتا ہوں بوسہ ہائے خط سبز کا مزہ ہے زہر اندروں مرے منہ کو لگا ہوا

نسیم - واہ بھائی واہ ' عادت بھی کیا چیز ہوتی ہے ' سنکھیا سی قاتل چیز بھی تریاک کا کام دے جاتی ہے

سلیم - ہم اب سے لینگے بوسۂ گل تیرے سامنے
کیا ایسا لعل ہے تیرے لب میں لگا ہوا

نسیم - یہ تو سب معشوق کی توہین ہے

شمیم - جی نہیں - اپ سمجھے نہیں - یہ صرت کہنے کا طریقہ اور سوال کا ڈھب ہے - محاورہ کا محاورہ نظم ہو گیا اور حسن طلب کا پردہ

اردو

جلد ۱۱   جولائی سنہ ۱۹۳۱ ع   حصہ ۴۳

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

خطبات گارساں دتاسی

خطبہ نواں

از

(مترجمہ جناب عبدالباسط صاحب - انگریزی سے اردو
میں مولوی نظیر حسن صاحب فاروقی نے کیا)

ایشیاٹک لائبریری کی آرائش کی وجہ سے جو طویل وقفہ واقع ہوا اُس کے بعد آج میں پھر اپنے لکچروں کا سلسلہ شروع کرتا ہوں ۔ یہ اء ۲۵ ایسی حالت میں کیا جارہا ہے جب کہ اِس امر کا اطمینان ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں سنہ ۱۸۵۷ ع کا منحوس فساد جس کا مقصد انگلستان سے اِسے ملک کے چھین لینے کا تھا جو اُس کے تاج کا سب سے خوبصورت نگینہ ہے اب فرو ہو گیا ہے اور پھر امن و امان قائم ہو گیا ہے —

ہمیں امید ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ اِس تباہی کی تلافی اور اہل ہند کی (جن پر خدا نے اسے حکمراں کیا ہے) فلاح و بہبود میں سعی کرے گی۔ ہندوستانیوں میں یقیناً برائیاں ہیں لیکن ان میں خوبیاں بھی ہیں سب سے بڑھ کر ان میں ایک ایسی خوبی ہے جس نے انہیں انگریزوں سے قریب تر کر دیا ہے یعنی اپنے خوشنما ملک کی الفت یا حب وطن۔

اس امر کا تحقیق بآسانی ان کے اپنے کلام سے ہوسکتا ہے - السروس کو سنئے:-

"ہندوستان کی سرزمین تمام عالم سب سے نرالا ہے کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی، اور کسی سلطنت کی آبادی اس کو نہیں لگتی، یہاں کی ہر ایک بستی میں گھما گھم، جا بجا ایک نئی طرح کا عالم ہر شہر و قصبے میں ستھری پاکیزہ پختہ و متعدد سرائیں مسافر کے واسطے ہر موسم کے اترھائے بچھونے اور اقسام کی غذائیں اکثر بستیوں میں مسجدیں خانقاہیں مدرسے باغات، غریبوں کے کسبی مسافروں کے نئے متعدد مکانات - قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان میں بسیں اور رفعت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے برسیں - ندی نالے تالاب کوئیے لطیف و پاکیزہ ہزارہا، پانی ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا - بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں نواڑے بجرے وغیرہ بے شمار شاہراہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں میں پل بند ہے ہوئے تیار، اکثر رستوں میں کوسوں تلک سایہ دار درختوں کی دو رستہ قطار - ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک مینار نمودار - ہر ایک چوکی پر ہمہ چیز مہیا سودے والوں کی دوکانیں جا بجا، مسافر خوش و خرم کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں، اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں"-

ایک ہندوستانی مصنف مقبول * ہندوستان کے متعلق اسی انداز سے رطب اللسان ہے لیکن اس نے تشبیہات و استعارات سے بہت کام لیا ہے :-

ہندوستان ربع مسکوں کا پانچواں حصہ ہے میں اس کا ذکر کیا کروں وہ بذات خود ایک عالم ہے، اس نے تمام ملکوں کو شان و شوکت میں مات کردیا ہے - اس کی بے شمار خوبیوں کے منجملہ ایک آب وہوا ہے جو دوسرے ممالک سے بالکل مختلف ہے - علم وہنر

* ہیر رانجھا مقدمہ ۳ و صفحہ ۵

صنعت و حرفت، زبان و ذکاوت، تمدن و تدبیر میں یہ ملک محل شہرت کا محراب* ہے۔ اگرچہ دوسرے ممالک میں بھی بعض تلاش یہ صفات پائی جاتی ہیں لیکن ان ممالک اور ہندوستان کے مابین ویسا ہی فرق ہے جیسا سورج اور دیگر کے ٹمٹماتے تاروں میں یا زمین و آسمان میں۔ ہندوستان میں جو لوگ دوسرے ممالک کی اشیاء کی تقلید کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت موجد کی حیثیت رکھتے ہیں – وہ زبان اس عہد کی سے سیکھتے ہیں کہ خود اہل زبان سے بڑھ جاتے ہیں – ترک، عرب، حبشی، ایرانی اور انگریز جو عرصے تک ہندوستان میں رہے بسے وہ یہاں کی زبان بآسانی سیکھہ سکتے اور آتش حسد میں سوختہ ہوتے رہتے ہیں" ہندوستان کی خونناک شورش نے انگلستان کو بدحال نہیں کیا – اس نے اس کو فرو کر لیا اور تقریباً تمام ملک میں پورا نظم قایم ہو گیا ہے —

گدھ کا غیظ اور کچھوے کا عشق

کبھی رنجیدہ کرتے اور کبھی جرم کی انجام دہی پر ابھارتے ہیں †

علاوہ بریں اب ہندوستان کا تعلق براہ راست قایم برطانیہ سے ہو گیا ہے۔

---

* یعنی سب سے ممتاز جگہ – مشرقی مکانوں میں دیواروں میں بہت سے طاق ہوتے ہیں اور ان میں اسی طرح سجاوٹ کا سامان رکھا جاتا ہے جس طرح مغربی ممالک میں آتش دان کے اوپر کے حصے پر۔ مساجد میں محراب کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو گرجاؤں میں قربان گاہ کی – یہاں شمعیں روشن کر کے رکھی جاتی ہیں اور ان کا رخ قبلے کی جانب ہوتا ہے – (۱۲) مصنف

† لارڈ بائرن کی نظم " ابیڈاس کی دلہن " (   ) باب (۱)

هندوستانی کمپنی ویسٹ انڈیا کمپنی * کی جگہ اب ایک شفیق ملکہ حکمراں هے - اهل هندپوئے اس هستی کے جسے وہ آنریبل کمپنی بہادر کے نام سے موسوم کرتے تھے اور جس کے متعلق اکثر اهل هند کا خیال تھا کہ وہ خواجہ خضر کی طرح همیشہ رهنے والی مخلوق هے اور دور دراز ملک میں رہ کر اپنے نائبین کے ذریعہ حکمرانی کرتی هے ' یقیناً اس ملکہ کی اطاعت برضا و رغبت کریں گے -

یکم نومبر گزشتہ و اس تبدیل حکومت کا اعلان † بڑی شان کے ساتھ کلکتہ میں کیا گیا جو برٹش انڈیا کا دارالسلطنت اور هندوستان کا ایک بڑا شہر هے - اس کا بہت اچھا اثر پڑا جس کا ثبوت ان ایڈریسوں سے اور نظموں سے ملتا هے جو بعد میں لکھی گئیں —

میرے روبرو ایک هندوستانی نظم ‡ هے جو آگرہ میں چھپی هے - یہ ایک

---

* سنہ ۱۶۰۱ ع میں ملکہ الزبتھ نے تجار کی ایک جماعت کو مشرقی هند میں تجارت کرنے کی اجازت عطا کی تھی —

† میرے پاس دو نسخے اس شاهی اعلان کے دو مختلف خطوں میں هیں جو بعض احباب نے اپنی عنایت سے مجھے بھیجے تھے - فارسی حروف میں مسلمانوں کے لئے اور شکستہ یا جیسا کہ عام طور پر مشہور هے دیوناگری حروف میں هندؤں کے لئے - میری رائے میں ان کی عبارت بہت آسان هے جسے عام لوگ بھی بسہولت سمجھ سکتے هیں - بریں هم میرے پاس دو نسخہ هے الہ آباد کا مطبوعہ هے ' اس کی طباعت میں بہت لاپروائی سے کام لیا گیا هے —

‡ اس طرح کی اور نظمیں بھی شائع هو چکی هیں - مثلاً راجہ کاشی پرشاد بہادر نے ایک نظم شائع کی هے جس کا ذکر یہاں مختصر طور پر حوالہ کیا گیا هے بیشک یہ نظم سنسکرت میں هے جو هندوؤں کے لئے بمنزلۂ لاطینی کے هے - راجہ نے اس زبان کا استعمال مناسب سمجھا —

قصیدہ ہے جس کا عنوان جلوس ہے ۔ یہ مرزا حاتم علی خاں کا لکھا ہوا ہے جن سے ہندوستان کا ادبی حلقہ مہر کے نام سے آشنا ہے ، یہ سلطان فاضل اور یورپین تہذیب کا حامی سنہ ۱۸۵۷ع کے غدر سے قبل غازیپور میں منصفی کے عہدے پر مامور تھا غدر میں خوش قسمتی سے اس نے ستر مرد اور بہت سے یورپین بچوں کی جانیں بچائیں ، ان کا ذکر اُس خط میں ہے جو نظم کے ساتھ شائع ہوا ہے اگرچہ اس نظم کی دہلی کے مشہور ہم عصر شاعر مرزا اسداللہ خان مضطر * نے بہت داد دی لیکن مجھے اس میں کوئی قدرت معلوم نہیں ہوتی ابتدا میں مصنف یہ استفسار کرتا ہے کہ تمام یہ انتظامات جو نظر آرہے ہیں کس غرض سے ہیں ۔ اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ شاہی فرمان پڑھا جائے اس کے بعد بالکل مشرقی رنگ میں شاہ لندن کی مدح سرائی ہے جس کا چمکتا ہوا چہرہ برلی فلک (زہرہ) میں منعکس ہے ، اس کے بعد ہی لارڈ کیننگ کی تعریف شروع ہو جاتی ہے اس کے بعد دوسرے عہدہ داروں کی مثلاً مسٹر ایڈمنسٹن اور صاحب علم و عزت ولیم میور کی جن کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تمام علوم و فنون میں ملکہ کامل رکھتے ہیں جنہیں روے زمین کے تمام بادشاہوں سے لے کر آج تک کے فرمانرواؤں کی تاریخ سے واقفیت ہے

اعلان ، ملکہ وکٹوریا نے اپنے لئے یہ خطاب اختیار کیا ہے :- کوئن آف انگلش کالونیز و ڈومینس ان یورپ ، ایشیا ، افریقہ ، امریکہ و آسٹریا

Queen of English Colonies in Europe . Asia ' Africa Austria

---

* یہ یقیناً جناب پروفیسر کی غلطی ہے اسداللہ خان غالب ہونا چاہئے ۱۲ - مترجم

† مصنف نے اپنے یورپین ناظرین کی دل چسپی کے لئے کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی مناسب سمجھا ہے لیکن اس سے اس خوش مذاقی کی نسبت شبہ ہوتا ہے —

(یعنی انگریزی نوآبادیات و ملحقات موجودہ یورپ ' ایشیا ' افریقہ ' امریکہ و اسٹریلیا کی ملکہ) اس نے لارڈ کیننگ (Lord Caning) کو برٹش انڈیا کا پہلا وائسرائے و گورنر جنرل اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ اس کی بجائے بتوسط سکریٹری آف اسٹیٹ Secretary of State لارڈ اسٹینلی Lord Stainly اس ملک کا انتظام کریں - لارڈ اسٹینلی Lord Stainly کی مدد کے لئے ایک کونسل معین ہوئی جس میں ہندوستان کے بہی خواہوں کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ سر ہنری رالن سن Sir Henry Rawlinson مسٹر ایچ ' پی پرنسیپ Mr. H. p. prunsap جو مشہور عالم جیمس پرنسیپ James prunsap متوفی کے بھائی ہیں اور مسٹر ڈبلیو ' آئی ' ایسٹ وک Mr. D, J. East wak شریک ہیں جو بی ایسٹ ورک B. East wark مشہور مستشرق کے بھائی ہیں جس کا تقرر اس وقت ایسٹ انڈیا ہاوس IndiaHouse کے محکمہ خفیہ میں انڈر سکریٹری Under Secretary کی خدمت پر ہوا ہے -

پنجاب نیا صوبہ بنایا جائے گا اور سر جان لارنس - Sir John Lawrance جو سر ہنری Sir Henry Lawrance کے بھائی ہیں جن کی افسوس ناک موت ہمیشہ یاد رہے گی مستقل طور پر اس کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیں گے جو فی الوقت عارضی طور پر آنریبل رابرٹ منٹگمری Hon Robert Montgomary کے ہاتھ میں ہے -

صرف انہیں تغیرات پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہیلسبری Hailsbury کا ایسٹ انڈیا کالج قطعی طور پر ۱۴ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ ع کو مسدود کر دیا گیا اور اس موقع پر ایک سنجیدہ مجلس تقسیم انعامات کی منعقد کی گئی جس کے صدرنشین - ریورنڈ مسٹر میلول Mr. Malwill پرنسپل کالج تھے - یہ

کالج پچاس سال سے قایم تھا، اس میں سے ۳۰۵۵ * تلامذہ فارغ ہو کر نکلے جن میں ایسے افراد بھی ہیں جن کی شہرت یورپ بھر میں ہے - اس کالج کے پروفیسروں میں میکی ناٹن، اسپ سن، جرمن، اور مشرقی السنہ کے لئے ہاٹن، اسٹوارٹ، جانسن اور ایسٹ وک جیسے افراد تھے - ایسے فاضل پروفیسروں کے ہوتے ہوئے یہ امر باعث تعجب نہیں کہ یہاں سے کیسے کیسے قابل لوگ نکلے —

ہیلسبری کالج کی مسدودی سے جو نقصان مشرقی علوم کی تحصیل میں واقع ہوا ہے اب اسے محسوس کیا جا رہا ہے - توقع ہے کہ انڈیا کونسل جدید کالج ان نوجوانوں کے لئے قائم کرے گی جو انڈین سول سروس کے لئے نامزد کئے جاتے ہیں کیونکہ اس نے ایڈسکومب Addis com کا ایلی ملٹری کالج فوجی خدمات کے لئے ایسے تغیرات کے ساتھ برقرار رکھا ہے جو دوران تعلیم میں ہندوستانی کو عام زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے میں معاون ہوں - سلاہ ہرسٹ Sandhurst کے رائل ملٹری کالج میں بھی ہندوستانی زبان پڑھائی جائے گی اور سنہ ۱۸۶۰ میں اس کا دروازہ بلا امتیاز ایسے خواہش مندوں کے لئے کھول دیا جائے گا جو ان شرائط کی تکمیل کرسکیں جو اس درس گاہ کے داخلے کے لئے عائد کی گئی ہیں - بالآخر یہ بھی تصفیہ ہوچکا ہے کہ اکسفورڈ یونیورسٹی میں جو انگلستان کی ممتاز ترین یونیورسٹی ہے ہندوستان کی تعلیم دی جائے گی اور اس کے لئے ایک خاص مسند قائم کی جائے گی —

حضرات! ہندوستان کی اصل حالت سے آپ نے کافی طور پر یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ فی الحال مجھے کوئی ادبی واقعات یا کوئی مستند تصنیف

---

* ایلنس انڈین میل Allin's Indian Mail

ایسی دستیاب نہ ہوں جس کا میں آپ سے ذکر کرتا - اس بغاوت نے ادبی ترقی کو روک دیا جو چند سال سے ہندوستانیوں میں نمایاں تھی اور جس نے طویل مذہبی تنازع کے باوجود لوگوں کو اپنے بچوں کو قومی مدارس کے فقدان کی وجہ سے انگریزی مدارس میں بھیجنے پر مائل کر رہا ہے کیونکہ بغاوت کے وقت ہزاروں مدارس عیسائی مشنری انجمنوں کے قائم کئے ہوئے موجود تھے اور ستر ہزار طلبہ ان میں شریک تھے - یہاں انگریزی کی عام تعلیم عام طور پر ہندوستانی کے توسط سے ہی جاتی تھی *

عرب شاعر کا سی سرور کے الفاظ کی عطا الحسنہ میں یہہ کہنا اصول ہے کہ ادا کی معیت ہے کہ کلام تہذیب زبانی کے بعد اس کے وجد (معشوق) کے لئے نوکدار تلوار بن جاتا ہے † - اس لڑائی نے کلام کو بیکار بنا دیا اور گنگا کی شعر و ادب کی دیویاں گزشتہ دو سال سے عالم سکوت میں ہیں - بہر حال مجھے یہہ معلوم ہوا ہے کہ ادبی تحریک جو لڑائی کی وجہ سے معطل تھی اب پھر جنبش میں آچلی ہے اور اس کی پہلی بہار چند نظمیں تاریخ اور بعض رسالے ہیں جو حالیہ شورش کے متعلق تالیف کئے گئے ہیں اس قصیدہ کے علاوہ جس کا میں اس سے قبل ذکر کرچکا ہوں ایک رسالہ ایک مسلمان کا لکھا ہوا ہے آگرہ میں حقیقت الجہاد کے نام سے شایع ہوا ہے مصنف یہہ کہ گزشتہ بغاوت کے مدنظر جہاد و فساد میں کیا فرق ہے - ایک ہندوستانی نظم بھی انگریزوں کی فتح دہلی کے

* غالباً قمرالدین صاحب جو یورپ میں اپنی تعلیم ختم کرکے بمبئی میں بیرسٹری کرنے کے لئے واپس ہوئے ہیں ایسے ہی کسی ایک مدرسے سے ولایت تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے تھے —

† ملاحظہ تصنیف عبدالقادر ترجمہ ایم جی وجہت صفحہ ۱۱۸

متعلق لکھی گئی ہے جو فتح دہلی کے نام سے موسوم ہے - یہہ راحت کی ضمیمہ ہے جس کی اور بھی تصنیفات ہیں مجھے یہہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایم ' ای ' ڈی اولڈور نے ایک اردو ترجمہ ہندستانی اصولوں کی اشاعت کا شائع کیا ہے اور سنسکرت کے عالم بابو راجندر لال متر نے باپ کا ایک جدید ہندوستانی تذکرہ (اشخاص اور کتب کے حالات پر) اس وقت کلکتہ کے ایک مطبع میں زیر طبع ہے —

اِس کے ماسوا ایک رسالہ موسوم بہ " بامداد " بمبئی سے اسی سال جاری ہوا ہے - یہ یورپین خیالات کا موید ہے کیونکہ ایک قریبی اشاعت میں اس نے اپنے ان ناظرین سے جنھیں فرصت ہے اور تین ہزار کے اخراجات کے متحمل ہوسکتے ہیں - انگلستان جانے کی استدعا کی ہے - اس کے ساتھہ یہی لکھا ہے کہ جن لوگوں سے ہم مخاطب ہوں اُن میں سے بعض یہ اعتراض کریں گے کہ ہمارا مذہب معرض خطر میں پڑجائے گا - یا ہم اسے بالکل کھو بیٹھیں گے لیکن وہ مذہب ہی کیا جسے تم زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ساتھہ نہ لے جاسکو * —

بہت سے ہندوستانی رسالے جن کے متعلق میں اس سے قبل بیان کر چکا ہوں سنہ ۱۸۵۷ میں بغاوت کے رونما ہونے پر ناپید ہو گئے - رسالہ خیر خواہ ہند

---

* ایلنس انڈین میل Allin, Indian mail سنہ ۱۸۵۲ صفحہ ۸۹۹ - اسی رسالہ میں سنہ ۱۸۵۸ (صفحہ ۹۴۴) یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اجمیر کے اکثر سر بر آوردہ طلبہ نے یہ تصفیہ کیا ہے کہ ایک رسالہ دوکالموں میں اردو و ہندی کا شایع کریں ' اسی میں بمبئی کے رسالہ موسوم راست گفتار کا ذکر ہے - اس اخبار کے وجود کا مجھے اس سے قبل تک علم نہ تھا اور لکھا ہے کہ اس میں منجملہ اور مضامین کے ایک دو سا بھائی فرامجی پارسی کا لندن کے سیلمف ہال کے حالات کے متعلق ہے —

جو مرزاپور سے سنہ ۱۸۳۷ سے فارسی اور لاطینی حروف میں شائع ہوتا تھا بلکہ ہو گیا - یہ رسالہ لندن کی مشنری سوسائٹی کے پادری ماتھر Red - mathir کے زیرادارت سترہ سال سے جاری تھا - یہ صاحب بہت سی مذہبی کتابوں کے مصنف ہیں جو ہندوستانی میں لکھی گئی ہیں - اور اس بائبل کے مرتب ہیں جو ہندوستانی زبان میں رومن خط میں لکھی گئی ہے جس کی ۳ ہزار کاپیاں لندن میں شایع ہوی ہیں اور اُس کے حاشیہ پر اصل انجیل * ہے - نہ صرف امریکن مشنری سوسائٹیوں نے اس اخبار کو چلایا جیسا کہ میں نے اپنے سنہ ۱۸۵۳ کے لکچر میں بیان کیا تھا بلکہ ہرفرقے کے پراٹسٹنٹ مشنریوں کے مضامین بھی فراخ دلی سے شائع کئے جاتے تھے - اس رسالے کا مقصود تبلیغ مذہب اتنا نہ تھا جتنا کہ دیسیوں میں علم کی اشاعت - ہمیں امید ہے کہ وہ پھر اسی طرح دوبارہ شایع ہونے لگے گا جس طرح دھارم گزٹ جس کا مدیر سال بھر کے وقفے کے بعد اس قابل ہوگیا کہ اس نے اپنے برباد شدہ مکان کی از سرنو تعمیر اور مطبع کی تجدید کرلی اور مطبوعات کی اشاعت پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے —

صوبۂ پنجاب فساد سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے اثر پذیر نہ ہوا - وہاں ادبی اشاعت میں خلل نہیں پڑا - میرے دوست سید عبداللہ نے حال میں میرے پاس ایک فہرست دوسو مختلف مطبوعات کی بھیجی ہے جو لاہور سے شایع ہوئی ہیں - ان میں نئے دیوان ہیں نیز تفتہ کی ایک تضمین ہے گلستان کی نظموں پر - امانت کا ایک مرثیہ اور مخزن العشق مصنفہ تلسی رام اور فلنوہ آرزو (ان آخری دو کتابوں کی حقیقت سے میں ناواقف

---

* اس نسخے کے چند صفحات میرے پیش نظر ہیں ' میری رائے میں بڑی احتیاط سے یہ نسخہ معقول ہندوستانی عبارت میں شائع ہوا ہے جسے اہل ہند آسانی سے سمجھ سکتے ہیں :—

ہوں) غالباً یہہ منظوم انسانے ہیں لیکن کوہ نور رسالہ جو لاہور سے ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہے بدستور جاری ہے اور اب دس جلدوں تک اس کی نوبت پہنچ گئی ہے ۔ میرے روبرو ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء کا پرچہ ہے جو سولہ صفحے کی چھوٹی تقطیع پر دو کالموں میں ہے لیکن اس میں خاص طور پر کوئی بات دلچسپی کی نہیں ہوتی —

مجھے معلوم نہیں کہ دہلی کا بڈھا بادشاہ باوجود بغاوت کے ان نتائج کے جو اس کے لئے باعث تباہی ہوئے اور جس میں اس کی حرکت بحیثیت سرغنہ متصور کی جاتی تھی اب بھی شعر و سخن سے شوق رکھتا ہے یا نہیں - بہر حال وہ اپنی قلیل المدت حکومت کے زمانے میں شاعری کا شغل رکھتا تھا - ذیل میں اس کے تین شعر درج ہیں جن کا انگریزی اخبارات کے ذریعے سے ہمیں علم ہوا ہے :—

مجھے حق کی قوت کی ستائش کرنے دو - عیسائی اپنے ہی ہتھیاروں سے پسپا ہوئے نہ روس سے نہ روم سے تمہیں کوئی مدد ملی - خود انگریزوں کے کارتوسوں نے انہیں ہلاک کیا ہماری فوجوں نے انہیں گھیر لیا اب ان کے لئے نہ ٹھکانا ہے نہ چین - ان کی موت فیصل شدہ امر ہے وہ صبح میں انجام پائے یا شام میں *

---

* اصل نظم حسب ذیل ہے جس میں بحر و معانی کے لحاظ سے تصحیح کی گئی ہے :—

دلا گواہی حق پہ کر تو نظر   نصاریٰ کی جوتی نصاریٰ کا سر
کچھ کام روم نے کیا اور نہ روس نے   انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے
فوج نے آکر گھیرا ہے ٹھکانا کچھ آرام کیا   جی کا جانا ٹھہرا صبح گیا یا شام گیا

اشعار مختلف بحروں میں ہیں

یہ اشعار جون یا جولائی سنہ ۱۸۵۷ میں لکھے گئے ہوں گے کیونکہ اگست میں سراج الدین بالکل نا امید ہوگیا تھا اور اس نے ایک مہدی [illegible] نظم میں نواب جھجر کو لکھا تھا کہ میں مکہ کو ھجرت کرنا چاہتا ہوں میں بڈھا ہوگیا ہوں اور میری صحت خراب ہے - دنیا الٹ پلٹ گئی ہے ہر جگہ بد عملی پھیلی ہے - کوئی کسی کا حکم نہیں مانتا اس لئے میں نے حج کرنے کا تہیہ کر لیا ہے *

وہ حاجی تو نہ ہوا حکومت کا قیدی ہوگیا اور دھلی گزٹ نے اُس کے اپنے محل کے دروازہ سے جو لاہوری دروازے کے نام سے موسوم ہے رنگون جلا وطن کئے جانے کی خبر شائع کی جہاں وہ کلکتہ سے جہاز پر سوار ہوکر ۴ دسمبر گذشتہ کو پہنچا - اس [illegible] سفر میں اس کی ملکہ بیگم زینت محل ایک اور بیوی بیگم تاج محل اور اس کے فرزند جواں بخت وشاہ عباس اور شاہی خاندان کے چند اراکین اور بہت سے حوالی موالی اس کے ساتھ تھے --

بعض تصانیف ہندوستانی زبان کی تعلیم کے متعلق شایع ہوئی ہیں جن میں غلام محمد کا مکالمہ بوی ہے کلکتہ سے اجمیر کے مسٹر ایس ڈبلیو فیلن † S. w. Fallon نے ایک انگریزی ہندوستانی لغت قانونی و تجارتی اصطلاحات ‡ کی شایع کی - یہ بہت مفید کتاب ہے جس کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں تاریخی و لسانی لحاظ سے انگریزی کا ہندوستانی سے مقابلہ کیا گیا ہے - لندن میں ریورنڈ مسٹر اسمال Red. Mr. Asmall نے مسٹر ایسٹ وک

* ایلنس انڈین میل سنہ ۱۸۵۸ ع صفحہ ۲۵۶

† یہہ مستشرق وہی ہے جس نے مہری کتاب " تاریخ ادب ہند " کا ترجمہ بہ امداد قمرالدین کیا --

‡ انگلش ہندوستانی ڈکشنری قانونی و تجارتی اصطلاحات کی لغت کلکتہ سنہ ۱۸۵۸

Mr. East. week کی ہندوستانی قواعد کا جدید نسخہ مفید اضافوں کے ساتھہ شایع کیا ہے *

ہمارے مدرسے کے طلبہ کے استفادے کے خیال سے ایبی برترانڈ Abbe Bartrand سے پیرس میں میری کتاب کا مروب کی ایک فرہنگ شائع کی ہے۔

حضرات ! دوسری تصانیف جن کا ذکر مجھے آپ سے کرنا ہے رومن یعنی انگریزی حروف میں ہیں - مشہور ڈاکٹر گلگر بست ہندوستانی قواعد کے موجد کو اس صدی کے آغاز میں سب سے پہلے یہہ خیال گزرا کہ ہندوستانی کو انگریزی حروف میں بالالتزام لکھا جائے حروف علت کے متعلق انہوں نے انگریزی زبان کے رسم خط کو اختیار کیا جو انگریزی کے لئے تو بہت مناسب ہے لیکن یورپ کے دوسرے ممالک کی اقوام کے لئے کارآمد نہیں ہے - اس امرپر زبر دستی اصرار کیا گیا ہے کہ حرف کی آواز بجائے غیر محدودہ A کے ee کی آواز بجائے طویل I اور oo آواز بجائے طویل u کے متصور کی جائے - فرانسیسی زبان میں بجائے ایک کے دو حروف علت استعمال کر نے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا —

Pundeet بجائے Pandit کے اور Sutti بجائے ستی کے - اس سے زیادہ کوئی بات مضحکہ خیز نہیں ہو سکتی کہ فرانسیسی زبان میں مشرقی الفاظ لکھنے کے لئے انگریزی رسم الخط کو برتا جائے - یہہ وہی صورت ہوئی کہ انگریزی اصوات کے مطابق لاطینی الفاظ تحریر کئے جائیں —

خوش قسمتی سے یہہ رسم الخط ' سروليم جو نس Sir william jons کے مجوزہ رسم الخط کے مقابلے میں متروک کردیا گیا - یہہ لاطینی رسم الخط یورپ کے دوسرے

ملاحظہ ہو اعلان جو میں نے جنرل ایشیاٹک دسمبر سنہ ۱۸۵۸ع میں اس مصنف کے متعلق کیا تھا

ممالک کی عادات سے زیادہ مطابق اور ایشیا والو کے لئے زیادہ سہل ہے —

اس لئے بجائے اس کے کہ هندستانی حروف علت (دو حروف علت کی بنی هوی آوازون کے لئے a کی بجائے ee - v کی بجائے oo - i کی بجائے ue - oo کی بجائے ا e - uo کی بجائے o جیسا کہ گلگرست نے تجویز کیا هے ان آوازوں کو حقیقتاً a - a - e - i - u - e - ai o - ue سے تعبیر کیا جاتا هے (*) لیکن یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ انگریزوں کو نیز ان هندوستانیوں کو بھی جو انگریزی داں هیں اور جن میں سے اکثر نے گلگریست کے مجوزہ رسم الخط کو اختیار کر لیا هے اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت هو گی کیونکہ وہ ایسے رسم الخط سے غیر مانوس هیں - اس لئے طریقے میں ایک اور دشواری حروف علت کی کھنچی هوی آواز کے لئے ایک مقررہ نشان لگانے کی هے جو قدیم طریقے میں نہیں هے - دونوں طریقہ املا میں حلقی اور تالو سے نکلنے والے حروف صحیح جن کا مربی کا ع اُس حرف علت سے ظاهر کیا جاتا هے جس سے اُس کے تلفظ کا اظہار هوتا هے اور اُس کے نیچے ایک نقطہ دے دیا جاتا هے - شین انگریزی رسم الخط کے لحاظ سے sh سے اور ں غنہ کو ایک نقطے یا شوشے سے —

انگریزی حکومت سے لازماً هندستانی ادب پر قوی اثر پڑے گا اور وہ صورت بدل کر آدھا تیتر آدھا بتیر بن جائے گا یعنی آدھا هندوستانی آدھا انگریزی - اِنگریزی ترجمے اور انگریزی تقلید کی کثرت هو جائے گی - بہت سے هندوستانی عیسائی هو جائیں گے اور اُن کا خاص هندی عیسائی ادب هوگا - اس کا نتیجہ یہ هوگا کہ لاطینی حروف تہجی کی لازماً ترقی هوگی اور وہ

(*) یا دو اصل حروف علت کے لئے a - i - u اور انهیں حروف پر ایک علامت لگا کر جلی اواز جس کا ذکر بعد میں آئے گا —

غالبا دوسری دو اقسام کے حروف پر سبقت لے جائیں گے۔ اس طرح ہندوستانی کی یہ خصوصیت اور بھی مسلم ہو جائے گی کہ وہ ہندوستان کی عام زبان ہے اور کم از کم دوسری زبانوں کے بعض اجزا کو جو مختلف صوبہ جات میں بولی جاتی ہیں اپنے میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ---

لندن میں ۲۰ مئی گزشتہ کو زیر صدارت لارڈ سالسبری ایک جلسے میں یہ تصفیہ ہوا کہ ایک انجمن جس کا نام کرسچین ورنیکیولر ایجوکیشن سوسائٹی آف انڈیا Christian Vernacular Society of India (انجمن عیسائیان ہند برائے تعلیم السنۂ ملکی) ہو قائم کی جائے اور وہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں درس گاہیں قائم کرے جن میں عیسویت کے اصول اس ملک کی زبان میں سکھائے جائیں اور وہ کتابیں عیسائی مذہب کو ملحوظ رکھ کر مرتب کی جائیں۔ شرکا میں مہاراجہ دلیپ سنگھ سابق بادشاہ لاہور جو عیسائی ہوگئے ہیں، لارڈ جان رسل John Russal سر چارلس تریلویلین جو اب صوبہ مدراس کے گورنر ہیں اور بہت سے ممتاز اشخاص شامل تھے۔ صرف ہندوستان ہی میں یوروپین لوگوں نے اپنے حروف تہجی رائج نہیں کئے ہیں بلکہ جاوا امبائن Amboyne اور ملحقہ جزیروں کے عیسائیوں نے جن کو ڈچ مشنریوں نے عیسائی بنایا تھا، ملائی زبان کی تحریر کے لئے لاطینی حروف اختیار کرلئے ہیں* ملگاچوں Malgachas نے بھی اب لاطینی حروف کے استعمال کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خود اہل مشرق نے یورپ والوں کو اس راستے پر لگا دیا ہے۔ عرب ہسپانی زبان کو عربی حروف میں لکھتے تھے۔ اہل سیریا

---

* ڈاکٹر کری اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ صرف امباین میں ۲۰ ہزار دیسی لاطینی حروف میں لکھی ہوئی بائبل استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "یادداشت دربارۂ استعمال رومن حروف برائے السنہ ہند" صفحہ ۱۷

اکثر عربی کو سریانی حروف میں لکھتے ہیں اور ارمنی اور یونانی ترکی زبان لکھنے کے لئے اپنے اپنے حروف تہجی سے کام لیتے ہیں - یہودیوں کا بھی یہی حال ہے جو عربی جرمن ہسپانی زبانوں کو عبرانی حروف میں لکھتے ہیں -
رسالہ "یاد داشت دربارہ استعمال حروف رومن برائے السنہ ہند" میں ایک خط موسو سر چارلس تریویلین شائع ہوا ہے جس میں مرزاپور کے پادری ماتھر Red. Mathur نے یہ اطلاع دی ہے کہ لاطینی حروف ہندوستان میں اس درجہ مقبول ہیں کہ نہ صرف صوبہ مغربی و شمالی کے ہندوستانی ہی اسے پسند کرتے ہیں جنہوں نے انگریزی سیکھی ہے بلکہ اور سب وہ لوگ بھی جن کا تعلق مشنریوں سے ہے - یہ حروف تہجی انگریزی متصور نہیں کئے جاتے بلکہ صوبہ شمالی و مغربی کے عیسائیوں کے حروف تہجی سمجھے جاتے ہیں - متعدد دیہی مدارس میں اس کا رواج ہو چکا تھا اور بغاوت سے قبل ۲ ہزار ہندی نوجوانوں نے اسے اختیار کرلیا تھا - منجملہ ان کے دہلی کالج میں بھی یہ رواج پا چکے تھے جہاں ۲۹۰ طلبہ اس زبان کو نئی یورپین لباس میں لکھنے پڑھنے کے عادی ہوگئے تھے -

انجیل اور کل بائبل کے بہت سے نسخے ان حروف میں شائع * ہوئے اس

* سابق میں اور اب بھی انجیل اور کل بائبل کے نسخے فارسی اور دیو ناگری حروف میں شائع ہوئے اس وقت لندن کی بائبل سوسائٹی ایک ہندوستانی نسخہ انجیل کا تیار کر رہی ہے جس میں رومن حروف کے ساتھ ساتھ فارسی حروف میں بھی تحریر ہے - اس کی نگرانی مسٹر هورن Mr . Horn کے تفویض ہے جن کا تعلق چرچ مشنری سوسائٹی سے ہے - آگرہ سے یہ صاحب بھیجے گئے ہیں موخرالذکر نسخہ نیز وہ نسخہ جو مسٹر ماتھر کی زیر نگرانی رومن حروف میں شائع ہوا ہے دونوں جدید ہیں ، اسی لحاظ سے سابقہ کے مقابلے میں یہ زیادہ صحیح اور ٹھیٹ ہندوستانی زبان میں ہے -

طریقے پر جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں پلگرمس پراگرس Plgrims Progress کا ایک خلاصہ ریورنڈ مسٹر باولی Red. Mr. Bowley کا ہے - ایک کامل ترجمہ اس کتاب کا بابو ہری نے مرتب کیا ہے - یہ صاحب ہندو مصنف ہیں جو اپنے متعدد ادبی تصانیف اور بعض عیسوی کتب کی وجہ سے بہت مشہور ہیں *

ان کتابوں میں سے انجیل کے نسخے زیادہ کار آمد ہیں جو لندن بائبل سوسائٹی دوہرے کالم میں شایع کر رہی ہے - ایک کالم میں ہندوستانی اور دوسرے میں انگریزی - اس کے بیس ہزار نسخے طبع کئے جائیں گے اور اس کے ساتھ ایک فرہنگ ہندوستانی الفاظ کی ہوگی جو ہندوستانی حصے میں استعمال کی گئی ہیں - اس کی نگرانی مسٹر کاٹن ماتور Mr Cotton Mathar کے تفویض ہے جو ایڈسکومب میں ہندوستانی کے پروفیسر اور اسی نام کے مشنری کے فرزند ہیں -

کیتھلک مشنریوں نے بوی لاطینی حروف اختیار کرلئے ہیں - میرے پاس ایک مذہبی سوال و جواب کا رسالہ جو سنہ ۱۸۵۲ع میں بمبئی میں حسب الحکم وکارا پاسٹلک آف پٹنہ نہایت عمدہ ہندوستانی زبان میں طبع ہوا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ عیسوی خیالات کا لاطینی † الفاظ میں اظہار کرنا ہندوستانیوں کے لئے بالکل اجنبی اور غیر موزوں ہے بر خلاف اس کے عربی سے جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں وہ کثرت استعمال کی وجہ سے مشرق میں ان خیالات کے اظہار کے لئے

---

* ان کی ایک فہرست " یاد داشت استعمال حروف رومن بہ السلہ ہلد " سنہ ۱۸۵۸ صفحہ ۵۵ و ما بعد پر موجود ہے

† مثلاً الفاظ ذیل :- کیتھلک ، اکلیشیا ایس‌کاب سکریملت پاسکا التر ہوسٹی اندلتحبس

نہایت موزوں اور مناسب خیال کئے جاتے ہیں —

ہندوستانی مطبوعات لاطینی حروف میں عام طور پر مشنریوں نے اپنے مدارس اور ہندوستانی عیسوی اداروں کے لئے تیار کی ہیں - بہر حال ان میں بھی بعض ایسی کتابیں ہیں جن کا تعلق دنیاوی ادب سے ہے مثلاً رومن حروف میں لکھی ہوئی باغ و بہار اور اردو کی گلستاں - اس کے علاوہ باغ و بہار کا ایک رومن حروف میں لکھا ہوا نسخہ جس کی مسٹر منیر ولیمس Mr. Monir Williams نے نظرثانی کی ہے زیر طبع ہے نیز پریم ساگر کا ایک نسخہ جو منجملہ ان ہندوستانی تصانیف کے ہے جن کی اشاعت مسٹر ایڈورڈ بی ایسٹ وک نے کی ہے اور ان میں سے یہ کتاب شائع کر رہے وہ بھی اس وقت زیر طبع ہے - مسٹر ایڈورڈ بی ایسٹ وک کا احسان ہے کہ انہوں نے دیو ناگری حروف میں اس کا ایک نسخہ شائع کیا اور انگریزی میں بہت اچھا ترجمہ کیا - میرے لایق شاگرد ابے برترانڈ Abbay Birtrand رومن حروف میں لکھا ہوا ایک نسخہ کامروپ کا شائع کر رہے ہیں تاکہ جو لوگ میرے زیر تعلیم رہ کر ہندوستانی حروف پڑھنے کی زحمت گوارہ نہ کرسکیں وہ مستفید ہوسکیں اور اس نظم کے مفہوم کے سمجھنے میں انہیں آسانی ہو —

ابتدائی تصانیف جو رومن حروف میں لکھی گئی تھیں وہ بھی اب شائع ہوچکی ہیں - اس ضمن میں مجھے مسٹر ولیمس و ماتھر Mr. Williams & Mathur کی کتاب ایزی انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف ہندوستانی Easy Introduction to the Study of Hindustani (آسان طریقہ حصول تعلیم ہندوستانی) کا ذکر کرنا چاہئے - جس میں قواعد کے علاوہ اقتباسات مع فرہنگ اور مکالمات درج ہیں *

---

* ملاحظہ ہو جنرل ایشیاٹک دسمبر سنہ ۱۸۵۸ ع

لاطینی حروف میں روزیریا Rosaria تامسن Thamson کی لغات پہلے سے موجود هیں ان کے علاوہ متعدد ابتدائی کتب مثلاً اسٹوڈنٹ اسسٹنٹ Student Assistant (معین طلبہ) هندوستانی ریڈر وغیرہ بھی لاطینی حروف میں هیں پروفیسر ڈی فاربس Prof. D. forbas ایک لغت اور اسی لغت کا ایک خلاصہ رومن حروف میں تیار کر رهے هیں۔ یہ بھی اعلان کیا گیا هے کہ ملکۂ انگلستان نے اب فارسی حروف تمغوں اور دوسرے کتبوں میں استعمال کرنے کی ممانعت کردی هے مسٹر ٹکر ــــــ سابق کمشنر بنارس جو ایک مشہور و معروف شخص هیں اور جو اس وقت کرسچین و رنیکیولر ایجوکیشن سوسائٹی (انجمن تعلیم عیسائیاں به السنه ملکی) کے سکرٹری کی حیثیت سے کام انجام دے رهے هیں جس کا ذکر میں اس سے قبل کر چکا هوں لارڈ اسٹینلی Lord stainly کے بیان کے مطابق اس امر پر مصر هیں کہ گورنمنٹ گزٹ ضوابط و قوانین لاطینی حروف میں طبع هوں فارسی حروف میں نہوں نیز دیسیوں کو اجازت دی جاے کہ هندوستانی عدالتوں اور دوسرے سررشتہ جات میں اپنی اپنی درخواستیں و دستاویزات هندوستانی زبان لیکن لاطینی حروف میں تحریرکی هوئی پیش کرسکیں —

حضرات! هندوستانی حروف تہجی کے ترک کرنے کا رجحان علانیہ پایا جارہا هے - نئے طریقے میں یقیناً دشواریاں هیں لیکن اس میں فوائد بھی هیں - میرے خیال میں اس کے رواج کے لئے جو امر بہت زیادہ موید هے وہ یہہ هے کہ هندوستانی تحریر کے لئے کوئی یکساں حروف تہجی نہیں هیں کیونکہ وہ مقامی حالات اور اشخاص کے مذاق کے لحاظ سے مختلف طریقوں پر فارسی اور شاستری یا دیوناگری حروف میں تحریر کی جاتی هے - فارسی حروف بھی هندوستانی زبان کے لئے ایسے هی اجنبی هیں جیسے لاطینی اورهندوستانی حروف فارسي یا

عربی الفاظ کو ہمارے حروف سے زیادہ اچھی طرح ظاہر نہیں کرسکتے —

لاطینی حروف میں لکھنے کی تحریک کی ابتدا انگلستان و ہندوستان میں ہوئی ' اس کا اثر فرانس پر بھی پڑا - ایک بڑا سنجیدہ سائیلس دان جو شاعر و عالم بھی ہے اس نے فلورس دی لا اندی —— (ہندوستان کے پھول) کے نام سے ایک عمدہ منظوم ترجمہ فرانسیسی زبان میں رامائن کے ایک حصے اور بعض دوسری نظموں کا کیا اور ترجمہ کے ساتھ اصل کو لاطینی حروف میں دیا ہے جو نہایت صحت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے - اس شخص نے اس اشاعت سے نیز اپنی تصنیف اور سینڈازم ریندرتہ کلاسیکہ (مشرقیت کو قدامت کا مرتبہ دیا جانا) سے سب سے بڑا فائدہ یہہ پہونچایا ہے کہ فرانس میں مشرقی زبانوں خصوصاً سنسکرت کے مطالعے کا مذاق پیدا ہوگیا ہے اس لئے نہ صرف پیرس میں جہاں ہر شخص کو اس مطالعے کا موقع حاصل ہے بلکہ دوسرے بڑے بڑے شہروں میں بھی جن کے منجملہ اورین کا قدیم دارالسلطنت یعنی اس کی جائے پیدائش بھی ہے ' اس کی تحریک پر عمدہ مکمل قائم ہوچکی ہے ' کیونکہ یہاں سنسکرت کی صرف و نحو رومن حروف میں شائع ہوگئی ہے اور عنقریب سنسکرت کی لغت انہیں حروف میں شائع ہوگی —

اس صدی کے آغاز سے جس شخص نے کامیابی کے ساتھ مشرقی ادب کا مذاق عام طور پر پھیلا دیا تھا ' افسوس کہ ایسے فاضل کے وجود سے ہم حال میں محروم ہوگئے . یہہ شخص ہندوستانی کو لاطینی حروف میں لکھے جانے کا شدید مخالف تھا . میری مراد جان شیکسپیر سے ہے جن کا اس موقعے پر کچھہ حال بیان کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستانی زبان میں میرے اُستاد تھے ' جس طرح مشہور ایس تی ساسی جس سے میں نے عربی و فارسی کی تحصیل کی —

ہے - شکسپیر ۱۴ اگست سنہ ۱۸۷۴ ع کو اسٹینٹن ہرلڈ Stanton Harlds میں پیدا ہوا تھا جو لیسٹر کا ایک قصبہ ہے - یہاں اس کے اجداد کئی صدیوں سے سکونت گزین تھے اور ان کے یہاں یہ روایت چلی آتی تھی کہ وہ لوگ اسی نام کے شاعر کے خاندان سے ہیں اور جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے یہ شاعر اسٹریٹ فورڈ آن اے ون میں جو ہاروک شائر کا قصبہ ہے اور اس قصبے سے متصل ہے، پیدا ہوا تھا - لیکن یہ شخص ولیم شیکسپیر William Shakespear کی اولاد میں سے نہ تھا اور وہ یقیناً اُس خاندانی نام کا آخری وارث نہ تھا جیسا کہ بعض اخبارات کا بیان ہے کیونکہ مشہور اور درد انگیز المیہ نگار نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی —

جان شیکسپیر کم عمری ہی کے زمانے سے مشرقی السنہ خصوصاً عربی فارسی و ہندوستانی کے حصول کی جانب متوجہ ہوا تھا - سنہ ۱۸۰۵ ع میں بحری فوجی کالج میں السنہ مشرقیہ کی پروفیسری کے لئے نامزد کیا گیا تھا - اس خدمت کے موقوف ہو جانے کے بعد وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی کالج مرقوعۂ ایڈاس کومب میں ہندوستانی کی پروفیسری کی خدمت پر مامور کیا گیا - سنہ ۱۸۳۲ ع تک وہ اس خدمت کو انجام دیتا رہا، اس کے بعد اولاً رچرڈ ہاٹن اس جگہ مامور ہوا جو اسی مدرسے کا ایک طالب علم اور سرگریوس کا بھائی تھا جو ہمارے انسٹیٹیوٹ کا رکن ہے - اس کے بعد اس کی بہن کے لڑکے مسٹر باولس کی ماموری عمل میں آئی بالاخر کرنل رولینڈسن Col. Rowlandson مامور ہوے - جو اب تک اس خدمت پر فائز ہیں - رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام پر وہ اس کا لائبریرین (کتب خانہ) مقرر ہوا اور اس اعزازی خدمت کو اس نے اپنی وفات تک انجام دیا —

سنہ ۱۸۲۵ ع میں وہ پیرس آیا اور اس سال کے موسم سرما میں میرے

سلسلۂ تعلیم میں شریک ہوا میں نے اس کی ایم ڈی متاسن سے ملاقات کرائی اس نے اس سے قبل صرف اُن کی تصانیف کے ذریعے سے اُن سے واقفیت حاصل کی تھی اور ان کی عالمیت کی وہ بے انتہا قدر کرتا تھا - ہم دونوں ارگون ڈیول گئے جہاں عام قبرستان میں اس کے حقیقی بھائی کی قبر تھی - اس کا بھائی افواج برطانیہ کا اسسٹنٹ کمیسری جنرل تھا اور گھوڑے سے گرنے کے صدمے سے ہلاک ہوا - اس کی قبر کی لوح سے ان حالات کا پتہ چلتا ہے - جے شیکسپیر J. Shakespear پیرس میں صرف اسی وقت آیا تھا - مجھے خاص طور پر انگلستان میں اُن سے گفتگو کرنے کا موقع ملا - ان کی پہلی تصنیف اسپین کے عربوں کی تاریخ ہے جو عربی سے ترجمہ کی گئی ہے - یہہ تصنیف اسپین کی مجلس عربیہ ینلایکو ڈلی آت اسپین Arabian (اندلس کے عربی آثار) میں لندن کے جے ' سی ' مرفی نے سنہ ۱۸۱۶ میں طبع کرای تھی اس کے بعد اس نے اپنی ہندوستانی کی صرف نحو ' ہندوستانی کے انتخابات ہندوستانی لغت اور مقدمہ تعلیم ہندوستانی متعدد بار طبع کرائے - اس نے کبھی شادی نہیں کی - ایبنگلی پرائری واقع ایشبی ڈی لا سے زوش میں جو زمین اس نے چند سال قبل خریدی تھی وہیں ۸۴ سال کی عمر میں ۱۰ جون سنہ ۱۸۵۸ کو اس کا انتقال ہوا - اس نے ۲ لاکھ پچاس ہزار پونڈ ترکہ چھوڑا - یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس رقم کے منجملہ اس نے ڈھائی ہزار پونڈ اسٹریٹ فورڈ آن ' ایون کے مکان کی ترمیم و نگہداشت کے لئے چھوڑے جہاں شیکسپیر پیدا ہوا تھا - اپنی زندگی میں بھی تقریباً اسی قدر رقم اس نے اس کام پر صرف کی تھی - اس مرتبہ اس نے خاص طور پر یہ وصیت کی تھی کہ سوا ن آت ایون Savon of Avon کے منتظمین سے اس امر کا تصفیہ کر لیا جاے کہ وہاں ایک شیکسپیر میوزیم قایم کیا جاے اس کے علاوہ اس نے

۶۰ پونڈ سالانه اس مکان کے چوکی دار اور زائرین کے کتاب معائنه کی نگہداشت کے لئے وصیت کئے تاکه جو لوگ وهاں آئیں وہ اس کتاب میں کوئی شعر یا جمله اپنے نام کے ساتھه لکھه جائیں —

اس قدر کثیر دولت جو اس مستشرق نے چھوڑی وہ اس کی هندوستانی ادبی تصانیف خصوصاً لغت کی کامیابی کی وجه سے جمع هوی تھی - یه لغت چار مرتبه طبع هوئی اور هربار کئی هزار تعداد میں - یه مزید ثبوت هندوستانی زبان کے عام مقبولیت اور اهمیت کا هے اور اس سے یه بھی معلوم هوتا هے که انگلستان و هندوستان دونوں ملکوں میں اس کی کیسی قدر هے ، حالانکه شیکسپیر کی تصانیف گراں قیمت هیں اور اپنی نوعیت میں منفرد بھی نہیں هیں - اسی طرح کی اور تصانیف بھی هیں جن کی اشاعت بھی شیکسپیر کی تصانیف کے ساتھه ساتھه بہت کامیابی سے هوئی هے —

حضرات ! همیں هندوستان کی زمانه حال کی اس خوبصورت زبان کا مطالعه کرنا چاهئے اور جس طرح شیکسپیر نے اپنی صرف و نحو میں حسن کے دو شعر نقل کئے هیں جو اسی موقع کے حسب حال همیں بھی اس کا اتباع کرنا چاهئے وہ شعر یه هیں —

سخن کے طلب گار هیں عقل مند سخن سے هے نام نکویاں بلند

سخن کی کریں قدر مردان کار سخن نام ان کا رکھے بر قرار

داغ بے داغ

از

طالب الہ آبادی

(۲)

نسیم :- بھائی آج تو سنہری رات ہے اور ابھی تک شب بیداری کا کوئی لائحہ عمل تیار نہیں ہوا —

شمیم :- نسیم صاحب آپ کی یہ عادت کب چھوٹیگی کہ آپ انگریزی میں سوچتے ہیں اور اردو میں اس کا ترجمہ فوراً فرمادیتے ہیں چاہے کسی انگریزی نہ جاننے والے کے لئے وہ فقرہ قفل ابجد ہی کیوں نہ ہو یہ "سنہری رات" کیا معنی ، چاندنی رات یا نیک شگون رات ' یا و جواہر سے مالا مال رات - آخر مراد کیا ہے؟

سلیم :- یہ محض انگریزی کے ایک محاورہ کا ترجمہ ہے ' سنہری رات یا گولڈن نائٹ یورپ والے اس رات کو کہتے ہیں جو سنیچر کا دن گزر کر آتی اس واسطے کہ عیسائی دنیا میں اتوار کا دن بہت مبارک سمجھا جاتا عام طور پر اُسی روز دفتر میں ' کالج ' میں غرض ہر جگہ چھٹی رہتی ہے اس لئے یہ رات بھی سنہری کہلاتی ہے —

نسیم :- ہاں بھائی خوب یاد آیا پچھلی مرتبہ ' آج سے تین ماہ پہلے ہم کلام داغ پر تبادلۂ خیالات کا سلسلہ شروع کیا تھا ، وہ نا مکمل رہ گیا

اگر کچھ ھرج نہو تو آج اُسے ختم کرلیں —

شمیم: یہ لو ھم بھی بھول گئے تھے - اچھا تو ھے ورنہ تعمیر کی صورت جو بات ادھوری رہ گئی رہ گئی —

سلیم: آپ لوگوں کی ھمت کی داد دئے بغیر چین نہیں آتا، مگر نہایت ادب سے گذارش ھے کہ آج بھی ختم بحث کی کوئی امید نہیں ھے - اس لئے کہ رات کے گھنٹے انے گنے ھیں اور خیال کی دنیا بہت وسیع -

شمیم: تو خیر گلزار داغ کی جس روش تک پہونچ کر گل چینی کر سکیں گے کر لیں گے —

نسیم: ھاں کوئی ھرج نہ ھو تو سلیم صاحب اپنے منتخب اشعار اُسی شب کی طرح آج بھی پڑھتے جائیں اور ھم سب گفتگو کرتے جائیں —

سلیم: بسر و چشم —

جھونک سے سائے کے بھی یہ ناتواں لاغر گرا
جس جگہہ سایہ گرا میرا مجھے لے کر گرا

نسیم: کیا یہ مبالغہ خلاف فطرت نہیں ھے ؟ کہاں سایہ ایسا کمزور ساتھی اور کہاں جناب داغ ایسا استخواں و پوست کا ڈھیر - سایہ نہ ھوا گرز ھوگیا کہ اس کے لنگر سے شاعر صاحب کہاں ھو کر شیر قالین بنے جاتے ھیں —

شمیم: آپ نے پھر وھی نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ کی بات چھیڑ دی، یہاں تو اصل سوال محض اسلوب بیان اور طرز ادا کا ھے، دکھانا صرف اس قدر ھے کہ انتہائی کمزوری ھے، کہنے میں تصویر کشی اور زور بیان کے لئے یہ پیرایہ اختیار کیا گیا ھے، خود اپ نے بھی اپنے اعتراض میں کئی استعارے اور کئی تشبیہیں استعمال کی ھیں اور پھر خلاف فطرت بھی نہیں ھے -

انتہائی کمزوری میں دماغ بھی کمزور ہوجاتا ہے اور آدمی اپنے توہم کی وجہ سے سائے کو بھی کچھہ اور سمجھہ کر اس سے بچنا چاھتا ہے مگر ضعف ہر بار آڑے آتا ہے —

سلیم : شمیم صاحب یہ نفسیاتی زاویئں تو خواہ مخواہ کی زبردستی اور خوش اعتقادی ہے ' مگر ساتھہ ھی ساتھہ یہ بھی سچ ہے کہ فطرت اور خلاف فطرت کی بحث بھی دور از کار سی ہے - دیکھئے حسن مطلع خود مطلع اول کی تفسیر ہے

دل سنبھالا پر نہ سنبھلا پاؤں اٹھا سر گرا
ان کے آگے آج میں اکثر اٹھا اکثر گرا

نسیم : سلیم صاحب یہ تو بالکل دوسری ھی کیفیت نظم ہوئی ہے یہاں تو بیقراریٔ دل ہر بار اٹھاتی ہے اور دوراں سر ہر مرتبہ گرا دیتا ہے - وہ بھی اس لئے کہ معشوق سا صاحب جبروت و هیبت ' مہیب و ظالم ' زلفوں میں ناگنیں لپیٹے' ابرووں پر بچھولئے ہوئے ' تحریر سرمہ کی شمشیریں کھینچے ہوئے ' مژگاں کے تیروں سے مسلح سامنے موجود ہے ' دیکھئے اسی مضمون کو ایک ذرا سا پہلو بدل کر آج کل کے ایک خوش گو نے کس عمدگی سے کہا ہے -

اٹھہ کے ارماں میں تیرے بیٹھا کہ تیورا کر گرا
گر کے حسرت میں تیری اٹھا کہ چکر آگیا

شمیم اس کے جواب میں تو میں بس اتنا کہکر خاموش ہو جاؤں گا کہ (ع)
ھائے کمبخت تو نے پی ھی نہیں -

سلیم : بحث کے رنگ میں پھر ذاتیات کا عنصر داخل ہوا جاتا ہے آگے سنئے -

وائے ناکامی کہ جس میں ہم نے باندھا خط شوق
وہ ہی مرغ نامہ بر کا ٹوت کر شہپر گرا
شوخیاں اس برق وش کی بزم میں دیکھے کوئی
صاعقہ کا طور ہے اس پر گرا اس پر گرا

یقین اے دل نہ کر تو اس کے مژگاں کے اشارے کا
بھروسا کیا ارے نادان تنکے کے سہارے کا

نسیم : کس قدر اوچھی تلوار چلائی ہے ' مژگاں کو تنکے سے تشبیہ دینا مژگاں کو چٹکیوں میں اڑانے سے کم نہیں ہے -

شمیم : نسیم تمھاری باتیں بھی پہیلی ہوتی ہیں بعض وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ واقعی سمجھے ہی نہیں یا صرف مذاق ہے -

نسیم : آپ مذاق کے تو پھیر میں بھی نہ رہئے اعتراض اٹھ اٹھ سکے تو بغلیں نہ جھانکئے - ہار مان لیجئے -

شمیم : اصل مقصد تو یہ ہے کہ مژگاں کا اشارہ مختلف معانی کا حامل ہوسکتا ہے پھر معشوق ایسے متلون اور دغاپرور کا اشارہ' دوسرے مرحوم نے اس محاورے کا فائدہ اٹھایا ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے مگر ہجراں نصیب اور وفا دوست نادان دل کو یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ سہارا تو ہے مگر تنکے کا سہارا اور طوفان میں یہ سہارا کوئی بہت زیادہ قابل اعتبار چیز نہیں -

ساحر : ہاں دیکھئے اس کیفیت کے ایک دوسرے پہلو کو کس خوبی سے کہا ہے
ارے بیباک کیا کہنا ہے تیرے اس اشارے کا
ٹھکانا بے ٹھکانے کا سہارا بے سہارے کا

کٹے اے خضر تم نے خوب نقد عمر کے گوہرے
خیال آیا نہ اے حضرت مگر آخر خسارے کا

نسیم : کیا مہمل شعر کہا ہے ' نقد عمر کی گردش کیا بلا ہے اور آخر خسارہ کیا ہے —

شمیم : آج کل کے فیشن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنی سمجھ میں جو بات نہ آئے وہ سراسر مہمل ہے ' مولویوں کے یہاں سے کفر کے فتاوے اور نقادین کی سرکار سے ' مہمل ہے ' کے اجازے جس کثرت سے شائع ہوتے ہیں اتنا کثیر الاشاعت کوئی مجلہ رسالہ یا جریدہ بھی نہیں ہے - اور نہ اس کثرت سے ٹکسال کے سکے ہی چلتے ہیں —

نسیم : اس لفاظی سے تو میری خاطر جمع نہیں ہوئی —

سلیم : یہ سیاق و سباق کے نکات ہیں ' غالباً خود شمیم صاحب کی نظر بھی وہاں تک نہیں پہونچی ہوگی ' ہندی مہاجن بالعموم اور تجار بالخصوص جب اپنے حساب کتاب کی جانچ کرتے ہیں تو جو رقمیں بہی میں وصول ہوتی ہیں ان کو ممتاز بنانے کے لئے اس طرح سے گھیر دیتے ہیں تا کہ قابل وصول رقمیں آسانی سے

روپیہ آنے پائی	روپیہ آنے پائی
۱ — ۸ — ۹	۲ — ۱۰ — ۱۰

جوڑی جا سکیں اور قلع و نقصان کا اندازہ کیا جا سکے - اب رہا یہ کہ آخر خسارے ' سے موصوف کی کیا مراد ہے ؟ یہ سوال نہایت نازک اور مشکل ہے ' بہر کیف الفاظ سے جس قدر پتہ چلتا ہے وہ تو یہی ہے کہ شاید درازی عمر کی وجہ سے ایک عرصہ تک جناب خضر کو کنجینہ شہادت اور دولت وصال نہیں مل سکتی جو صریحی خسارہ ہے —

الہی دیکھئے کافر نگاہیں کیا دکھاتی ہیں
پڑا اپنا پڑا ہے اس کی آنکھوں کو اشارے کا

مرے اشکوں میں ہے یا تیرے دنداں مصفا میں
گہر کی آب ہیرے کی تجلی نور تارے کا

ہمیشہ فیض ہے دریا دلوں سے خاکساروں کو
کہ موج بحر تر کرتی ہے دہا کہا لب کنارے کا

تڑپ کر سینہ میں اس رنگ سے پیکاں نکلا
دل سے بے ساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا

نسیم ! ۔ یہہ پیکاں ارمان کیسے ہو گیا ؟

شمیم ! ۔ سنئے آج دل کے ایک شاعر کی زباں سے سنئے :—

ناوک افگن اثر جذب سے حیران ہو جائے
دل میں جو تیر اُتر آے وہ ارماں ہو جائے

سلیم ! ۔ کیا مرے ہاتھہ سے کھچ کر تیرا داماں نکلا
تو بھی آغوش سے یوں تو نہ میری جان نکلا

قول پورا تھا پر اس عہد شکن کے منہ سے
ٹکڑے ہو کر سخن وعدہ و پیماں نکلا

نسیم ! ۔ ایک دوسرے صاحب کہتے ہیں :-

پہلے اس نے مس کہا پھر تق کہا پھر بل کہا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دئے

سلیم :- سرمگیں چشم میں اس برق نظر کا جلوہ
ایک شعلہ سا تہہ دامن مژگاں نکلا

آدمی رہزن آدم ہے کہاں راہنما
وائے تقدیر میری خضر بھی انساں نکلا
ناتوانوں کی گلو گیر قضا ہو سب جھوٹ
ہم نے جب تار نکالا تو گریباں نکلا

تری الفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا
اِدھر چمکی اُدھر نکلی یہاں پھونکا وہاں پھونکا
کہاں صیاد کیسا باغباں کس پر گری بجلی
چمن میں آتش گل نے ہمارا آشیاں پھونکا
ہمارے دل کے ہوتے طور سینا کو جلانا تھا
تری برق تجلی نے کسے پھونکا کہاں پھونکا
سنا جاتا نہیں اے داغ تیرا سوز دل ہم سے
تری آتش بیانی نے تو اے آتش فشاں پھونکا

دل نے اس بزم میں بٹھا تو دیا اٹھ کے جانا نظر نہیں آتا
نسیم: نظر نہیں آتا کیا معنی؟ ڈھو کے ڈھو تو بیٹھ گئے، اور نظر نہیں آتا
شمیم: معنی صرف یہ ہیں کہ کوئی امید نہیں ہے
رہئے مشتاق جلوۂ دیدار ہم نے مانا نظر نہیں آتا
نسیم: ہاں پھر تو بے کاری کا ایک مشغلہ ہے —
شمیم: نہیں تو کیا آپ نے نہیں سنا کہ
پھر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد
ہم نے مانا صاف کہہ رہا ہے کہ نظر آنا، ناممکن نہیں ہے، مشکل ضرور ہے

جو ہمت اور استقلال سے سہل ہوجائے گا —

مشکل شد است کار دل از عشق و خوشہ لم
شاید رسد بخاطر مشکل پسند تو

اور پھر اگر یہ بھی نہ ہو کہ ع جن ڈھو نڈا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھہ ' اور ڈرت رھے کنارے بیٹھہ ' پر معاملہ رہ جاے تو بھی مصروفیت اشتیاق ہی کیا کم لذت بخش ہے - خود کام ہی کام کا صلہ ہے —

انکھہ کھلتے ہي خواب غفلت سے　　ہاے کیا کیا نظر نہیں آتا

نسیم :- خوب شعر کہا ہے - واقعی نفس شناسی اور بیخودی جب آپس میں پہلو بدلتے ہیں تو دنیا ہی بدل جاتی ہے - جس طرح تھیٹر کے اسٹیج پر اک بارگی پردے بدل جاتے ہیں - باغ سے بیابان یا قتلگہ سے مجلس سرود ہوجاتی ہے یا جیسے سینما کے پردہ عکاس پر مناظر بدل جاتے ہیں بالکل وہی حالت انسان کی بھی ہوتی ہے کہ خواب غفلت میں جو جو عالم پیش نگاہ رہے ہیں ' دنیائی حقایق میں ان کے دھندلے سے نشان بھی نہیں رہتے اور اس نئی دنیا کی ہزارہا حقیقتیں ایسی بے نقاب ہوتی ہیں جن کا وہم بھی نہیں ہوتا —

شمیم :- میں آپ کے حرف حرف پر صاد کرتا ہوں اور آپ کی اس پر مغز تشریح کا شکر یہ بھی ادا کرتا ہوں —

سلیم :- غیر کے ساتھہ دل میں بھی دیکھا　　کبھی تنہا نظر نہیں آتا

نسیم :- اس سے پہلے کا شعر جتنا بلند ہے یہ شعر اسی قدر پست ہے —

شمیم :- جس طرح آسمان صرف ایک حد نظر ہے اسی طرح یہ پستی اور بلندی بھی زاویہ نگاہ کے پھیر ہیں اور کچھہ نہیں کیا آپ کے نزدیک صفائے قلب اور مرکزیت خیال آسان چیزیں ہیں ' میری نگاہ میں سب سے

مشکل شئے یہی ہے کہ انسان حواس میں ہو اور کسی ایک ہی خیال کو دل و دماغ میں ہمیشہ تو خیر کہاں دو گھنٹے ہی محفوظ رکھ سکے آپ خود کوشش کر کے دیکھ لیجئے —

ہم تو کہنے کو حال دل کہدیں سننے والا نظر نہیں آتا

نسیم: یہ تو بالکل وہی بات ہوئی کہ : —

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے

سناؤں درد دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

سلیم: دل کا آئینہ دیکھنے کو تھا پر جو چاہا نظر نہیں آتا

ہم ہی اے داغ کور باطن ہیں ورنہ وہ کیا نظر نہیں آتا

نسیم: شاعر بھی خود اپنی ہی تردید آپ ہی کتنی جلد کر لیتے ہیں ابھی ابھی اسی غزل کے مطلع میں فرماتے ہیں —

جلوہ اس کا نظر نہیں آتا نہیں آتا نظر نہیں آتا

اور مقطع میں استفہام کے پردہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ نظر آتا ہے - بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست —

شمیم: آپ کو تو جب سوجھتی ہے ایسی ہی سوجھتی ہے، الٹی ہی گنگا بہا کرتی ہے، ان دو شعروں میں تردید کیسی تردید کی چھاؤں بھی نہیں ہے - مطلع کا تو وہی عالم ہے جو غالب کے اس شعر کا ہے —

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے اتنے پہلو ہیں کہ مختلف الفاظ پر زور دے کر جس جس طرح پڑھا جائے ویسے ہی مختلف اثر اور معانی بھی پیدا ہوتے

جاتے ہیں - بعینہ وہی کیفیت داغ کے مطلع کی بھی ہے —

جلوہ اس کا نظر نہیں آتا نہیں آتا نظر نہیں آتا

دوسرے مصرعہ میں 'نہیں آتا' کی تکرار نے استفہام کی کمی پوری کردی ہے - شوق کا یہ عالم ہے کہ جلوہ نظر نہیں آتا مگر " رہئے مشتاق جلوۂ دیدار پر عمل ہے " اپنی کور دیدگی کا افسوس بھی ہے کہ ہائے نہیں نظر آتا نہیں نظر آتا - مطلع اور مقطع میں اختلاف صرف سطحی نگاہ والوں کے لئے ہے ' ورنہ دیکھئے تو مرحوم نے مطلع میں نہ تو یہ کہا ہے کہ " نظر ہی نہیں آتا " نہ یہ کہا ہے کہ " نظر آ ہی نہیں سکتا " - بلکہ ایک طرح سے مقطع بھی توضیح اور توجیہہ ہے - فرماتے ہیں کہ جلوہ تو نظر آتا ہے لیکن —

گر نہ بیند بروز شپّرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ضعف بصر ہو ' یا پردہ مردم عکاس نہ رہ گئے ہوں ' یا جہالت کا موتیا بند ہوگیا ہو ' یا صفائے قلب سے آئینہ بصیرت مکدر ہوگیا ہو ' بہر طور ہماری ہی کور باطنی ہے ورنہ " وہ تو نظر آتا ہے " —

سلیم : وہ کچھ سنائیں کہ صیاد دردمند ہوا
قفس میں بند ہوئے پر بھی میں نہ بند ہوا

نسیم : کیا کالیاں سنائیں ؟

شمیم : جی نہیں درد دل کی کہانیاں سنائیں - آج کل کے سیاسی قیدیوں سے اس شعر کا مزہ پوچھئے —

سلیم : مجھے تو شیوۂ آزادگی کمند ہوا
کہ دام قطع تعلق میں پائے بند ہوا

نسیم بے مثل کہا ہے - واقعہ ہے کہ " قطع تعلق " کا سدا بہار

خیال ھی بجائے خود ایک تعلق ھو جاتا ھے اور تو تمام چیزوں سے آزادی ممکن ھے مگر اس خیال سے آزادی نہیں ھوتی کہ "تمام چیزوں سے آزادی ممکن ھے" - انسانی فطرت کا کس قدر صحیح مطالعہ داغ نے کیا تھا ایک معمولی سی مثال یہ ھے کہ' آپ خالی الذھن ھو کر کوشش کیجئے کہ دماغ میں کوئی خیال نہ آے ممکن ھے کہ مشق و مزاولت کی برکت سے آپ اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ھوجائیں مگر اس خیال سے دماغ کبھی خالی نہیں ھوسکتا کہ دماغ خیال سے خالی رھے - ڈیکارٹ ایسے فلسفی نے اسی تقاضاے فطرت کا فائدہ اٹھا کر تشکیکی طرز سے ' اپنی اور اپنے سے غیر کی ھستی ثابت کی ھے ، وہ کہتا ھے کہ جب ھم تمام چیزوں پر شک کرتے ھیں اور ان کے وجود سے انکار کرتے ھیں تو ھم کو ھوش رھتا ھے کہ ' ھم ، شک اور انکار کر رھے ھیں ' لہذا یہی شک اور انکار کرنے والا وجود " ھم " ھے - اپنی ھستی کا بہترین ثبوت یہی ھے جی تو چاھتا ھے کہ اگے ھاتھوں " ارادی " اور " قطع تعلق " کے مورد صد بحث مباحث پر بھی کچھ کہتا چلوں مگر شمیم صاحب کی نازک مزاجیوں سے ڈرتا ھوں —

شمیم : خدا کے لئے تصوف کے نغمے ' تیاگ کے راگ اور عرفان و سلوک کے دفاتر تہ کر رکھئے ' ھمیں تو داغ کی شاعری سے کام ھے - اور پھر اردو ' والے خفا ھو جائیں گے کہ یہ مباحث ادب اور زبان سے کوی تعلق نہیں رکھتے لہذا نا قابل اشاعت ھیں —

نسیم : خوب تو گویا ادب و زبان حیات انسانی سے جدا کچھ اور چیزیں ھیں —

شمیم : پھر آپ نے وھی شروع کردی - جب آپ ادب و زبان کا تعلق یا

علحدہ کی حیات انسانی سے بیان کریں گے ا-وقت وہ موضوع بھی ادب
و بیان میں داخل ہو جائے گا —

سلیم : آپ لوگ ٹھکانے کی باتیں کرتے کرتے بہک کیوں جاتے ہیں اور سنئیے

مزا تو یہ ہے کہ آزاد ہو کے سیر کرے خضر کو رشتۂ عمر ابد کمند ہوا

دیکھئیے مطلع کی مثالیہ توضیح —

نسیم :- اس شعر کی قدر کوئی مجھ سے پوچھے اگر ریڈیم کے مقابلہ میں
رکھہ کر تو لئے جب بھی اس سعر کا پلہ گراں رہے گا —

شمیم :- واہ وا کیا قدر کی ہے - یہ داغ موتیوں میں تلوا یا ہوتا ' جواہر کے
ساتھہ رکھہ کر وزن کرایا ہوتا '

نسیم :- افسوس آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ آج کل ساری دنیا میں سب سے زیادہ
گرانقدر اور گراں قیمت معدنی شے ریڈیم ہے اس کی ایک رتی کی
قیمت تمام جواہر کے مقابلہ میں کروڑ گنی ہے —

انگلستان کے مشہور قومی شاعر جو داغ کے ہمعصر بھی تھے یعنی لارڈ
ٹینیسن انھوں نے اسی خیال کی ترجمانی کے لئے ایک بڑی لانبی
چوڑی اور نہایت اچھوتی نظم لکھی ہے - واقعہ یہ ہے کہ حیات ابدی
صحت اور شباب جبتک ساتھہ ساتھہ نہوں زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے
اگر آپ لوگ اجازت دیں تو موصوف کی وہ نظم سناؤں اور بھائی
شمیم کو اس کے مفہوم بھی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتاتا جاؤں —

شمیم :- میں آپ کی اس عنایت کی قدر جام آب حیات سے زیادہ کروں گا -

سلیم :- میرے خیال میں تو نظم پڑھنے اور ترجمہ کرنے میں بہت زیادہ طوالت
ہوجائیگی - اچھا یہی ہوگا کہ شمیم صاحب صرف مفہوم سمجھادیں وہ
بھی مختصر اور سادہ لفظوں میں —

نسیم:- خیر آپ کی جو رائے ہو - بہر کیف مطلب تو آم کھانے سے ہے پیڑ گننے سے نہیں ' ٹینیسن نے معجز بیانی سے ایک ایسے شخص کی تصویر کھینچی ہے '

جو زندہ تو ہے مگر زندہ نہیں ہے

صرف سانس آتی جاتی ہے - جسم اور دماغ کی ساری قوتیں چراغ سحری اور آفتاب لب بام سے زیادہ نازک ہوچکی ہیں بدن ' ہڈی اور چمڑے کا ڈھیر رہ گیا ہے ' منہ پوپلا اور سوکھا ہوا ' انکھیں پتھرائی ہوئی دماغ سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہر موئے بدن زبان بےزبانی سے موت کا طالب گار مگر وہ مرنہیں سکتا .... کیوں ؟ اس لئے کہ اس نے شباب کی دیوی کی بات نہیں سنی تھی اور حیات ابدی بخشنے والی دیوی سے ' بقاء دوام کی دولت مانگ لی تھی -

اس کے بعد اسی سحر طرازی کے ساتھہ جوٹینیسن کا حصہ ہے ' یہ بتایا گیا ہے کہ صانع اور خالق ہر بات اور فطرت کا ہر قاعدہ انسان کے لئے بہتر سے بہتر ہے ' زرا کسی نے تجاوز کیا اور بد تر حالت کا شکار ہوا ' پھر یہ کہ موت ہی حیات کا زیور ہے اور حیات کی قدر موت ہی کی وجہہ سے ہے ، - اصل حیات شباب ہے' شباب کے معانی ہیں ' تمام جسمانی اور روحانی قوتوں کی اصلی اور فطری ترتیب ' ان کا طبعی توازن اور قدرتی تناسب ، جب یہ نہیں تو زندگی موت سے بد تر ہے ---

اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر شباب اور عمر دونوں کو دوام ہوجائے تو بھی زندگی بے لطف سی ہو جائے گی فطرت انسانی کا تقاضہ یہی ہے کہ آزاد رہے اور خیالات میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہے - ورنہ کوئی چیز کتنی ہی اچھی کیوں نہو ' طبیعت اُکتا ہی جاتی ہے ---

شمیم - تو اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ داغ ٹینیسن سے بڑھ گئے اس لئے کہ جو کچھہ پہلے نے

ایک شعر میں کہد یا ہے دوسرے نے پوری اور طویل نظم میں اسے پھیلا کر بتا یا ہے

نسیم :- اس سے مجھے قطعی اختلاف ہے - اگر دریا کو کوزے میں بند کرنا اور تحلیل و تنقیہ ' قدرت تخئّل و اظہار کا ثبوت ہے تو قطرہ کا سمندر بنانا اور استقراو تخرجہ بھی ' مشق فکر اور حسن کلام کا آئینہ ہے - دونوں نے اپنے جوہر پوری خوبصورتی سے دکھائے ہیں —

سلیم :- بیشک ؟ اگر آپ لوگ موازنہ اور مقابلہ کی بھول بھلیاں میں نہ پڑیں تو مناسب ہوگا اچھا آگے سنئے —

رفیق کہتے ہیں اس کو کہ قید خانے میں
چھٹا نہ مجھ سے جنوں میرے ساتھہ بلد ہوا

نسیم :- بھائی اس شعر میں تو کوئی خاص بات نہیں کہی ؟ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ جو برے وقت کام آئے وہی دولت ہے (A friend in need is a friend in deed) ' فارسی والوں نے بھی اسی خیال کو بہت خوبصورت پیرایوں میں ظاہر کیا ہے مثلاً :—

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشاں حالی و در ماندگی

یا :- بوقت تنگدستی آشنا بیگالہ میگردد صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ می گردد

یا اردو کا ایک شعر ہے جو کہیں زیادہ معنی خیز اور پر اثر ہے

سیاہ بختوں کا کوئی ساتھہ کب دیتا ہے دنیا میں
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انسان سے

شمیم :- خیال تو نیا نہیں ہے مگر طرز بیان اچھوتا ہے اور ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جسم کے ساتھہ کبھی دماغ قید نہیں ہو سکتا —

سلیم :- الٰہی اس بت مغرور سے یہ سنوادے نیاز مند ہوا میں نیاز مند ہوا
میری زباں نہ تھکی رات کٹ گئی ساری کھلاجو شکووں کا دفتر تو پھر نہ بند ہوا

سینے میں اب کہاں وہ جوش وہ بھی تھا اک اُبال سا
بیٹھ گیا کچھ اٹھتے ہی چھوڑ گیا خیال سا

نسیم :- " چھوڑ گیا خیال سا " یہ ٹکڑا نہایت نازک اور لطیف ہے مگر صرف ایک ٹکڑا پورے شعر کا بدل نہیں ہو سکتا ' اُبال سا بہت سست کہا ہے -

شمیم :- جی نہیں ' یہ فقرہ بھی چست ہے ' آپ نے خیال نہیں کیا ' نا پائیداری کے لئے ' محاورہ ہے کہ اپ کا جوش ایسا ہی ہے جیسے " چاول کا اُبال " کہ تھورا شوری سے آتا ہے اور فوراً ہی بے نمکی سے ختم ہوجاتا ہے -

سلیم :- عرض وفا یہ دیکھنا اس کی ادائے دل فریب
دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا

شمیم :- فاتحانہ انداز سے نسیم کو دیکھتا ہے اور سلیم دیکھتا ہے کہ نسیم کی مسکراہٹ زبان خفی سے کہہ رہی ہے کہ بڑے موقعے کا شعر ہے -

سلیم :- تارے ہی گن کے کاٹئے رات فراق کی مگر
نکلا ستارہ بھی کہیں کوئی تو خال خال سا
اس کی لچک پہ دم فدا اُس کی ادا پہ دل نثار
ہائے وہ شاخ سی کمر ہائے وہ قد نہال سا
باندہ دیا تھا ہم نے خود زلف میں اس کی اپنا دل
رکھ نہ سکے وہ اس کو بھی ٹال دیا وبال سا
ہے دل گم شدہ سرا گیسوئے تاب دار میں
ورنہ بتادو وجہ کیا یہ جو پڑا ہے جال سا

نسیم :- یہ مجھے بہت نا پسند ہے -

شمیم :- پہلیاں نہ بجھوائیے ' اسما کی جگہہ ضمائر نہ استعمال کیجئے ' یہ وہ

رہنے دیجئے ' کونسی بات نا پسند ہے -

نسیم :- دخل در معقولات نہ دیا کیجئے ' پوری بات سن لیا کیجئے ' ادب سیکھئے ' مقراض نہ بنئے ' بات نہ کاٹئے - اردو غزلوں میں بالعموم یہی نقص ہوتا ہے کہ ایک شعر میں وصال دوسرے میں ہجر تیسرے میں ترنم چوتھے میں نالہ ' کوئی تسلسل نہیں کوئی یک رنگی تخیل نہیں - صاف معلوم ہوتا ہے کہ کلام پر قدرت نہیں ہے اور فطرت انسانی کے بر خلاف کسی ایک جذبہ کو قیام نہیں -

شمیم :- غزلوں میں تسلسل کا ہونا ہی اس کا حسن ہے -

نسیم :- یہ بھی آپ کا حسن ظن ہے اور کچھہ نہیں ' کوئی وجہ بھی تو ہو -

شمیم کے ہونٹھوں پر مہر سکوت لگ جاتی ہے اور محراب ابرو اور بلند ہو جاتی ہے -

سلیم :- نسیم صاحب آپ کے اعتراضات محض غلط فہمی کی بنیاد پر ہیں ' دیکھئے آپ کی پوری تقریر تین اعتراضی حصص میں تقسیم ہو سکتی ہے ' اسی ترتیب سے جواب بھی سنئے '

(۱) غزلوں میں تسلسل نہیں ہوتا - یہ بات بالکل ٹھیک ہے مگر جیسا شمیم صاحب نے کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے کہ تسلسل نہ ہونا ہی تغزل کی روح رواں ہے اور اس کا زیور ہے کیوں؟ اس کا جواب اگلے دو اعتراضات کے رو سے آپ سے مل جائیگا - غالباً آپ کو تسلسل کا خیال محض اس لئے آیا ہے کہ یورپ کی شاعری اور بالخصوص انگریزی لیرک Lyric میں کوئی ایک مخصوص مضمون مسلسل ہوتا ہے - اس کے لئے اردو میں نظم ' مرثیہ ' قصیدہ ' مثنوی قطعہ اور

بہت سے دوسرے اصناف سخن کام دیتے ہیں ' کبھی کبھی کوئی غزل بھی مسلسل ہوتی ہے جیسا خود آپ کو داغ کے یہاں ' انجام جدائی اور داغ جدائی والی غزل میں معلوم ہوگا - مگر خاص شان غزلوں کی یہی ہوتی ہے کہ اس میں مضامین متفرق اور مختصر بیان کئے جائیں دوسرا اعتراض یہ ہے کہ غیر مسلسل ہونا ' کلام پر قدرت نہ ہونے پر دال ہے - میری نگاہ میں معاملہ اس کے برعکس ہے - کسی مفہوم کو کئی مصرعوں میں پھیلا کر بیان کردینا آسان ہے ' مگر ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ ایجاز اور کنایات کے دوش بدوش دو مختصر مصرعوں میں پورا مفہوم ادا کر دینا قدرت کلام نہیں ہے تو اور کیا ہے ؟ ابھی ابھی " خضر کو رشتۂ عمر ابد " والے شعر کے سلسلے میں آپ نے خود کہا ہے ' کہ تعلیل قدرت تخئل کی دلیل ہے " تیسرا اعتراض یہ ہے کہ غزل کے مختلف اشعار میں مختلف جذبات کا اظہار خلاف فطرت ہے ذرا سر فکر کو گریبان ہوش میں تو ڈالئے ' آپ کے جذبات رنج و غم کس قدر جلد جلد پہلو بدلتے رہتے ہیں جس طرح خیالات میں لاسلکی کے مقامات کی سی تیزی اور بجلی کی سی سرعت ہے ویسے ہی جذبات میں بھی بلا کی بیقراری اور عجلت ہے —

پھر لطف یہ ہے کہ معشوق سے باتیں کرتے وقت کوئی عاشق ' اسمبلی کا ممبر اور دارالامرا کا رکن ' کسی جامعہ کا پروفیسر یا کسی مذہبی مجلس کا مولوی نہیں بن سکتا ' ورنہ لطیف گفتگو ہی رخصت ہو جائے

اور سنئے - وادی عشق کی سیریں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانے

نسیم :- فریب اگلے زمانے والے —

سلیم :- لا اقط - خضر کیا جانے کبھی گھر سے نہ باہر نکلا - لال بوجھکڑ نہ بنئے شعر سنئے -

عشق نے خوب کیا ظاہر و باطن یکساں

داغ جو سینے پہ دیکھا وہی دل پر نکلا

نسیم :- شعر اچھا ہے مگر خلاف واقعہ ہے -

شمیم :- ممکن ہے آپ پر نہ پھبے مگر میں نے تو اکثر دیکھا ہے کہ آئین توریث کے ساتھ جہاں دماغی اور جسمانی محاسن و معائب باپ سے بچے میں منتقل ہوتے ہیں وہیں بعض عجیب تشابہ بھی دکھائی دیتا ہے ' میں نے تو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ ایک بکری کو کسی نے پٹھے پر ایک ڈنڈا اس زور سے جمایا تھا کہ وہ غریب مدتہ بھچک کر چلنے لگی اور جلد پر چوٹ کا نشان باقی رہ گیا ' بچہ ہوا تو ٹھیک اسی جگہہ اسی قسم کا نشان موجود تھا اور وہ بھی بھچک کر چلتا تھا - کیا آپ نے اندھے باپ کا اندھا بیٹا اور لنگڑی ماں کی لنگڑی بیٹی نہیں دیکھی -

نسیم :- جی نہیں میں نے تو ساری عمر میں کبھی نہیں دیکھا اب تک اس شرف سے محروم ہوں -

شمیم : کے آمدی کے پیر شدی ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھہ دن کی عمر ہی ہے ایسی ایسی دیکھوگے کہ آنکھیں کھل جائیں گی —

سلیم :- پھر وہی ذاتیات '

نسیم :- جل کر ' ذاتیات بھی کوئی ہوا ہے کیا ' ذرا سی ہنسی اور دل لگی کی بات بھی کہی تو فوراً آپ اُبل پڑتے ہیں - چلئے آگے چلئے -

سلیم :- جوش جنوں نے ساتھ دیا جوش حسن کا
ٹکڑے اُدھر نقاب ادھر پیرہن ہوا
زخم کہن نے آج رلایا بہت لہو
اُتری ہوئی بہار سے تازہ چمن ہوا
انکار وصل منہہ سے نہ نکلا کسی طرح
اپنے دہن سے تنگ وہ غنچہ دہن ہوا
اے عشق سن نہ لے کہیں فرہاد یہ صدا
تیشہ پکارتا ہے کہ میں کوہ کن ہوا
تن تن کے دیکھتے ہیں مجھے پھر بار بار
میں انجمن میں آئینہ انجمن ہوا
کوسوں تک اٹھے پاؤں چلا آہ میں غریب
جب تک مری نظر سے نہ پنہاں وطن ہوا

نسیم :- واہ حضرت واہ - کیا وطن پرستی ہے اور پھر کیوں ؟

شمیم :- اس لئے کہ -

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر پادشاہی میکرد
میگفت گدا بودن کنعاں خوشتر

نسیم :- تو پھر یوں کہئے کہ

مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہی رہا آہ میں غریب
جب تک مری نظر سے نہ پنہاں وطن ہوا

سلیم :- ہنس کر - شعر کو خوب ذلیل کیا ' اے ماشاءاللہ استادوں پر اصلاحیں

دینے لگے (ذوق) ثانی ہوئے ـ

جس لب کو حسرت رہ گئی نزاکت سے بار تھا
سلتا ہوں آج میں کہ وہ پیماں شکن ہوا
ہاتوں سے جو بچے تیوروں باتوں سے مرگئے
چتون میں تھا جو تیر وہ اب پر سخن ہوا
وہ اور ہیں جو پیتے ہیں موسم کو دیکھ کر
آتی رہی بہار میں توبہ شکن ہوا
ایماں کچھ رضو تو نہیں ہے کہ ٹوٹ جائے
اے شیخ کیا ہوا جو میں توبہ شکن ہوا
ہم نہ کہتے تھے نہ کر عشق پشیمان ہوگا
جو کیا تونے وہ آگے آ،رے اے دل آیا

طور کیوں خاک ہوا نور ترا نار نہ تھا
ناز تھا حضرت موسیٰ سے وہ دیدار نہ تھا
ذکر مجنوں سے مجھے آگ لگی جاتی ہے
گرچہ ظاہر ہے تمہارا وہ طلب گار نہ تھا

فہیم :- سچ ہے - عشق ست و ہزاربد گمانی

سلیم :- بس کیا چاہئے جب مفت کی حجت ٹھہری
اس گلہ پر مجھے مارا کہ گنہ گار نہ تھا
جاں اس زلف پریشاں نے بچھایا اے دل
لے سنبھل پھر یہ نہ کہنا کہ خبردار نہ تھا

سوزن عیسئی مریم خار صحرا ہوگئی
زخم دامن دارکس وحشی کا داماں ہوگیا
بوسہ لیکر دل دیا ہے اور پھر نالاں ہیں داغ
کوئی جانے مفت کا حضرت کا نقصاں ہوگیا

وہ بات کونسی گزری جو اضطراب نہ تھا
جب آنکھ دی تھی خدا نے مجھے تو خواب نہ تھا
میرے سوال کے معنی وہ سمجھہ کے کہہ دیتے
مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا

نہ پوچھئے میرے روز سیاہ کی ظلمت
چراغ لیکے بھی ڈھونڈھا تو آفتاب نہ تھا
ہمارے حال کو جس نے سنا کہا سب جھوٹ
کوئی زبان نہ تھی جس پہ یہ جواب نہ تھا
ملا ہمیں دل پر داغ کا نشان اتنا
جلے کباب کو بو تھی مگر کباب نہ تھا
جوان ہوئے تو قیامت ہوئے خدا کی پناہ
وہ جب ہی فتنہ تھے جب عالم شباب نہ تھا

نسیم:- یہ لیجئے پھر وہی سوقیانہ محاورہ ' بازاری خیال اور مخرب اخلاق شعر آگیا —

شمیم:- اس طرح کے شعر تو فارسی اور اردو شاعری میں آپ کو کم سے کم دس ہزار ملیں گے یہ دوسری بات ہے کہ داغ کے علاوہ اور کہیں ابتذال کا بہوت آپ کو دکھائی ہی نہ دے سنئے امیر کہتے ہیں —

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوی

سلیم :- ابھی کچھہ ایسی زیادہ رات نہیں گئی ' جن مسائل کو ہم نے طوالت کے خیال سے پہلی نشست میں ملتوی کر رکھا تھا اچھا تو ہے کہ اس پر ایک نگاہ ڈال لیں - نسیم صاحب یہ تو بتائیے کہ آپ " لفظ پرست " ہیں یا مفہوم پرست ؟

نسیم :- میں آپ کا مطلب کچھہ صاف سمجھا نہیں —

شمیم :- میں جہاں تک اس سوال کے معنی سمجھا ہوں وہ یہ ہیں کہ بوسہ ' وصل ' شب ' جوانی ' شوخی - بیخودی شباب انگیا - چولی' سرمستی ، بے حجابی ' بے نقابی ' وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جنہیں سطحی نگاہ رکھنے والوں نے ابتذال کا زیور سمجھہ رکھا ہے مگر غالبا نسیم صاحب ایسے ظاہر پرست نہیں ہیں

نسیم :- ظاہر ہے کہ ہر لفظ کسی نہ کسی خیال کا مادی پیکر ہوتا ہے مگر یہ بھی مسلّم ہے کہ ہر شے کی برائی اور بھلائی کا اظہار لفظوں ہی سے ہوتا ہے - میں یقیناً ایسے الفاظ کا استعمال ننگ شاعری سمجھتا ہوں جن سے جذبات عالیہ کی ترقی و تہذیب کے بجائے سفلی محسوسات اور بہیمیہ حرکات میں جوش آئے - غالباً ہر شاعر کا یہ فرض ہے اور ہونا چاہئیے کہ اُس کی شاعری سے روحانی ترقیاں ہوتی رہیں —

سلیم :- اگر آپ لوگ ایک ایک بات لیں تو زیادہ مناسب ہوگا ورنہ بحث کے طوفان میں گفتگو کی کشتی ساحل مراد سے برابر ہٹتی چلی جائیگی - یوں آغاز کیجئیے کہ شاعر کا فرض کیا ہے —

شمیم :- میری نگاہ میں شاعر مصلح قوم اور رہبر وطن ضرور ہے مگر ایک خاص انداز سے اور مخصوص طرز کے ساتھہ - وہ نہ تو فقیہہ کی طرح

مسائل کی توضیح کرتا نہ مبلغین کی صورت دعوت خیر دیتا ہے '
نہ اہل سیاست کے مثل جوش میں لانے والی تقریریں کرتا ہے بلکہ
بالواسطہ تعلیم اس کی شاعری سے ملتی ہے وہ خشک سے خشک
مفہوم کو اپنی جادو بیانی سے دلچسپ بنا دیتا ہے وہ با کمال
مصور کی طرح لفظوں میں جیتی جاگتی تصویریں کھینچ دیتا ہے ' کبھی
مخاطب کو رلاتا ہے کبھی ہنساتا ہے کبھی شرم دلاتا ہے کبھی ہمت
کی تلقین کرتا ہے کبھی مایوسی کے پہلو دکھاتا ہے غرض جذبات
کی تہذیب کرتا ہے —

سلیم: ہاں اسی لئے فلاطون نے اپنی معرکۃ الارا جمہوری شہر کی تعمیر کے سلسلہ
میں جہاں تعلیم کا ذکر کیا ہے وہاں ہر ایسی شاعری کو حدود شہر
سے بدر کردیا ہے جو سادہ سی سادہ زبان میں نہ ہو اور صاف سے
صاف اخلاقی مسائل سے لبریز نہ ہو '

شمیم: کسی بڑی ہستی کے حوالے کو برھان سمجھنا بھی بجائے خود ایک
مغالطہ منطقی ہے - میری نگاہ میں شاعر کا فرض یہی ہے کہ وہ
جذبات کی تہذیب کرے - داغ کی شاعری سے جذبات کی تہذیب ہوتی ہے
جس کے وجوہ اگر اپ اجازت دیں تو عرض کروں ؟

نسیم: وجوہ نہیں دلائل —

شمیم: دلائل نہیں وجوہ - صرف اپنا خیال بتانا چاھتا ہوں اور معقول وجہہ
معلوم ہونے پر ہر ملت اپنے خیال کو بدلنے کے لئے تیار ہوں —

سلیم: لفظوں پر تکرار کرنے سے تو کوئی نتیجہ نہیں —

شمیم: یہی تو میں بھی کہتا ہوں - خیر - میں یہ عرض کر رہا تھا کہ داغ
کی شاعری سے جذبات کی تہذیب ہوتی ہے اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں

(۱) صفائی اور سادگی ' زبان کی سلاست اور محاورات کی بلاغت سے اثر بہت اچھا پڑتا ہے

(۲) واردات قلب کا اس عمدگی سے بیان ہوتا ہے کہ مخاطب کی طبیعت پر بھی وہی اثر ہوتا ہے جو داغ کی طبیعت پر ہوا تھا۔ اس کا تجربہ تو نسیم صاحب کو بھی ہوگا کہ " ذاتی عنصر " ادب کے لئے نہایت ضروری چیز ہے —

(۳) یہ کہ جہاں کہیں داغ تغزل اور استقرا سے کام لیتے ہیں وہاں بھی اتنا ڈوب کر کہتے ہیں کہ مخاطب کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود داغ کی سرگذشت ہے —

(۴) نتائج اور اثر ' ترنم اور توازن سے بالعموم جذبات کی تہذیب ہوتی ہے اور " تفریح " سے بالخصوص - حیات انسانی کیلئے فرحت سے زیادہ اور کوئی چیز اچھی نہیں ہے ' غذا ' دوا ' ہوا ' کلام ' مکان ' سیر ' غرض جس چیز سے فرحت ہو وہی بہتر ہے —

نسیم : اچھا فرض کر لیجئے کہ جذبات کی تہذیب داغ کے کلام سے ہوتی ہے تو بھی شمیم صاحب کو اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ بلا تخصیص ہر قسم کے جذبات کی تہذیب ہوتی ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اخلاقی جذبات کی تہذیب ہو اور سوقیانہ جذبات ملیامیٹ کر دئیے جائیں —

سلیم : دیکھئے شاخ سے شاخ نکلتی آتی ہے - کونپل سے کونپل پھوٹتی جاتی ہے - پہلے تو یہ بتائیے کہ اخلاقی جذبات کیا ہیں اور سوقیانہ جذبات سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ —

نسیم : میں منطقی تعریفیں تو نہیں کرسکتا مگر جو مفہوم میرے ذہن

میں ہیں ان کو بتانے کی کوشش کر سکتا ہوں —

شمیم: مفہوم ہی بتائیے —

نسیم: ہمت ' مروت ' دلداری ' خدمت خلائق ' عفو ' کرم ' بخشش ' اخوت ' رحم ' شجاعت یہی سب اخلاقی جذبات کے عناصر ہیں اور سوقیانہ جذبات کے اجزا انگیا ' محرم ' چولی ' بوسہ ' ہم آغوشی ' سر مستی ' کے مرقعے ہیں —

شمیم: یہ تو بتا دیجئے کہ داغ کے کلام سے صرف سوقیانہ جذبات کی تہذیب ہوتی ہے یا اخلاقی جذبات کی بھی —

نسیم: اخلاقی جذبات ہیں تو مگر خال خال اور پورا کلام سوقیانہ جذبات کی گہری چادر میں ایسا ملفوف ہے کہ چند جھلملاتے ہوئے روشن تارے بھی دم توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں —

سلیم: پھر وہی قبل از مرگ واویلا کی چھڑ گئی - زینہ بہ زینہ چڑھئے تب کہیں بام مقصود تک رسائی ہوگی - سوقیانہ جذبات کی تہذیب سے خدا جانے نسیم صاحب کی مراد کیا ہے —

نسیم: میرا مطلب یہ ہے کہ مبتذل اور مخرب اخلاق اشعار سے سوقیانہ جذبات ابھرتے ہیں اور ان میں ہیجان پیدا ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مخاطب بد خلق بدچلن اوارہ معاش اور خوفناک طور پر آزاد ہو کر اپنے خاندان اپنی قوم اور اپنے وطن کے لئے ہیبت ناک ہو جاتا ہے —

سلیم: اچھا یہ تو بتائیے کہ اخلاقی جذبات یا اخلاق ' اضافی لفظ ہے یا اس کا معیار ساری دنیا کے لئے ایک ہے —

نسیم: یہ سوال تو بہت ٹیڑھا ہے ' ظاہر ہے کہ موقع اور محل ' وطن اور قوم

دصر اور زمانہ فضا اور مناسبت کے ماتحت اخلاقیات عالم مختلف ہیں، وہی چیز جو ایک کے یہاں اخلاق کی کان ہے دوسرے کے یہاں مخرب اخلاق ہے، مثلاً ، شراب نوشی اور رقص و سرود ، شادی اور آزادی پردہ اور بے حجابی —

سلیم : مجھ کو اس وقت بے اختیار داغ ہی کا ایک شعر یاد آگیا —

راہ پر ان کو لگا لاے ہیں ہم باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

شمیم : کتنا بر محل پڑھا گیا ہے —

سلیم : اچھا یہ تو بتائیے کہ سوقیانہ جذبات، یعنی جن کو آپ منافی اخلاق سمجھتے ہیں - ان کا مایا سبب ہونا جہل سے ممکن ہے یا علم سے ، اور اس سے پہلے یہ بتائیے کہ انسان قوانین فطرت کے ماتحت سوقیانہ جذبات رکھتا ہے یا نہیں —

نسیم : اور صاف کرکے پوچھئے —

شمیم : غالباً سلیم صاحب یہ پوچھنا چاہتے ہیں - کہ آپ جن کو سوقیانہ جذبات کہتے ہیں وہ فطرت انسانی میں داخل ہیں یا نہیں - طبعی ہیں یا اکتسابی ؟

نسیم : قطعاً فطری اور طبعی ہیں - مثلاً مرد اور عورت کے تعلقات ہی کو لے لیجئے ، تمام عالم حیوانات اور نباتات میں صنف مخالف کی جانب فطری میلان ہوتا ہے —

سلیم : اور آئین فطرت کی خلاف ورزی ، مخرب اخلاق ہے یا اخلاق کی تہذیب کرتی ہے ؟

شمیم : مخرب اخلاق ہے —

نسیم - مگر ہر چیز کی حدیں ہوتی ہیں - اگر سماج کے لئے کسی مرد اور عورت کے تعلقات تکلیف دہ ہوں تو وہ مخرب اخلاق ضرور ہے - ورنہ نہیں ہے - اور پھر یہ تعلقات مضر صحت بھی نہ ہونے چاہئیں —

سلیم - اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ خود فطری میلان اور تسلی خواہش بنفسہ مخرب اخلاق نہیں ہیں صرف ان کا ناجائز مضرت مورد الزام ہے —

نسیم - یقیناً - اچھا ہوگا کہ آپ اسی ایک مثال کو قائم رکھئے دیکھے تاکہ گتھیوں کے سلجھانے میں آسانی ہو —

سلیم - یہ توسچ ہے مگر اس طور پر ہم لوگ معاشیات ' اور نفسیات کی طلسمی بھول بھلیاں میں پڑکر کھو جائینگے - اور نفس مطلب سے بہت دور جا پڑینگے میرے خیال میں بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ ہم سب سے سیدھا اور صحیح راستہ اختیار کریں —

شمیم - وہ کیسے ؟

سلیم - وہ ایسے کہ ہمیں اخلاق ' آزادی رائے ' اشاعت کلام اور تہذیب جذبات وغیرہ سب کو چھوڑ کر صرف دو سوالوں پر غور کرنا چاہئے - ایک یہ کہ برائی سے لاعلمی برائی سے بچا سکتی ہے یا برائی کا علم برائی سے بچا سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ ادب سے انسان کے چال چلن پر کسقدر اثر پڑتا ہے —

نسیم - واقعی یہ طریقہ بہترین ہے - آپ کے پہلے سوال کا مطلب میں نہیں سمجھا -

شمیم - وہ تو کھلی ہوی سی بات ہے - جاہل انسان طرح طرح کے اخلاق سوز حرکات میں مبتلا ہوتا ہے عالم کبھی نہیں ہوتا —

سلیم : دیکھئے مذہبی ملکی اور قومی سوالات نہ آنے دیجئے ادب کا دیوہ عالمگیر ہے اس کو محدود نہ کیجئے اس بحث کو تو جانے ہی دیجئے کہ

حسن وقبح ' برائی اور بھلائی ' اضافی ہے یا نفسی یہ بتا دیجیے کہ تمام متمدن اقوام کا موجودہ لائحہ عمل یہ ہے کہ بچے اور بچیوں کو راشد اور بالغ ہونے سے پہلے ہی علم الاضات کے تمام راز معلوم ہو جانے چاہئیں - یا یوں سمجھئے کہ ہم جن چیزوں کو برا سمجھتے ہیں ان سے بعض اسی وقت بچتے ہیں یا بچ سکتے ہیں جب ہم کو ان کا علم ہو جاتا ہے یہ علم ذاتی تجربہ سے بھی ہو تا ہے اور پڑھنے یا سننے سے بھی ہوتا ہے —

نسیم : اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ خراب سے خراب اور گندے سے گندہ لٹریچر بھی مضرب اخلاق نہیں ہو سکتا —

شمیم : یہ لٹریچر کیا بلا ہے ' —

نسیم : معاف کیجئے گا ! آمد سخن میں انگریزی کا ایک لفظ بے ساختہ نکل گیا ' میری مراد ادب سے تھی—

سلیم : ہاں نسیم صاحب میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ گندے سے گندہ ادب بھی مضرب اخلاق نہیں ہو سکتا —

نسیم : ذرا عقل کے ناخن لیجئے ' کیا بچے اور کم پڑھے لکھوں پر بری بات اور اور بری کتاب کا برا اثر نہیں پڑتا —

سلیم : یقیناً برا اثر پڑتا ہے مگر ایسے ادب کی اشاعت اور اس کا بچوں اور کم پڑھے لکھوں تک پہونچنا یا نہ پہونچنا اس کی ذمہ دار خود حکومت ہے یا قوم یا خاندان والے یا سر پرست —

نسیم : خیر یہ تو آپ نے مان لیا کہ گندے ادب سے اخلاق خراب ہوتا ہے —

سلیم - نہیں یہ تو میں نے نہیں مانا ہے کہ بے سمجھ لوگوں تک ایسی باتیں نہ پہونچنی چاہئیں جو جذبات بہیمیہ کو ابھارسکیں اور بیجا طور پر

ابھار سکتی ، میں طبعاً مذہبی اور مجلسی مباحث سے گریز کرتا ہوں
کہ مبادا کسی کی دل‌آزاری نہو ورنہ مثالیں دیکر اپنے مطالب اور صاف
کر دیتا اس کے علاوہ میرا یہ خیال ہی نہیں مجھکو یقین ہے کہ صرف
ادب نہ کسی کا چال چلن بے داغ بنا سکتا ہے نہ کسی کو بد چلن بنا
سکتا ہے ' یہ محض صدہا وجوہ ؛ فضا ' معاشرت ' خلقی خصوصیات
طبعی رجحان ' طرز تعلیم - روش تربیت ' حادثات اور تجربات میں
سے ایک وجہہ ہے ؛ پھر یہ کیسی زیادتی ہے کہ وجوہ کی جھرمٹ میں
سے آپ صرف ایک ہی غریب وجہہ کے سر تمام الزام تھوپ دیں اور
میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ لفظ پرستی سے کام نہ لیجئے تو آپ
داغ کے یہاں ایک شعر بھی گندہ نہیں دکھا سکتے - میں نے اپنے انتخاب
میں کوشش کی ہے کہ گلزار داغ میں جتنے شعر بظاہر شوخی کے
پہلو لئے ہوے ہوں یا جن میں جذبات کی عریاں تصویریں ہوں
جنھیں عرف عام میں فحش مبتذل اور خدا جانے کیا کچھہ کہتے ہیں
سب کو چھانٹ لوں اور میں اُن پر بڑی خوشی سے بحث کے لئے تیار ہوں

نسیم - اگر آپ نے صرف ایسے ہی شعر منتخب کئے ہوتے تو ہماری گفتگو بڑے
مزے سے اور بہت جلد ختم ہوجاتی —

سلیم - ہاں مگر ایسے شعر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اس کے علاوہ جب تک
آپ کسی شاعر پر ہر پہلو سے نگاہ نہ ڈالیں اور صرف ایک ہی انداز
بیان کو لے لیں تو بڑا دھوکا ہوسکتا ہے —

شمیم - اچھا تو پھر پڑھتے جائیے اور وہی طریقہ رہے کہ جہاں کہیں ہم میں
سے کسی کو کچھہ کہنا سننا ہو کہ سن لے —

سلیم - بہت خوب سنئے —

پیا مہر تجھے لاکھوں سوال کرنے تھے
نہ تھا ہزار میں ایک بات کا جواب نہ تھا

نہ پوچھ مجھ سے میرے جرم داور محشر
میرے گناہوں کا دنیا میں بھی حساب نہ تھا

اگرچہ بادہ کشی تھی گناہ اے زاہد
جو تجھ سے چھپ کے پیتا تو کچھ عذاب نہ تھا

سنا کلام جو رندوں کا شیخ گھبرایا
وہاں تو باتوں کا چھینٹا بھی بےشراب نہ تھا

کیوں کر اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

تیرا دو روز کا وعدہ بھی نہیں حشر سے کم
ایک اک دن مجھے ایک ایک مہینا ہوگا

نسیم :- یہ تو بالکل فطرت کے خلاف ہے، کہاں ایک دن اور کہاں ایک مہینا —

شمیم - بھائی تم بھی بعض وقت بڑی بھولی باتیں کرتے ہو - کسی محبوب کا انتظار ہو، یا بستر بیماری پر شدت درد میں تڑپو تو پتہ چلے کہ واقعی ایک گھنٹہ ایک دن سے زیادہ معلوم ہوتا ہے یا نہیں —

سلیم :- ہے واسطے ہر کام کے اک روز مقرر
ہوتا جو نہ انصاف تو محشر بھی نہ ہوتا

نسیم :- یہ تو کوئی نئی بات نہیں —

سلیم - بات تو واقعی نئی نہیں ہے پہلا مصرعہ تو بالکل قرآن کے اس فقرہ کا منظوم ترجمہ ہے کہ لکل امر مرهون باوقاتها مگر دوسرے مصرعہ نے

انداز بیان میں چار چاند لگادئے ہیں —

سلیم - بھائی ان خواہ مخواہ کی باتوں میں تو واقعی وقت مفت صرف ہوا جاتا ہے، ٹوکنے ہی کی جگہ ٹوکئے تو بہتر ہے —

نسیم - بہت اچھا تو اپنی رام کہانی سنائیے جائیے —

سلیم - (جھنجھلاکر) اگر داغ کی شاعری رام کہانی ہے تو میں بلند کرتا ہوں -

نسیم - یہ تو آپ برسے پڑتے ہیں ہوا سے لڑتے ہیں - اجی جناب اپنا انتخاب پڑھئیے بس اب تو کھل گئے —

سلیم - مجھہ سے بہتر میرا ملال رہا
کہ ترے دل میں مدعا رہا

نسیم - ذکر میرا مجھہ سے بہتر تھا کہ اُس محفل میں تھا —

سلیم - مل چکے بس ملینگے خاک میں ہم
ہو چکا وصل تو وصال رہا

نسیم - وصل اور وصال تو ایک ہی چیز ہے پھر یہ کیا ؟

شمیم : صوفیوں کی اور سالکوں کی اصطلاح میں طالب معشوق حقیقی میں جو موت ہوتی ہے اس کو وصال کہتے ہیں - اس لئے فنا ہونے والے کی روح حقیقی سر چشمہ روح سے متصل ہوجاتی ہے —

نسیم : انگریزی کے مشہور فلسفی شاعر براوننگ کا نظریہ بھی روح اور موت کے متعلق اسی قسم کا ہے —

شب غم بھی گزر ہی جائے گی نہ رہے گا نہ ایک حال رہا
دل ہمارا وہ چیز ہے جس کا لب معشوق پر سوال رہا
داغ نے حال دل کہا ان سے کچھہ بھی کمبخت کو خیال رہا

بشر نے خاک پایا، لعل پایا یا گہر پایا
مزاج اچھا اگر پایا تو سب کچھ اس نے بھر پایا
وہ میرا چھیڑنا آغاز الفت میں شکایت سے
وہ رکھہ کر ہاتھہ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا
رہی ہے رات بھر تھم تھم کے رہ رہ کر جھپک دل میں
جگا یا لے کے چٹکی درد نے جب بے خبر پایا

عاشق چہرہ ہوا بندۂ گیسو نہ ہوا		دل تو کافر بھی کتابی ہوا ہندو نہ ہوا

نسیم: یہ کافر کتابی کیا بلا ہے ؟

شمیم: مسلمانوں کے نزدیک کافر کتابی صرف وہی ہیں جن پر اللہ کی طرف سے کتابیں اتری ہوں مگر منسوخ ہوگئی ہوں اور وہ خود گمراہ ہوگئے ہوں —

سلیم: یہ باتیں مذہبی ہیں - اگے سنئے

شوق بوسہ اسے کہتے ہیں کہ میرے دل میں
لب معشوق ہوا تیر ترازو نہ ہوا

نسیم: بھائی دوسرے مصرعے کا مفہوم میری سمجھہ میں تو خاک نہیں آیا —

شمیم: تیر کا ترازو ہونا اس موقع کا محاورہ ہے جب تیر جسم میں اس طرح پیوست ہو کہ آدھا حصہ باہر ہو اور آدھا اندر رہ جائے ، اسی پیوستگی کو داغ شوق بوسہ اور لب معشوق سے تعبیر کرتے ہیں —

سلیم: کر لئے جمع حسینوں نے ہزاروں فتنے
عرصۂ حشر ہوا گوشۂ ابرو نہوا

شمع پر سہاگ کے تکئے ہوں بغل میں داغ
گرم جب ہوں تو شب ہجر میں پہلو نہوا
لڑتی ہیں کچھ عجب انداز سے نیچی نظریں
کوئی آئینہ ہوا آپ کا زانو نہ ہوا
ھڈیاں گھل گئیں سہنے کی گداز ہم سے
گھل کے پیکان تیرے تیر کا آنسو نہ ہوا
نام رکھتے ہیں مسیحا کو وہ یہ کہہ کہہ کر
لب اعجاز ہوا آنکھ میں جادو نہ ہوا
بزم اغیار کا مذکور ہے میرے آگے
وہ بھی اس طرح کہ افسوس وہاں تو نہ ہوا

نسیم: تو یہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مہاتما گاندھی سر سپرو سے مہز بیضاوی اور لندن کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں —

سلیم:- جب کہ موسیٰ کو غش آیا تھا یہ چھینٹا دیتا
شعلۂ برق تجلی مگر آنسو نہ ہوا
ایک دن غیر کے پہلو میں انہیں دیکھا تھا
جب سے وہ بات نہ کی جس میں کہ پہلو نہ ہوا
پندگو لطف ملاقات اسے کہتے ہیں
خوش کبھی میں نہ ہوا شاد کبھی تو نہ ہوا
بدگمانی نے ہمیں رات کو آوارہ کیا
کہ جہاں ہم گئے اے شوخ وہاں تو نہ ہوا

نسیم:- کیسا بازاری شعر ہے —

شمیم:- محض آوارہ اور رات کی وجہ سے آپ کہتے ہیں رات سے اگر جہا لت

کی تاریکی سراہ لے ایجئے تو سارا غصہ کافور ہو جائے - پھر وہی کہوں گا کہ جو جیسا ہوتا ہے ویسا ہی اثر قبول کرتا ہے —

سلیم :-　مرثیہ ہم دل مقتول کا پڑھتے اے داغ
اس کی مجلس میں مگر کوئی بھی بازوند ہوا

بازو اس مددگار کو کہتے ہیں جو سوز خوانی میں مرثیہ پڑھنے والے کو آس دیتا ہے —

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا

قطرۂ خوں جگر سے کی تواضع عشق کی
سامنے مہمان کے جو تھا میسر رکھ دیا

نامہ بر کہتا ہے مجھ سے کیا کرامت ہے تمھیں
جو وہ لکھتے وہ بھی تم نے خط میں لکھ کر رکھ دیا

سن لیا ہے پاس حوروں کے پہونچتے ہیں شہید
اس لئے لاشے پہ میرے اس نے پتھر رکھ دیا

شوق بھی ہے وہم بھی ہے کیا کروں اے نامہ بر
کل جو لکھا کاٹ کر وہ آج دفتر رکھ دیا

کہتے ہیں بوئے وفا آتی ہے ان پھولوں سے آج
دل جو ہم نے لالہ و گل میں ملا کر رکھ دیا

ذبح کرتے ہی مجھے قاتل نے دھوئے اپنے ہاتھ
اور خون آلودہ خنجر غیر کے گھر رکھ دیا

زندگی میں پاس سے دم بھر نہ ہوتے تھے جدا
قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھ دیا

فہیم - اسی سے لگ بھگ ثاقب لکھنوی کا یہ شعر بھی سن لیجئے (خواب آمیز آواز میں) —

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

سلیم - دیکھئے اب ٹھوکریں کھاتی ہے کس کس کی نگاہ
روزن دیوار میں ظالم نے پتھر رکھدیا
داغ کی طاقت جوانی اضطراب شوق میں
حال دل کمبخت نے سب ان کے منھہ پر رکھدیا

ھائیں یہ کیا تم جھپکیاں لے رہے ہو —

نسیم - انگڑائی لے کر - ہاں نیند تو آرہی ہے —

سلیم گلزار داغ ' کو بند کر دیتا ہے تینوں دوست رخصت ہو کر اپنے اپنے بستر پر چلے جاتے ہیں اور میں " کاتب بھی کچھہ دنوں کے لئے آپ لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں —

)‡§•§‡(

مثنوی اسرار محبت

از

جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب ایم ۔ اے پروفیسر اردو لکھنؤ یونیورسٹی

(سسی پنوں کا قصہ)

اکتوبر سنہ ۳۱ ع کے رسالۂ اُردو میں پروفیسر قاضی فضل حق صاحب کا ایک مضمون ,, سسی پنوں " کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے مسعود عمر نورالہی صاحبان کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے لوگ ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے پنجابی قصوں کو مبتذل سمجھا کئے ۔ اور فارسی اردو کے شاعروں نے ان قصوں کو التفات کی نظر سے نہیں دیکھا ۔ اور ثبوت میں فارسی اور اردو کی ان کتابوں کی فہرست پیش کی ہے جن میں یہ قصے نثر یا نظم میں بیان کئے گئے ہیں ۔ میں اس فہرست میں ایک اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں —

میرے کتب خانے میں ایک مثنوی ہے جس کے سر ورق پر یہ عبارت درج ہے :—

,, الحمد للہ کہ قصہ سسی پنوں مسمیٰ بہ مثنوی
اسرار محبت در بیت السلطنت لکھنؤ طبع شد "

اور خاتمے کی عبارت یہ ہے :—

" للہ الحمد و المنتہ کہ بعنایت ایزد بیچوں نسخۂ اسرار محبت باتمام رسید "

مصنف کا نام کہیں درج نہیں ہے - تخلص بھی صراحت کے ساتھ کہیں نہیں آیا ہے - صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ مسٹر جانسن * جو مرزا جانسن کہلاتے تھے مصنف کے ایک دوست تھے اُنھیں کی فرمائش سے یہ قصہ مثنوی کی شکل میں نظم کیا گیا - اِس فرمائش کا ذکر کرتے ہوے لکھتے ہیں :—

زبس ہے مجھہ میں اور اس میں محبت | بہم آپس میں تھے ہم گرم صحبت
سدا بزم طرب تھی واں مہیا | سدا رہتا تھا مجمع گلرخوں کا
قضارا یہ ہوا اک روز مذکور | کہ افسانہ ہے اک دلچسپ و مشہور
وہ قصہ سسی اور پنّو کا ہے گا | اگر منظوم ہو جاوے تو اچھا
کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات | اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات
تو مضموں کرکے اس قصے کا معلوم | یہ ہے منظور کر تو اس کو منظوم
یہ بات اتنے لئے تجھہ سے کہی ہے | کہ مشق اس کی بہت تجھہ کو رہی ہے
تجھے اس عشق کے ہیں کار معلوم | محبت کے ہیں سب اسرار معلوم
پیا ہے تو نے بھی جام محبت | سراپا تو ہے ہمنام محبت
تیرے اشعار سن کر سب سخن داں | محبت کا اسے کہتے ہیں دیواں
بس اس قصے کا جلدی فکر کر تو | اسے منظوم کرکے دے تو مجھہ کو

سو ان کی رغبت دل کرکے معلوم
کیا میں نے اس افسانے کو منظوم

ان شعروں میں نویں اور دسویں شعر سے مصنف کا ہم نام محبت ہونا

---

* لطف نے ان کا خطاب ممتاز الدولہ اور نام جانسن بتایا ہے - ادیب

اور ان کے دیوان کا دیوان محبت ' کہلانا ظاہر ہوتا ہے اور اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مصنف کا نام بھی محبت تھا اور تخلص بھی محبت ' قیاس کہتا ہے کہ اس مثنوی کے مصنف نواب محبت خاں محبت تھے جو حافظ رحمت خاں والئی بریلی کے بیٹے تھے اور نواب آصف‌الدولہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اُن کے نام سے لکھنؤ کا ایک محلہ اب بھی محبت خاں کا کٹرا ' کہلاتا ہے۔ مثنوی کے آخری شعر میں مصنف نے اس کی تصنیف کا سال یوں بتایا ہے —

کہی تاریخ یہ اس کی بصنعت   عجب قصہ ہے اسرار محبت

اس شعر کے دوسرے مصرع سے سنہ ۱۱۹۷ھ نکلتے ہیں اس سے مصنف کا عہد آصف الدولہ میں موجود ہونا ثابت ہوتا ہے اور میرے قیاس کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ اس اندرونی شہادت اور قیاسی دلیل کے علاوہ منشی عبدالکریم اور مرزا علی لطف نے بھی اپنے تذکروں میں نواب محبت خاں ' محبت ' کے حال میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ گارساں دتاسی بھی ان دونوں کا ہم نوا ہے۔ اس کے بیان سے اتنا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی بہت مشہور و مقبول ہوئی تھی — *

اصل قصے کے متعلق مصنف کی رائے یہ ہے:-

عجب قصہ عجب ہے کہانی   کہ سن کر ہو دل فولاد پانی

عجب کیا ہے میری سن کر یہ تقریر   بہاوے اشک خونی چشم تصویر

سمجھتا ہی نہ ہووے جو دم سرد   جگر سے وہ بھی کھینچے آہ پر درد

---

* اس اطلاع کے لئے میں مشہور ادیب جناب نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال کا منت گزار ہوں —

نہ ہو خلقت میں جس کی عشق زنہار — اسے بھی زندگی ہو جائے دشوار
عزیزو کیا کروں اس کا بیاں ہائے — کہ مرجانے کی ہے یہ داستاں ہائے

اس بیان سے ظاہر ہے کہ مصنف اس قصے کو مبتذل نہیں بلکہ بے حد پردرد و پراثر سمجھتا ہے - مثنوی کا خلاصہ یہ ہے -

جنگ سیال ایک ملک ہے جس میں حسینوں کی بستی ہے - گھر گھر حسن عشق کے چرچے ہیں - اُسی ملک میں ایک گھر تھا جس کو "خانہ عشق" کہنا زیبا ہے - اس گھر میں ہیر نام ایک پری زاد رہتی تھی جو رانجھا کے عشق میں گرفتار تھی - اُسی کی ایک بھتیجی سسی حسن و جمال میں بے نظیر تھی - ایک دن اُس کی ایک ہمقوم عورت نے آکر خبر دی کہ تیرے باغ میں بلوچوں کا ایک قافلہ اُترا ہے "کہ جس میں رشک گل ہر اک جواں ہے" یہ سن کر سسی اُسی عورت کے ساتھ اُس قافلے کو دیکھنے گئی - وہاں ایک خوب صورت نوجوان سے اُس کی آنکھ لڑگئی جس کا نام پنوں تھا - دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہوگئے - پھر دونوں میں کچھ راز و نیاز کی باتیں ہوئیں - پنوں نے شب باشی کے لئے اصرار کیا - مگر وہ لوگوں کے خوف سے اس وقت نہ ٹھیری - رات کو عزیزوں کی آنکھ بچاکر حسب وعدہ پنوں کے یہاں گئی - آدھی رات تک باہم لطف صحبت رہا - آخر نیند کا غلبہ ہوا اور دونوں بغل گیر ہوکر سو رہے - اتفاق سے پنوں کے بعض دوستوں کو خبر ہوگئی وہ رسوائی کے خوف سے پنوں کو سوتے میں اُٹھا لے گئے - جب سسی کی آنکھ کھلی اور اُس نے پنوں کو نہ پایا تو وحشت کے جوش میں اُس کو تلاش کرتی ہوئی جنگل کو نکل گئی - اِدھر سسی کے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں کو خبر ہوئی - وہ اُس کی تلاش میں نکلے اور سسی کو سمجھا بجھا کر اپنے گھر لے گئے - مگر گھر میں اُس کا جی نہ لگتا تھا - جب موقع ملتا تھا محبوب کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی تھی - اور راہ گیروں سے

پنو کا پتا پوچھتی تھی - جب کسی طرح اُس کا جنوں کم نہ ہوا تو سب نے مشورہ کر کے ایک تدبیر نکالی - سسی سے کہا کہ ہم حالات دریافت کرنے کے لئے پنو کے پاس ایک قاصد بھیجتے ہیں - اِس کے بعد اُس کو بلا کر تیرا عقد اُس کے ساتھہ کر دیں گے - اب تجھکو در بدر آوارہ پھرنا مناسب نہیں - کہیں ایسا نہ ہو کہ پنو اِس بات کو ناپسند کرے - اور تجھہ سے عقد کرنا منظور نہ کرے - سسی کو اس بات سے کچھہ تسکین ہوئی - اور وہ خانہ نشین ہو کر پنو کی آمد کا انتظار کرنے لگی - چند روز کے بعد قاصد واپس آئے اور کہا کہ اب ہم کو پنو کے مسکن کا پتا معلوم ہو گیا ہے - ہم عنقریب اس کے پاس جائیں گے اور اُس کو تجھہ سے لا ملائیں گے - اِس وعدے پر اس نے کچھہ دن اور صبر کیا - آخر وحشت نے پھر زور کیا اور اُس نے پھر جنگل کی راہ لی - ماں باپ بھی اُس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس تک پہنچ گئے - اُس کو تسلی دینے کی بہت کوشش کی لیکن اِس سے اُس کی وحشت اور بڑھتی گئی - ناگاہ ایک اجنبی شخص نے آکر خبر دی کہ پنو ملک سندہ میں مقیم ہے - یہ خبر سنتے ہی سسی نے سندہ کا رخ کیا - ماں باپ نے چند آدمی اُس کے ساتھہ کر دئے - اور خود روتے پیٹتے واپس آئے - سسی نے سندہ پہنچکر اپنی انگوٹھی پنو کے پاس بھیجی - اتفاق کہ اُس دن پنو کا عقد ہونے والا تھا - سسی کو جو یہ خبر پہنچی تو اُس نے ایک آہ سرد کھینچی اور ٹھنڈی ہو گئی ادھر سسی کی انگوٹھی پاتے ہی پنو اُس سے ملنے کے لئے چلا - مگر جب اُس کے پاس پہنچا تو اس کو مردہ پایا - وہ اِس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور اور روتا تڑپتا دنیا سے رخصت ہو گیا -

پنو کی منگیتر کو جب اِس حادثے کی خبر ہوئی تو اُس نے بھی ایک آہ کی اور چل بسی - شادی کا گھر ماتم سرا بن گیا - اور شہر میں محشر برپا ہو گیا -

اِس مثنوی میں کل ۵۹۱ بیتیں ہیں - بعض مقاموں سے چند اقتباس ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں - جن سے اندازہ ہوسکے گا کہ یہ مثنوی کس درجے کی ہے

محبت کا بیان

محبت بوے گل گل ہے محبت — محبت جز ہے اور کل ہے محبت
محبت باطن و ظاہر محبت — محبت اول و آخر محبت
محبت سے ہے بھڑکی گلخن دل — محبت سے ہے برق خرمن دل
محبت ہی سے نکلے آہ جانسوز — محبت دل کو دے داغ دل افروز

سسی کا سراپا

سراپا کیا لکھوں اُس شمع رو کا — کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں موے سر تھے عنبر آلود — کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود
ہر اک مو اِس طرح کا دام خوبی — بلا گرداں ہو جس پر شام خوبی
یہ کافر تھی درخشاں ان میں وہ مانگ — دل مجنوں کو جو لیلیٰ سے لے مانگ
تروپتا چاند تارے کا زری پات — جو اوڑھے تھی کر اپنی پٹیاں صاف
سماں ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر — شب دیجور میں چمکیں اختر
گوندھی چوٹی نظر اِس شکل آوے — کہ جیوں مارسیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اُس میں مسکن — اچھلتا ہے کہ اک سانپ اور کئی من
پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں یکسر — رگ ابرسیہ جیسے ہو مہ پر
وہ کیفی انکھڑیاں تھیں صورت جام — و لیکن اُن سے کیا ہے نسبت جام
ہے ان بن آئے جام اک چشم بے نور — غضب وہ انکھڑیاں ہیں چشم بد دور
نگاہ کافر وہ جس سے آکے لڑ جائے — تو گویا اس پہ اک بجلی سی پڑ جاے
کرے مژگاں جھپک کر کچھ جو تقریر — دلوں کے پار ہووے دستۂ تیر
رخ اس کا گرچہ شعلہ حسن کا تھا — نظر کو خور کی ہو جس سے پیدا

اردو کے ان پڑھ شاعر

از

جناب مرزا فدا علی صاحب 'خنجر' لکھنوی

— * * * —

ریاضت

اسلام علی نام ریاضت تخلص ولد عبداللہ لکھنؤ کا باشندہ اور ان پڑھ شاعر اور سید آغا حسن امانت کا غلام و خانہ زاد تھا - امانت مرحوم اپنے عہد کے نہایت مشہور شاعر اور اساتذۂ فن میں داخل ہیں - اُن کی شہرت کسی بیان کی محتاج نہیں - ریاضت نے نامور و کہنہ مشق شاعر (امانت) کے گھر میں پرورش پائی - بچپن سے شعر و شاعری کے چرچے سنتے سنتے طبیعت میں موزونی پیدا ہوگئی اور ذہن میں کچھ کچھ مضمون پیدا ہونے لگے جو کبھی کبھی نظم کی صورت میں منتقل ہوا کرتے - اول اول تو 'ریاضت' کو اشعار سنانے میں جھجک سی رہی پھر رفتہ رفتہ گھٹنے لگی اور ایک روز جرأت کرکے امانت مرحوم کی خدمت میں اصلاح کلام کی خواہش پیش کی - امانت مرحوم نے مسکراکر کلام سنانے کا حکم دیا۔ ریاضت' نے ڈرتے ہوے نو تصنیف غزل کے اشعار پڑھے - انھوں نے طبیعت کا اندازہ کرتے ہوے ہمت افزائی کی اور شعروں کو اصلاح سے مزین کردیا - چونکہ اسلام علی محنتی آدمی تھا شاید اسی رعایت سے ریاضت تخلص تجویز ہوا - اس روز سے ریاضت کی

مشق سخن باقاعدہ جاری ہوگئی - امانت مرحوم کی ملاقات کو جو شعرا تشریف لاتے - وہ ریاضت کا کلام بھی ضرور سنتے اور اُس کی ریاضت کی داد دیتے - تذکرۂ سراپاے سخن میں ایک غزل مرقوم ہے جو اس جگہ نقل ہوتی ہے —

آئے نظر نہ اُس صنم مہ لقا کے ہاتھ کب کی دعا نہ جانب قبلہ اُٹھا کے ہاتھ
حسرت سے پس کے ہوگیا دل میرا پائمال اُس شوخ نے دکھاے جو مہندی لگا کے ہاتھ
محفل میں خوں رقیب کا حسرت سے گھٹ گیا میں نے اسے گلے جو لگایا بڑھا کے ہاتھ
دیکھی جو نبض عشق کا بیمار بچ گیا اے غیرت مسیح ترے ہیں شفا کے ہاتھ
دو چار قتل ہوئیں گے اک آن میں دلا تلوار وہ جو میاں سے لے گا بڑھا کے ہاتھ
پابند صبر رہ' نہ ریاضت ہو نا اُمید
عقدہ ہے دل کا ناخن مشکل کشا کے ہاتھ

زر

شیخ بلاقی نام 'زر' تخلص باشندۂ لاہور سنہ ۱۸۱۴ع میں شیخ سعداللہ کے یہاں پیدا ہوے - شیخ سعداللہ اصل میں لاہور کے رہنے والے تھے لیکن بسلسلہ معاش آگرے میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور سادہ کاری کا کام کرکے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا رزق حاصل کرتے تھے - جس طرح اُنھوں نے اپنے والد سے خاندانی کام حاصل کیا تھا اُسی طرح اپنے نور نظر کو بھی آٹھ نو برس کی عمر سے سادہ کاری کے کام پر لگا دیا تیمناً یا رسماً معمولی طریقہ سے کلام اللہ شریف پڑھادیا اور پوری توجہ آبائی پیشہ (سادہ کاری) کی جانب رہی - نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ بلاقی کو زر گری میں تو خاصی مہارت ہوگئی مگر لکھنا پڑھنا نہ آیا - علمی استعداد اتنی ضرور تھی کہ اپنے نام کے دستخط کرلیں یا ہندسہ لکھ پڑھ سکیں —

اُن دنوں اُردو شاعری کا رواج ترقی پذیر ہورہا تھا کسی طبقے کا کوئی فرد شاذ و نادر ہی اس شوق سے خالی ہو لہذا ہوائے شاعری نے شیخ بلاقی کے دماغ میں بھی بار پایا اور نظم کا شون چرا یااشعار تضیف کئےاورخوب تصنیف کئے بقول آتش:-

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھي کام ہے آتش مرصع ساز کا

بندش الفاظ چست' مضمون شگفتہ اور تخیل پاکیزہ ہوتی - آگرہ میں اُن دنوں حاتم علي مہر کا قیام تھا - شاگردوں کی بہتات' عوام میں شہرت اور خواص میں اُن کی شاعری ممتاز تصور کی جاتی تھی - شیخ بلاقی بھی اُن کی خدمت میں حاضرہوئے- اصلاح کی خواہش کی ' کلام سنایا اور شاگرد ہوے - 'مہر' مرحوم کی اصلاح نے ان کے کلام میں اور جگمگاهت پیدا کردی -مقامی مشاعروں میں اُستاد کے ساتھہ شریک ہو کر داد خوش کلامی دیتےتھے - اب اُن کی گل افشانی ملاحظہ ہو :-

دل میں، جگر میں' سینے میں' یکساں ہے درد آج
اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

کبک و طوطی میں کچھہ کمال نہیں　　ان میں تیری سی بول چال نہیں

سنگ دل بے رحم بھی اتنا نہ ہو　　کوئی مرجاے تجھے پروا نہ ہو

پھنسی ہے موبہو جان حزیں زلفوں کے پھندے میں
اسیران خم کاکل گرفتار بلا ٹھیرے

کونسی صورت ہے ملنے کی بتوں سے یہ بتا
وہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

سردار

سردار بیگم نام ' سردار تخلص ' لکھنو کی رہنے والی تھیں اور ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں - غدر سنہ ۱۸۵۷ ع کے بعد بیوہ ہوکر پہلے کانپور پھر قنوج چلی گئیں - چند روز کے بعد طبیعت اُچاٹ ہوئی اور قنوج کی سکونت ترک کرکے اِٹاوہ آئیں اور وہیں ساری عمر بسر کردی اگرچہ شریف تھیں لیکن نہ معلوم کیا اُفتاد پڑی کہ اپنی بیٹی کاظمی بیگم کو ناچ گانے کی تعلیم دینا شروع کی اور باقاعدہ طوائف بن کر تمام وہ باتیں اختیار کرلیں جو بازاری عورتیں کرسکتی ہیں - عجیب بات یہ ہے کہ خود بالکل نا خواندہ تھیں مگر موزونیء طبع کی بدولت شعر کہتی تھیں - چونکہ خود لکھہ نہ سکتی تھیں اس لئے اپنے تصنیف کئے ہوئے اشعار دوسروں سے لکھوا لیتی تھیں - ایک مرتبہ کسی شخص کے ساتھہ دھلی گئی تھیں مصنف تذکرہ چمن انداز لکھتے ہیں —

„ یہ ایک نہایت ہی بات کی پکی اور سچی عورت تھی اور جو کچھہ "
„ زبان سے کہہ دیتی تھی اُس کو ہمیشہ پورا کرنے کی کوشش کرتی تھی "
„ کچھہ نہ کچھہ اس آوارگی میں بھی شرافت کی بو اُس میں موجود تھی "

یہ اشعار اُس کے طبع زاد ہیں —

لگایا میں نے جو تم سے دل کو ' تمہارے دل سے نہاں نہ ہوگا
اُٹھائے صدمے ہیں جتنے میں نے - جہاں میں کس پر عیاں نہ ہوگا
ہے خوف مجھکو اکیلے گھر کا - کہ ہوگا واں پر گزار کیوں کر
مدد کو میری جو لطف یزداں ندیم و ہمدم وہاں نہ ہوگا

ولے بھر کے تھا دونا گر کرو غور　　جھپک سے داسی مژگاں کے فی الفور
وہ دنداں آبدار اُس سیم بر کے　　کہ سوراخ اُن سے ہو دل میں گہر کے
یہ سادہ پر نزاکت تھی نمودار　　رگ گل کی بھی نسبت جس پہ ہو بار
نہ سمجھ دہم اس کی موسائی سے تحریر　　وہ گویا حسن کی تھی ایک تصویر
سبھی حیرت سے اُس کے محو دیدار　　وہ اک یوسف تھی اور لاکھوں خریدار
یہ گرمی اُس کے تھی ہر اک سخن میں　　کہ آتش سی لگاوے جان و تن میں
شرف رکھتی تھی یہ اپنے محل میں　　کہ جوں خورشید ہو برج حمل میں

باغ کی تعریف

کرے سورج مکھی کو واں کی جو دید　　تو ذرہ خوش نہ آوے روے خورشید
فزوں تھا اختروں سے جوش گل واں　　کھلے تھے اِس قدر گلہاے بستاں
بصد خوبی بہار اُس جا عیاں تھی　　زمیں باغ رشک آسماں تھی
ہر اک تھا غنچہ گل جوں گلابی　　شجر جھومیں تھے سب مثل شرابی
بھرا نہروں میں تھا ایسا ہی پانی　　کہ گویا تھا وہ آب زندگانی
کسی جانب کو پھولوں کی مہک تھی　　کسی جانب کو سبزے کی لہک تھی
منقش تھے سبھی در اور دیوار　　در و دیوار سے پھولا تھا گلزار

پنو کی جدائی میں سسی کی حالت

ہوا خوں جگر آنکھوں سے جاری　　لگا دل بر میں کرنے بیقراری
یہ سینے میں پھڑ کتا تھا دل زار　　قفس میں جوں ہو مرغ نو گرفتار
ہوا یہ یک بیک حال تن زار　　کہ ہو جیسے کوئی مدت کا بیمار
یہ غم نے شکل کر دکھلائی اُس کی　　ملائی خاک میں رعنائی اُس کی
لگا دل کرنے بیتابی سے سازش　　ہوئی آنکھوں کو بیخوابی سے سازش

کیا تھا اُس سے طاقت نے کنارا
گریباں صبر کا تھا پارا پارا

جدھر تھا دھیان اس کا اس طرف تھا
کوئی آوے کوئی جاوے اُسے کیا

کبھی رو رو کے آھیں سرد بھرنا
کبھی کچھہ ذکر دل ھی دل میں کرنا

فلک پر دیکھہ کر تارے چمکتے
جگر پر اُس کے انگارے دھکتے

گزرتی تھی جو بیتابی سے ھر شب
تو گھبرا کہ وہ کہتی تھی کہ یارب

نپٹ جینے سے دل اندوھگین ھے
مری قسمت میں کیا مرنا نہیں ھے

یہ آتش عشق کی بھڑکی تھی تن میں
کہ پیدا تھی یہ سوزش ھر سخن میں

کسی سے سوز دل کہتی تھی جب وہ
تو جل کر خاک ھو جاتا تھا سب وہ

رھے تھی گھر میں اپنے یوں وہ بیتاب
کسی گلخن میں جیوں شعلہ ھو بیتاب

کبھی سر پیٹ لینا گاہ رونا
کبھی بیزار آپ اپنے سے ھونا

کبھی حیران ھو اک سمت تکنا
کبھی بیٹھے کچھہ اپنے آپ بکنا

پری کو اک دوانہ سا بنایا
محبت نے عجب عالم دکھایا

مصنف نے سسی کی زبانی دو غزلیں بھی لکھی ھیں - ایک اُس موقع پر جب وہ پہلی مرتبہ پنو کو ڈھونڈھنے نکلی ھے اور دوسری اس وقت جب اس نے دو بارہ اپنے گھر سے نکل کر جنگل کی راہ لی ھے - وہ دونوں غزلیں ذیل میں نقل کی جاتی ھیں —

بس اپنا کچھہ نہیں اب آہ چلتا
کہ دل کو لے گیا اک راہ چلتا

سمجھتا تو بھی تھی اک راہ کی بات
کہ مجھہ کو بھی لئے ھمراہ چلتا

چھلاوے کی طرح سے دل کو چھل کر
رھا یک بار وہ دل خواہ چلتا

نہ جاتی جان گر چلنے سے اپنے
مجھے بھی کر کے وہ آگاہ چلتا

گیا یوں بر سے وہ دلبر یکایک
رھے جوں تن سے جی ناگاہ چلتا

رکھا اب ناتوانی نے مجھے تھور　　نہیں زور اس پہ کچھہ واللہ چلتا

کہیں اپنا ترے بن کس سے هم درد　　نہ کوئی هم نشیں ھے یہاں نہ هم درد
دکھاوے تو جو تک وہ آهوے چشم　　ابھی دل سے مرے کر جائے رم درد
جو لکھہ بھیجے تو کچھہ آنے کی اپنے　　ابھی مت جاے دل سے یک قلم درد
گئے تاب و تواں و صبر دے کر　　دل و جان و جگر کو غم الم درد
نہیں اب آہ دم لینے کا مقدور　　اُٹھے ھے دل میں ایسا دم بدم درد
کوئی هم درد بھی اپنا نہیں یہاں　　جو کہتے بیٹھہ کر هم وہ بہم درد
نہیں درد اور کچھہ جس کی دوا هو　　ترا هی دل میں ھے تیری قسم درد
نہ جب تک تو دکھادیوے گا صورت　　کسی صورت نہیں هووے گا کم درد

نہ تو آیا تو میں جاؤں گی شاید
لئے هستی سے تیرا تا عدم درد

میرے کتب خانے میں غلام مہدی لکھنوی کا تالیف کیا هوا ایک بہت ضخیم انتخاب غزلیات ھے جس کا نام 'مجموعۂ سخن' ھے - نسخہ خود مولف کے هاتھہ کا لکھا هوا ھے اور کتابت اس کی یکم صفر سنہ ۱۲۴۷ ھ کو ختم هوئی ھے - اس کے ورق '۲۸۲ ب' پر مندرجۂ بالا غزلوں میں سے پہلی اور ورق '۳۰۴ ا' پر دوسری درج ھے - پہلی غزل میں مقطع نہیں ھے لیکن یہ غزل حسن اور جرات کی غزلوں کے درمیان میں واقع ھے - قرینہ کہتا ھے کہ یہ انہیں دونوں میں سے کسی کی کہی هوئی هوگی اور قیاس کا فیصلہ ھے کہ یہ جرات *

---

* جراُت نواب محبت خاں کے دولت سے وابستہ بھی رھے تھے خود کہتے ھیں-

بس کہ گلچیں تھے سدا عشق کے هم بستاں کے
هوے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے　　　　'ادیب'

کا رنگ ہے، اور وہی اس کے مصنف ہیں - دوسری غزل کے آخری شعر کے پہلے مصرع کا آخری لفظ مطبوعہ مثنوی میں شاید، اور قلمی مجموعے میں شاهد ہے اور کاتب نے اس کو تخلص قرار دے کر سرخی سے لکھا ہے یعنی اس غزل کے مصنف کوئی شاہد ہیں بر حال یہ دونوں غزلیں غالباً، مثنوی اسرار محبت، کے مصنف کی نہیں ہیں —

لگایا گُل سے جو دل کو تو نے ' سمجھ لے دل میں یہ اپنے بلبل
ہیں چند روزہ بہار کے دن ' یہ گُل تو روز خزاں نہ ہوگا
بہت کتابیں پڑھ ہیں ہیں تم نے ' یہ سا نا ہم نے بھی شیخ صاحب
چھپا ؤ ہم سے نہ حال دل کو ' نہاں یہ عشق بتاں نہ ہوگا
یہ کہا ہے "سردار" تجھ کو وحشت ' شفیع ہوں گے رسول داور
جو زلزلے سے بروز محشر زمیں نہ ہوگی زماں نہ ہوگا

وہ تو ہمارا لے گئے بیٹھے بٹھائے دل ۔ ہرگز نہ کرتی آپ سے اپنا پھنسائے دل
آتی نہیں ہے نیند شب ہجر میں مجھے ۔ ہے کوئی ایسا؟ اُس سے میرا پھیر لائے دل
فریاد کررہا ہوں میں گھڑیال کی طرح ۔ یارب وہ خود جلے جو ہمارا جلائے دل
بے جرم مجھ کو یار نے مارا ہے دوستو ۔ اب دل ہی دل میں کہتا ہوں فریاد ہائے دل
"سردار" روز حشر کو اُٹھ کر کہے گی یہ ۔ عاشق کہاں سے سنگ کا اپنا بنائے دل

دل میرا اُٹھ گیا زمانے سے ۔ موت آئے کسی بہانے سے

نہ لگی پھر آنکھ سحر تلک مجھے یاد اپنی دلا گئے
میرے پاس سے وہ چلے گئے میرے دل کو لے کے ملا گئے

بیاں میں کیا کروں تم سے نہایت بیقراری ہے
پھنسا ہے دل میرا اُس سے مجھے اب زیست بھاری ہے
کڑی منزل بہت ہے یہ مجھے اب زیست بھاری ہے
وہاں کیوں کر گزر ہوگا یہاں اب اشک باری ہے

اندھیری گور ہوے گی نہ کوئی دوسرا ہو گا
ملے گا وہ صنم کیوں کر مجھے اب انتظاری ہے
فرشتے آکے پوچھیں گے ' کہو " سردار " سوتی ہو
پڑھو کلمہ محمد کا چلو اب فضل باری ہے

سکندر

خلیفہ محمد علی عرف گھیسا - سکندر تخلص پنجاب کے باشندے اور ناجی کے شاگرد تھے - جب دہلی اہل کمال سے خالی ہونا شروع ہوی تو یہ بھی اس عہد کے خوش فکر شعرا کی طرح اودھ چلے آئے اور صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ سلیمان بن شاہ عالم آفتاب کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے جہاں آسائش وقت کا جھگڑا تھا اور فراغبالی سے دن بسر کرنے لگے -

جب سنہ ۱۲۹۲ ھ میں میر غلام حسن حسن صاحب " بےنظیر و بدرمنیر " نے اپنا تذکرہ ترتیب دینے کا آغاز کیا اُس وقت میاں سکندر زندہ و سلامت موجود تھے اور میر ضاحک ' مرزا رفیع السودا ' شیخ مصحفی ' فاخر مکین وغیر ہم کے معرکوں میں شریک ہوتے تھے - بڑے آزاد منش اور رند مشرب تھے - مے نوشی کے شائق اور اکثر بدمست ولایعقل رہا کرتے - اِس عادت نے اُنھیں شرفاء کی نگاہوں میں سبک کر رکھا تھا مگر اُنھوں نے کبھی پروا نہ کی - اُن کی حریت پسند طبیعت نے اُنھیں سوسائٹی کی رسوم وقیود سے مطلقاً آزاد کر دیا تھا - اُنھوں نے ساری عمر رندی اور شاہد پرستی میں بسر کردی -

مرثیہ گو شاعر تھے - ریختہ کے علاوہ پنجابی ' پوربی ' مارواڑی زبانوں پر بھی پوری پوری قدرت حاصل تھی اور نہایت شستگی سے مراثی منظوم کرکے ہر سہ زبانوں

کے شائقین کی تشنگئی ذوق فرو کرتے - اِن کے ایک زندۂ جاوید مرثیے نے جو شہرت و قبولیت حاصل کی وہ کسی مرثیہ گو شاعر کی تصنیف کو حاصل نہ ہوی - ہرچند اُس مرثیے کو تصنیف ہوئے مدت گذری زمانہ بہت کچھ آگے بڑھ آیا ' حسن ادا اور طرزبیاں میں بین فرق ہوگیا ' میر انیس اور مرزا دبیر نے میدان مرثیہ گوئی حد درجہ وسیع کردیا ' لیکن اب تک کوی شہر کوی قریہ ایسا نہیں جہاں عزاداری ہوتی ہو اور میاں سکندر کا یہ مشہور و معروف مرثیہ - ع

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول

نہ پڑھا جاتا ہو —

یہ اگر چہ علم کی طرف سے بے نصیب تھے مگر بلا کا ذہن پایا تھا - قصہ خوانی ولطیفہ گوی میں یدطولی حاصل تھا امیروں کی محفلیں ' امرا کی صحبتیں اِن کی بذلہ سنجیوں سے گونجا کرتیں - اگر چہ اِن کی رندانہ زندگی اِن کے وقار کی دشمن تھی پھر بھی بعض اوصاف اچھی سو سائٹی میں بارباب کر دیتے - عرق کشی کی مہارت بدرجہ غایت تھی اور اس فن میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے -

دو منظوم قصے " ملاح و ماھی " اور " بادشاہ دل خوار " بھی تصنیف کئے تھے - جن پر قبولیت کے پھول نچھاور ہوئے - کتب خانہ فصاحت نے اپنی الماریوں کی زینت بڑھائی اور خاص و عام کی دل بستگی ہوئی - ' میرحسن ' نے دونوں قصوں کی تعریف میں گل فشانی کی ہے - مگر اب ان قصوں کو افسانوں سے زیادہ وقعت حاصل نہیں - استداد زمانہ نے ان کے اوراق منتشر کردئے اور حادثات سموم نے کچھ ایسا غائب کیا کہ ہم تک بجز نام کے ان کی ایک بیت بھی نہ پہنچ سکی —

انھیں غزل گوئی کا شوق بہت کم تھا - مرثیوں کو نجات آخرت کا ذریعہ تصور کرتے اور ان کی تصنیف میں قوت شاعری صرف کرتے تھے - کبھی کبھی

احباب کے اصرار اور تقاضے سے عاشقانہ کلام کی طرف متوجہ ہو جاتے - خدا ساز طبیعت اپنے جوہر دکھاتی اور یہ چمنستان سخن میں لطیف و رنگین گل کھلاتے - 'میر حسن' سانقاد فن ان کے کمال شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہے —

" اگرچہ علم ندارد و لیکن بهر کلام او جائے انگشت نیست "

پرانے شاعروں کی طرح ابہام گوی اور بعض صنعتوں کے نہایت شائق تھے اور انہوں اپنے کلام میں بڑے حسن سے صرف کرتے تھے جیسا کہ 'میر حسن' کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے —

"گاہ گاہ بطرز قدیم شعر می گوید طبعش مایل ایہام بسیار است"

ان کی تصانیف سے جو اشعار دستیاب ہوئے وہ یہ ہیں —

کیا کماں ابرو نے اک تیر نظارا مارا جس کے لگتے ہی جگر ہوگیا پارا پارا *

کیا تجھ اور نہ تھا ہستی کے جنگل میں شکار مرغ دل تو نے جو صیاد ہمارا مارا

رات تنہائی میں آیا تھا تصور تیرا ذکر تیرا ہی کیا، آہ کا نعرا مارا

ہم نے پوچھی کی آوی ٹلی اس کو طرف لالے کی اس نے شوخی سے ہوا میں پھول ہزارا مارا

غیر کیا چیز ہے محفل سے اُٹھا دوں پل میں کیا کہوں، کہہ نہیں سکتا ہوں تمہارا مارا

عشق بازی کے لئے ہم نے بچھائی چوسر پانسہ کر تے ہی کیا رنگ ہمارا مارا

ہیچ دنیا کے لئے کچھ نہ سکندر نے کہا
آپ کے روز جیا، کس لئے دارا مارا

---

* مطلع کے دوسرے مصرع کی ردیف غلط ہے مگر یہ مصرع جہاں جہاں دیکھا گیا اسی طرح نظر آیا -

نہ دیکھا ہو جو کسی نے احباب میں دریا   وہ دیکھ لے میری چشم پر آب میں دریا

جو دھو کر داغ دل سب پاک کیجیے   تو جاری دیدۂ نم نا ک کیجیے

جلا جو آتش غم سے سرا پا   علاج اس کا پھر اب کیا خاک کیجیے

سحر گزرا چمن سے کونسا خور شید رو یا رب

نہ شبنم گل کے منہہ میں اب تلک پانی چراتی ہے

سلیم

ان کا نام سلیم اللہ ہے نواح ڈھاکہ میں پیدا ہوئے اور کلکتے میں زندگی بسر کی - لکھنے پڑھنے کا بالکل شوق نہ تھا - مگر نہایت ذہین و طباع تھے - لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی میں کمال حاصل تھا - احباب کی پر کیف صحبتیں اُن کے با مذاق چٹکلوں سے زعفران زار بنی رہتیں - جس بزم میں جا بیٹھتے وہاں کے لوگ ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے اور مزہ یہ کہ ان کے لبوں پر ہنسی تو ہنسی تبسم تک کا نام نہ ہوتا —

شاعری کا شوق بھی خاصہ تھا - شعر کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے - عجب تو یہ ہے کہ آن پڑہ اور ڈھاکہ کے رہنے والے جہاں اردو زبان وہ زبان نہیں جو دہلی و لکھنؤ میں بولی جاتی ہے - مگر ان کے دستیاب شدہ اشعار نہایت صاف اور سلیس ہیں - ان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ کسی زباں داں کی زباں سے نکلے ہوئے ہیں رنگ سخن اہل لکھنؤ سے ملتا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم کی اصلاح سخن کسی لکھنوی شاعر سے متعلق ہو گی —

سلیم کسی چیز کی دلالی کرتے اور اِسی پیشہ کی بدولت هندوستان کے مشہور ممالک اور تجارت کی بڑی بڑی منڈیوں کی سیر کر چکے تھے - رنگون کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رهتا اور کم سے کم سال میں ایک پھیرا ضرور هوجاتا - اِن سفروں نے اُن میں عزائم کی پختگی اور جفاکشی کی عادت پیدا کردی تھی - کام سے کبھی عاری نہ هوتے بعض اوقات صبح سے شام تک کام میں مصروف رهتے - چونکہ یار باش آدمی تھے فرائض سے سبک دوش هوتے هی دوستوں میں جابیٹھتے اور اُن کے ساتھ دُنیوی اشغال میں مصروف رهتے .یہاں تک کہ ساری رات یو نہیں بسر هو جاتی - صبح سے پھر حسب معمول کار و بار میں جا لگتے - اور کبھی چہرے سے شکستگی یا تھکن ظاهر نہ هوتی - موسیقی کا بہت شوق تھا - مشہور گانے والوں سے ضرور ربط وضبط پیدا کرتے تھے کی صحبتوں میں خود بھی گاتے - هارمونیم خوب بجاتے تھے - بیس پچیس برس هوے انتقال کیا - نمونہ کلام یہ هے —

پڑھ نہیں سکتےسر نوشت اپنی ستیا ناس هو جہالت کا
جی بچیں گے جواُن کے آزادی نام لیں گے نہ پھر محبت کا
آسماں * مدعی زمین دشمن کچھ ٹھکانا هے اس مصیبت کا
چشم اُمید کیا رکھے کوئی رنگ دیکھا هے تیری صحبت کا
پھر گریباں هے اور سلیم کا هاتھ
جوش پھر بڑھ چلا هے وحشت کا

شفق

دولت رام نام 'شفق' تخلص قوم کا مالی اور دهلی میں گل فروشی کی دوکان کرتا تھا - سخن سنجان دهلی کے فیضان سخن نے شاعر بنا دیا - کھلے

* اس شعر کا مضمون کسی قدر تغیر الفاظ کے ساتھ میر کے شعرسے لڑ تا هے چونکہ سلیم پڑھے لکھے نہ تھے اس لئے تو ارد کہنا غلط نہ هوگا - پہلا مصرع مومن سے لڑ گیا هے -

ہوئے پھول کی طرح طبیعت شگفتہ پائی تھی اس کے اشعار میں بعض جگہہ فارسی کی ترکیبیں پائی جاتی ہیں جس سے کلام پر پڑھے لکھے کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے - لیکن یہ درست نہیں ' شوق ' کو علم سے بالکل بہرہ نہ تھا - از بسکہ شاہان مغلیہ کا آخری دور تھا - دفاتر کی زبان فارسی ' بول چال میں بھی ترکی و فارسی بیش بیش تھی - اس لئے عوام کی زبانوں پر فارسی ' ترکی الفاظ کثرت سے چڑھ گئے تھے اور بھاشا نے ان زبانوں کا بہت کافی اثر قبول کرلیا تھا - جیسا کہ اس وقت کے دوھوں سے ثابت ہے - اکثر بھاٹ اپنے دوھوں اور کبتوں میں بے تکلفی سے ترکی اور فارسی الفاظ صرف کرتے تھے - پھر ' شفق ' کے کلام میں اس رنگ کا غالب ہونا چنداں تعجب خیز نہیں —

' شفق ' کی طبیعت پھولوں کے مانند نزاکت پسند واقع ہوئی تھی جو بعض تذکرہ نویسوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے - کہتے ہیں شاعری کے شوق نے اس کی دوکان کو خوب چمکایا - جس نے ایک دفعہ گلہائے مضامین کی خوشبو سونگی ہمیشہ کے لئے گاھک بن گیا - بسا اوقات دوکان پر مشتاقان سخن کا جماؤ رہا کرتا خریدار پھولوں کے ھار اور گجرے خریدنے سے پہلے فرق سماعت کو طرہ سخن سے مزین کرلیتے - شفق پر اشعار پڑھتے وقت خاص کیفیت طاری ہوتی - اچھا شعر پڑھنے یا سننے کے بعد دیر تک کیف سخن کا لطف لیا کرتا - اس کی طراوش طبع کا حاصل یہ ہے —

پس از مردن بھی گردش ہے زبس میرے مقدر میں
بگولے کی طرح رہتی ہے میری خاک چکر میں
الٰہی کیا کرے ' دیوانۂ الفت کہاں جائے
قرار آتا ہے صحرا میں نہ جی لگتا ہے اب گھر میں

خدا کے سامنے آنے تو دو مغرور قاتل کو
قیامت ہم بھی اک برپا کریں گے آج محشر میں
فراق یار میں کیا لطف ساقی بادہ نوشی کا
بجائے مے ذرا سا زہر بھر دے میرے ساغر میں
دل مرحوم کا مدفن زیارت گاہ بن جائے
'شفق' چھوٹی سی اک تربت بنادو کوئے دلبر میں

ID

LUC NOW

دائرہ حضرت شاہ اجمل قدس سرہ
اور
شیخ امام بخش ناسخ مرحوم

از

جناب مولانا حضرت سید نذیر احمد صاحب

(یہ مشہور واقعہ ہے کہ شیخ ناسخ نے ایک مدت تک دائرہ حضرت شاہ اجمل علیہ الرحمہ الہ آباد قیام فرمایا تھا - میری درخواست پر حضرت مولانا سید نذیر احمد صاحب نے جو ان بزرگوں کی یادگار اور اُن صفات سے متصف ہیں یہ حالات قلمبند فرما کر مجھے عنایت فرمائے - شیخ ناسخ کے قیام دائرہ کے حالات کے ضمن میں دائرہ کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کردئے گئے ہیں - یہ علم و فضل اور معرفت کا حقیقی دائرہ تھا اس کے حالات ضرور شوق سے پڑھے جائیں گے - مولانا نے ایک لفافہ بھی جو شیخ صاحب مرحوم کے ہاتھہ کا لکھا ہوا ہے عنایت فرمایا افسوس کہ اس لفافے کا خط دستیاب نہ ہوا - اس کا بلاک درج مضمون ہے یہ لفافہ ڈاک میں آیا تھا - اس لفافہ سے اس زمانے کی تحریر اور ڈاک کی کیفیت معلوم ہو گی جو لطف سے خالی نہیں - میں مولانا سید نذیر احمد صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے ازراہ شفقت بزرگانہ یہ تمام حالات بلا تکلف مجھے لکھہ کر بھیج دئے جن سے ناظرین اردو بھی میری طرح استفادہ کریں گے - اڈیٹر اُردو)

(۱) حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد افضل علیہ الرحمہ
المتوفی سنہ ۱۱۲۴ ھ

یہ مضمون حضرت ناسخ کے سوانح حیات کے اس زمانے سے تعلق رکھتا ھے جب کہ وہ دائرہ جدنا ' حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ میں تشریف لائے تھے اور تقریباً مسلسل بارہ برس تک قیام پذیر رھے خود فرماتے ھیں :-

پھر پھر کے " دائرہ " ھی میں رکھتا ھوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پانوں میں

سنہ ولادت ' مولد ' تعلیم ' تلمذ فن شاعری کی بحث سے اس کو اس وجہ سے تعلق نہوگا کہ کم و بیش اس بحث کو " آزاد " نے " آب حیات " میں رطب و یابس روایات سے بیان کر دیا ھے اور اکثر سلسلہ روایت مولوی عظیم اللہ " رفعی " سید پوری مرحوم پر ملتہی ھوتا ھے ' قبل اس کے کہ میں ناسخ کے قیام کے واقعات بیان کروں مناسب معلوم ھوتا ھے کہ مختصراً دائرہ حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ کے یہی حالات قلم بند کروں جو علم و فضل و عرفان و ثروت میں بیت الشرف و المجد نہ صرف ھندوستان میں بلکہ عرب و عجم میں مشہور تھا ' ملاحظہ ھو تصدیقات علامہ جبرتی مصری مورخ مورث اعلی اس کے حضرت قطب الاقطاب صاحب عرفان حق آگاہ جدی حضرت شیخ محمد افضل قدس سرہ المتوفی سنہ ۱۱۲۴ ھ تھے نسباً آپ سیدنا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد امجاد غیر نبی الخلفا سے تھے ' حضرت شیخ نے اپنا نسب نامہ خود نظماً و نثراً لکھا ھے جو دیگر مکتوبات کے ساتھ الحمد اللہ موجود ھے ' سلسلہ تلمذ مولانا علامہ نور الدین مداری جونپوری رحمتہ اللہ علیہ سے تھا جنکے دست خاص کے خطوط محفوظ ھیں

حضرت دیوان عبدالرشید افسر خانقاہ رشیدیہ جونپور، علامہ ملا محمود جونپوری آپ کے معاصرین میں سے تھے، حضرت استاد الملک ملا افضل جونپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ درس ترک کردیا تھا مگر پھر بھی حضرت شیخ پر بہت توجہ و التفات فرماتے تھے اور بار بار ارشاد فرماتے کہ ملا افضل اگر کسی فن میں کوئی شبہ باقی رہجائے تو اُس کو مجھسے حل کر لیا کرو، مگر اُس کی نوبت نہ آئی، افسوس ہے کہ تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ حضرت شیخ کی جونپور کے قیام کے حالات کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے، بعد فاتحہ فراغ جذبہ الٰہی کی کشش کالپی پہنچا لایا، قبل ورود سید الاقطاب حضرت میر سید محمد کالپوی قدس سرہ نے اپنے خلفاء و مریدین سے ارشاد فرمایا کہ شہباز بلند پرواز کی آمد کا انتظار ہے جس وقت آجائے مجھکو اطلاع کرنا حضرت شیخ کے حالات قبل سے حضرت میر صاحب کے سماعت شریفہ میں آچکے تھے اور وہ یوں کہ حضرت شیخ کا تھوڑے عرصہ تک الہ آباد میں بھی قیام طالب علمانہ علامہ مولانا آصف قاضی الہ آباد کے زیر درس بھی گذرا تھا اور اسی زمانہ میں کوئی سیاح الہ آباد کا وارد کالپی ہوا تھا اور حضرت میر صاحب کے مجلس منیف میں حاضر ہوا اتفاق سے حاکم کالپی بھی موجود تھا حضرت میر صاحب نے استفسار فرمایا کہ آج کل الہ آباد میں کون بڑا ذی علم ہے؟ سیاح نے عرض کیا کہ علامہ آصف کے درس میں ایک طالب العلم ضلع غازی پور کا رہنے والا شیخ محمود افضل ہے اس کی بڑی شہرت ہے اور اس کا شمار بڑے جوزوں میں ہے حضرت میر صاحب مسکرائے اور دعائے خیر فرمائی۔ حاکم کالپی نے عرض کیا کہ حضرت وہ میرا بھانجہ ہے۔ اس پر آپ نے مزید دعا فرمائی تھی۔ حضرت قطب الاقطاب ملا..

سید شاہ جنید فاری پوری رحمۃاللہعلیہ قادری نسباً و نسبتاً کے حضرت شیخ نواسہ تھے اور آپ کو اس پر بڑا فخر تھا - کالپی حاضر ہو کر آپ نے بیعت فرمائی اور عرصہ دراز تک تکمیل باطنی حاصل فرمائی بعد تکمیل بارشاد مرشد آپ کے سپرد الہ‌آباد کے صوبہ کی خدمت ہوئی اور ورودمسعود الہ‌آباد میں ہوا ' مشہور قلعۂ اکبر جو سنگم کے زاویہ پر ہے اُسکے قریب شاہی مسجد جامع میں آپ نے قیام فرمایا - موذن اور امام نے غیر معمولی حالات شیخ کے معائنہ اور مشاہدہ کئے اور صوبہ دار جو قلعہ میں رہتا تھا اُسکو خبر کی وہ حاضر ہوا اور مراسم عقیدت مندی و ارادت بجالایا - رفتہ رفتہ یہ خبر بادشاہ عالمگیر کے گوش حق نیوش تک موصول ہوئی تحفہ تحائف نذرو نیاز پیش ہوئے مگر سب سے انکار ' بے نیازی‌عمل میں آتی رہی ' مدار معاش صرف صبح سے شام تک تصانیف وتالیف کتب و رسائل پر تھا جو شام کے بازارمیں فروخت کر کے ضروریات زندگی کی فراہمی میں قیمت صرف فرماتے - اہل حاجت کاهجوم اور اژدهام هر روز ترقی پرتھا - حضرت‌میرصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نامہ صادر ہوا کہ حق تعالی نے تم‌کو مقبولیت عظیم عطا فرمائی ہے مگر تم کفاف روز ینہ تحریر کتب سے حاصل کرتے ہو تو یاد خدا و ظائف و مشاغل باطنی کا وقت کب ملتا ہے خبردار بلا طلب و حسن طلب جو کچھ پیش آئے قبول کرو کیونکہ " هرچہ ازغیب میرسد نکو است " اور ہدایت خلق اللہ و یادالہی میں ہمہ‌تن مصروف رہو - بادشاہ کے حکم سے جب الہ‌آباد کی جدید آبادی (یعنی موجودہ شہر) آباد ہوئی تو صوبہ دار کوحکم پہنچا کہ حضرت شیخ جو جگہ پسند فرمائیں اُن کے لئے خانقاہ اور مسجد بنوا دی جائے چنانچہ صوبہ‌دار آپ کے همراہ مختلف قطعات آراضی کو دکھلا تا تھا آپ نے دیکھا اور بالاخر ایک جنگل کو پسند فرمایا اور اُسی جگہ پر قیام فرمایا جہاں آپ کا مزار مظہر ہے ' وہاں

کی مٹی اٹھا کر سونگھی اور فرمایا کہ یہیں فقیر کی جائے قیام ھے چنانچہ جنگل کٹوا یا گیا اور خانقاہ اور مسجد تعمیر ہوئی - آپ نے چودھوی پر نہر گاڑ دیا وھی دائرہ کے حدود اربعہ قرار پائے خانقاہ کی تاریخ تعمیر "مقام افضل" ھے اور مسجد کی تاریخ تعمیر "بقعۂ افضل" (دیکھو مفتاح التواریخ بحر ذخار وغیرہ) - آپ نے اپنے چھوٹے بھائی خاک پائے اھل یقین محمد امین کو (جنکی مہر خاص بجنسہ اسی اسم گرامی کے ساتھ ھنوز محفوظ ھے) بلوایا اور مستقل قیام رنوطن الہ آباد میں قرار پایا آپ کی همشیرہ کی شادی پکا کوٹ میں (جہاں کہ یہ سطور لکھ رھا ھوں) قاضی عبدالرفیع صاحب سے ھوئی تھی جن کی مہر فقیر کے پاس ھے (خادم شرع منیع قاضی عبدالرفیع) آپ کے دو صاحبزادیاں تھیں ایک کی شادی اپنے بھتیجے حضرت شیخ قطب الاقطاب یحیی المعروف بشاہ خوب اللہ الہ آبادی المتوفی سنہ ۱۱۴۴ ھ سے ھوئی جو حضرت شاہ محمد امین صاحب کے صاحبزادے تھے - آپ کو حضرت شیخ نے اپنا جانشین اور صاحب سجادہ مقرر فرمایا تعلیم ظاھری و باطنی کی متکفل حضرت شیخ کی نظر کیمیائے اثر ھی تھی —

(دیکھو "سرو آزاد" وغیرہ) حضرت شیخ کا ظہور اس وقت کے جلیل قدر علماء میں تھا حضرت مجدد سرھندی علیہ الرحمہ اور حضرت شیخ عبدالحق دھلوی کو گزرے تھوڑا زمانہ ھوا تھا اب منصب قیادت علمی و باطنی آپ کے سپرد تھی جیسا کہ آپ کے مکتوبات و تصانیف کثیرا عربی وفارسی سے معلوم ھوتا ھے جو مشہور بین العوام و الخواص اور آپ کے زمانہ ھی میں متداول تھیں - آپ کے تصانیف کی تعداد سو سے زائد ھے جو علوم فقہ، تصوف، ادب، وغیرہ پر حاوی ھیں، حل مثنوی مولانا روم، کشف الاستار عن وجوہ الاشعار، شرح دیوان حافظ، شرح الفصوص علی وفق الفصوص (عربی)

و نیز فارسی، شرح تسوید عربی و فارسی و مکتوبات وغیرہ جن میں سے بعض دائرہ میں موجود ہیں بقیہ رامپور، حیدرآباد، لکھنؤ اور پٹنہ کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ آپ کے دوسرے محل سے جو علامت شہید کے سلسلہ میں آپ کو کرنی پڑی تین مولانا کمال الدین مولانا جمال الدین و مولانا جلال الدین پیدا ہوئے اور زیر تعلیم پدر بزرگوار رہکر بحر علم کے آفتاب ہو کر رہکے ہر ایک کی مختلف علوم پر تحریریں اور رسائل موجود ہیں - ملا جمال الدین کے تالیف التوضیح ندفی التسویہ کاتب سطور کے پاس موجود ہے جس میں مذکور ہے کہ مولانا عطااللہ والد مولانا غلام نقشبند اُستاد مولانا نظام الدین سہالوی الکھنوی ملا محمود جونپوری تمام علماء الہ باد میں جمع ہوے اور حضرت عارف باللہ شیخ محب اللہ الہ آبادی سے ان عقائد سے توبہ کرائی جو مرحوم نے تسوید میں لکھا ہے اور تجدید ایمان کرائی (یہ تحریر صاحب مکرم مولانا عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو کو بھی میں نے دائرہ میں دکھائی تھی) مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنوی نے قمرالاقمار نورالانوار کے حاشیہ میں ان حضرات کے قول سے سند پکڑی ہے اور اُنکے علم و فضل و عرفان کا اعتراف کیا ہے - حضرت شیخ کی زیارت کے لئے فرخ سیر بادشاہ دہلی بھی الہ آباد میں حاضر ہوے تھے اور اسباب عقیدت مندی بجالائے تھے پورب کی مہم پر معزالدین سے جنگ کرنے جارہے تھے دعاء کے طالب ہوے - حضرت شیخ نے بشارت فتح کی سنائی چنانچہ ویساہی واقع ہوا اور عقیدت مندی بادشاہ مذکور کی حضرت شیخ سے بہت بڑہ گئی ، اسکا وزیر حاضر خدمت ہوا کرتا تھا اور ایک دفعہ موے مبارک ریش مبارک کا گر پڑا تھا اسکو حضرت شیخ خوب‌اللہ صاحب سے اشارہ کر کے اٹھوالیا اور اسکو لےگیا اُسکی برکات کا بیحد قائل تھا - بہرحال قصہ طویل ہے اور یہاں قصر طوالت اور طے مسافت درکار حضرت شیخ محمد افضل الہ آبادی کے بعد آپکے داماد اور بھتیجے حضرت قطب الاقطاب

شیخ محمد یحییٰ المعروف بشاہ خوب اللہ الٰہ بادی صاحب سجادہ ہوے '

(۲) حضرت شاہ خوب اللہ علیہ الرحمہ المتوفی سنہ ۱۱۴۴ ھ

حضرت شیخ کے وصال پر بادشاہ ہند فرخ سیر نے حضرت شاہ خوب اللہ صاحب کے نام تعزیت کا خط لکھا اور بارہا شقہ جات صادر ہوئے جس میں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کو دہلی طلب فرمایا تھا مگر آپ نے ہمیشہ عذر فرمایا اور تشریف نہیں لیگئے ۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے پایہ کے اہل علم و رشد تھے آپ کے فیض تربیت سے بہترے صاحب کمال پیدا ہوے ۔ آپ کے تلامذہ اور مسترشدین کی فہرست طولانی ہے ۔ چند کے اسمائے گرامی یہہ ہیں مولانا علامہ امان اللہ بنارسی مفتی اکبر آباد' خواجہ عبدالعزیز بسمل گورکھپوری جامع مکتوبات جلد اول جن کو حضرت شیخ محمد افضل الہ آبادی نے بعد بیعت حضرت شاہ خوب اللہ صاحب کے سپرد فرمایا تھا نواب ارکات و غیرہ ' آپ کا ایک دفعہ دہلی جانا ہوا وہاں بادشاہ کے اشارے سے آپکی دستی تصویر بنائی گئی جس کی ایک نقل دائرہ میں بھی محفوظ ہے۔ آپ کے تین صاحبزادے تھے' اور ہر ایک علم و عمل کے آسمان کا ماہ روشن تھا' جس کی ضیاء سے سارا ہندوستان وعرب روشن تھا ۔ علامہ طاہر' علامہ فاخر' علامہ ناصر' علامہ طاہر کی تعلیم حضرت شاہ خوب اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے ہوئی علاوہ اس کے عقلیات اور نقلیات علامہ میر جاراللہ مفتی الہ آباد سے جو اُس زمانہ میں مشہور اہل علم تھے پڑھیں اور اُستاد کو ایسے تلمیذ پر جو فخر ومباہات تھا وہ اُس تحریر سے ثابت ہے جس میں مذکور ہے کہ علامہ طاہر نے مسئلہ تجدد امثال پر تقریر فرمائی اور اُستاد نے مجمع عام میں تعریف فرمائی اس بحث کو مابین اُستاد و تلمیذ حضرت شاہ خوب اللہ صاحب نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا ہے حضرت شاہ خوب اللہ صاحب علیہ الرحمہ صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں جن میں کتاب اعلام الانام فی وفیات الا علام اور مکتوبات

مجلد چہار جلد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، (ملاحظہ ہو تذکرہ سرو آزاد)
علامہ طاہر نے علامہ فاخر و علامہ ناصر کی تعلیم و تربیت فرمائی اور یہ دونوں بھائی بھی اپنے پدر و برادر بزرگ کے فیض تربیت سے بڑے صاحب کمال ہوے، علامہ فاخر محدث هندی المتوفی سنہ ۱۱۶۴ ھ کے علمی مرتبہ کے لئے صرف اتنا لکھہ دینا کافی ہے کہ علامہ مرتضیٰ بلگرامی زبیدی صاحب تاج العروس آپ کے تلامذہ میں سے تھے اور اس نسبت پر فخر کرتے تھے آپ کے علم باطن کے متعلق تنہا وہ تحریر کافی ہے جو علامہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں نے لکھی ہے، " بسا ارباب کمال را برخوردم الاپیش علامہ فاخر آن چنان سبکسار شدم کہ هیچ جا اتفاق نہ افتاد - ایک دوسری تحریر میں فرماتے هیں کہ تیرہ سو برس کے بعد اگر میری نظر میں کوئی ایسا آیا جو سر سے پا تک متبع کتاب و سنت هو تو وہ صرف علامہ فاخر الہآبادی هیں مولانا یوسف بلگرامی نے ان کی ملاقات کے واقعات بہت کچھہ لکھے ہیں وہ دہلی میں موجود تھے، نواب صدیق حسن مرحوم کو بھی علامہ فاخر تخلص 'زائر' سے عقیدت خاص تھی اور ان کے تصنیفات سے خاص شغف رکھتے تھے آپ کا دیوان فارسی بھی چھپ گیا ھے اور اپنی تالیفات میں انکے اقوال بہت نقل کئے هیں، نواب صاحب کو حضرت علامہ سے عشق تھا اور خواب میں سات بار اُنکو دیکھا تھا - آخری بار حج کو علامہ فاخر تشریف لیجا رہے تھے محض علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کی ملاقات کی غرض سے حیدرآباد کا راستہ اختیار فرمایا بعد عبور دریاے نربدا سرسام شروع ہوا تلامذہ اهل حاجت مریدیں ؎ ارشاد فرمایا کہ حیدرآباد میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کو اطلاع کرو اور رخت سفر برھان پور میں کھول دو انتقال سے پہلے علامہ آزاد بلگرامی وہاں پہنچ گئے اور اپنے مزار کی جگہہ بتائی اور حضرت شاہ عبداللطیف صاحب کے پہلو میں همیشہ همیشہ کے لئے خواب راحت

فرمایا - علامہ طاہر لاولد' علامہ فاخر کے ایک صاحبزادے علامہ غلام قطب الدین المتخلص بمصیبت الہ آبادی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں مثلاً حاشیہ بربیضاوی برمحاکمات و قاضی عضد وغیرہ بے مثل کتابیں ہیں صاحب دیوان فارسی تھے آپ کا وصال مکہ میں ہوا اور حضرت خدیجہ (رض) کے جوار میں مزار مبارک ہے —

(۳) حضرت قطب الاقطاب علامہ ناصر المتخلص بافضای المتوفی سنہ ۱۱۶۲ ھ

حضرت شاہ خوب اللہ علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد مسند آبائے کرام پر جلوہ افگن ہوے اور سجادہ نشین ہوے - آپ کی تعلیم ظاہری آپ کے برادر بزرگ علامہ طاہر سے ہوئی تھی اور حضرت شیخ محمد افضل علیہ الرحمہ سے مرید ہوے تھے اور تعلیم باطنی اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی - آپ مادرزاد ولی تھے اوربہت سے واقعات خرق عادت آپ سے سرزد ہوتے تھے اپنے وقت کے قطب تھے صاحب فضل و کمال و عرفان تھے آپ کے ارادت مندوں کی تعداد بہت کثیر ہے آپ بڑے پایہ کے شاعر تھے اور صاحب دیوان تھے فن شاعری میں آپ کے تلامذہ کثیر تھے جن میں بہت سے مشہور و معروف شعرا گذرے ہیں علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کو آپ سے غایت درجہ ارتباط تھا اور الہ آباد میں آکر رہے بھی تھے جیسا کہ اپنے تذکروں میں اُنھوں نے تحریر فرمایا ہے - تصوف میں حضرت ناصر علیہ الرحمہ کا پایہ بہت بلند تھا آپ کی بیش بہا تصنیفات تصوف میں ہیں' جن میں سے منتخب الاعمال اور جواہر نفیسہ قابل ذکر ہیں تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے صرف مختصر اشارات پر اکتفا کرتا ہوں' آپ کے صاحب زادے حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ تھے جن کے اسم گرامی سے یہ دائرہ مشہور جہاں ہے —

(۴) حضرت علامہ قطب اکمل شاہ محمد اجمل قدس سرہ المتوفی سنہ ۱۲۳۶ ھ

آپ بہت ہی ذہین اور ذی علم تھے' علوم ظاہری و باطنی میں آپ کی شان بہت بلند ہے -ا تعلیم ظاہری آپ کی علامہ غلام قطب الدین المتخلص بمصیبت

الہ آبادی سے ہوئی تھی - تعلیم بیعت پدر بزرگوار سے تھی - بہت بڑے پایہ کے شاعر تھے - آپ کا دیوان فارسی قابل دید ہے ' اصناف سخن میں رباعی قصیدہ ' غزل اور مثنوی سب پر آپ کا کلام حاوی ہے - دیوان ہندی (ریختہ) بھی آپ کا ہے - جس کا ذکر میر شیر علی ' افسوس' نے اپنے تذکرہ آرائش محفل میں کیا ہے جو افسوس ہے کہ نایاب ہے البتہ کچھہ متفرق کلام (ریختہ) موجود ہے جس میں سے ایک غزل محب مکرم مولانا عبدالحق کو کاتب سطور نے دی ہے جو اُمید ہے " اردو " میں شائع ہوگی - حضرت شاہ اجمل قدس سرہ کی علماء فضلا اور شعرائے عصر میں خاص امتیازی حیثیت تھی ' حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ اپنے گرامی نامہ میں آپ کو امام المسلمین کہہ کر تخاطب فرماتے ہیں ' نواب آصف الدولہ شاہ اودہ جب الہ آباد آتے تھے تو دائرہ میں حضرت کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے تھے اگر چہ قیام اُن کا قلعہ میں ہوتا تھا ایک موقع پر خود تحریر فرماتے ہیں کہ " تا دیر بخدمت حاضر بود " وہ آپ کے علم و فضل و عرفان کے بے حد قائل تھے خان علامہ آپ کے خاص احباب میں سے تھے انتقال کے بعد آپ نے ان کا مرثیہ بھی فارسی میں لکھا ہے جو مفتاح التواریخ میں شائع ہو چکا ہے - نواب آصف الدولہ کے انتقال پر بھی آپ نے پر درد مرثیہ لکھا ہے جو مفتاح التواریخ میں درج ہے - شیخ علی حزین سے معاصرانہ چشمک رہتی تھی ہندوستان کی ہجو میں جو رباعیاں ہوتی تھیں اُن کے جوابات آپ دیتے تھے ' علماء ہند کے وفود حاضر ہوتے تھے اور علم حدیث ' فقہ اور تفسیر کے مسائل پر اپنے شکوک آپ سے رفع فرماتے تھے - بخاری کی حدیث ہرقل کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے آپ سے علما کی ایک جماعت دائرہ میں حاضر ہوئی تھی اور اپنے شکوک اپ کے سامنے پیش کئے آپ نے اُن کو نہایت محققانہ اور تشفی بخش جواب دیا '

ہندوستان کے فضلائے عصر آپ سے ملنے آیا کرتے تھے اور عرب و عجم میں آپکی کافی شہرت تھی وہاں کے علماء وفضلا بھی جب ہندوستان آتے تھے تو آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے تھے - شعر و شاعری کے چرچے ہوتے تھے مرزا فاخرمکین بھی آپ سے ملنے تشریف لائے ہیں اور دائرہ میں قیام فرمایا ہے - اُن سے آپ سے کچھہ شعر و شاعری میں چل گئی تھی بالآخر مرزا فاخر مکین کو ماننا پڑا کہ حضرت شاہ صاحب علیہ‌الرحمہ حق پر ہیں ' تفصیلات کا یہ موقع نہیں - مولانا احمد عرب شروانی بھی حاضر دائرہ ہوے ہیں قصیدہ بانت سعاد کی شرح تحریر کردہ خود حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں نذر دی تھی اور سرورق پر ایک قصیدہ بھی تحریر فرمایا تھا جس کا پہلا شعر یاد ہے —

الا یا طالب الکرم المسلسل تو جوہ نحو دا باشاہ اجمل

جس وقت آپ دائرہ میں حاضر ہوے ہیں حضرت شاہ محمد اجمل صاحب قدس سرہ کے سامنے کاتب بیٹھے ہوے تھے ایک کو آپ فارسی کی غزل لکھوا رہے تھے' دوسرے کو اردو کی ' اور تیسرے کو عربی کا قصیدہ' علامہ شروانی اس تبحر علمی کو دیکھہ کر ششدر ہوگئے اور آپ کے علم و فضل کے بے حد معترف ہوے - تذکرہ نویسوں نے آپ کے بہت حالات لکھے ہیں' تصوف میں آپ قطب وقت تھے' آپ کی تصنیفات و مکتوبات بے شمار ہیں اس میں ایک فارسی میں قرآن کا ترجمہ ہے جو بے مثل ہے نہایت خوشخط حامل المتن ہے جس میں جابجا مختصر تفسیری نوٹ بھی ہیں اور شروع میں ایک مبسوط محققانہ مقدمہ ہے جو قابل دید ہے - آپ حافظ قرآن بھی تھے —

آپ اگرچہ دنیا کے طالب نہ تھے مگر دنیا خود آپ کے قدموں کے نیچے لوٹتی تھی - آبائی جاگیر کے علاوہ آخری شہنشاہ بہادر شاہ بادشاہ نے

مزید جاگیریں عطا فرمائی تھیں جس کی آمدنی کی مجموعی تعداد ڈھائی لاکھ سالانہ تھی، بادشاہ کو آپ سے خاص عقیدت وارادت تھی۔ آپ نے دیوان خانہ، محلسرا اور دائرہ کا پھاٹک تعمیر کرایا، دیوان خانہ موسومہ بخانقاہ شاہ محمد اجمل کی تاریخ تعمیر خود بادشاہ نے لکھی اسکو سنگ مرمر پر کھدوایا اور سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے منبت کرا کے بھیجا جو ابتک خانقاہ میں نصب ہے – حضرت اجمل ابن ناصردین ناصر آں ابن شاہ خوب آمد

اوبنا کرد وسال هاتف گفت "خانقاہ محمد اجمل شاہ" (۱۲۲۹ھ)

نواب آصف الدولہ نے حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ کی زیارت اسی خانقاہ میں کی تھی آپ کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت شاہ ابو المعالی صاحب المتخلص بعالی سجادہ نشین ہوئے جنکے نام ناسخ کا وہ خط ہے جسکے لفافہ کا بلاک ناظرین کرام کے سامنے ہے، حضرت شاہ اجمل قدس سرہ کے مختصر حالات انہیں کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں :—

کوسلام من صبا گر سوئے صحرا بگذری

قیس را فرہاد را آں اجمل دیوانہ را

(۵) حضرت شاہ ابوالمعالی المتخلص بعالی الہ آبادی قدس سرہ آپ کے ولادت باسعادت کے وقت ہندوستان کے مشاہیر علما، فضلا اور شعراء نے حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ کو تہنیت نامے، قصیدے، اور قطعات تاریخ لکھ کر روانہ کئے آپ پدر بزرگوار کے فیض تربیت سے علوم صوری ومعنوی میں صاحب کمال ہوئے، فارسی و ریختہ کے بڑے پایہ کے شاعر تھے، دیوان فارسی آپکا قابل دید ہے ریختہ کا شوق پدر بزرگوار کے انتقال کے بعد پیدا ہوا، لہذا میرتقی دہلی سے تلمذ اختیار فرمایا، چند غزلوں کے بعد میر مرحوم نے لکھ بھیجا کہ آپ کو اب اصلاح سخن کی ضرورت نہیں ہے آپ کے علم و فضل و عرفان کا بڑا

چرچا تھا ' آپ نے تصنیفات کثیرہ چھوڑی ھیں جس میں دیوان فارسی ' تحفہ قادریہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ھیں انگریزوں کا ھندوستان پر تسلط ھوچکا تھا ' آپ کی آبائی جاگیر و معافی انگریزوں نے ضبط کرلی اور مبلغ ۵۰۰ ماھوار کا وظیفہ مقرر کیا ' ھر چند کہ ذرائع آمدنی محدود ھوگئے تھے مگر آپ کا دست کرم طلبا ' فقرا ' مساکین ' مسافرین ' علماء و فضلا کے حاجت روائی میں ھمیشہ بڑھتا رھا ' اھل کمال کی آپ بڑی قدر کرتے اور ھر طرح اُن کی سر پرستی فرماتے تھے ' —

شیخ امام بخش ناسخ مرحوم آپ ھی کے عہد میں کسی تقریب سے تحصیل سہسرام ضلع الہ آباد میں تشریف لائے تھے تحصیلدار میر کلب حسین صاحب تھے جو خود بھی شاعر تھے اور ناسخ مرحوم سے رسم خاص رکھتے تھے ' اُنھیں کے یہاں مہمان ھوئے ' دائرہ حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ کا شہرہ علم و فضل عرفان و دولت و شاعری میں بہت تھا وھاں بھی تشریف لائے اور عرصہ تک مہمان رھے حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب نے آپ کی بڑی خاطر و مدارات کی ' شعر و سخن کے چرچے رھے اور اپنے صاحبزادے حضرت شاہ غلام اعظم صاحب کو جو اُس وقت صغیرالسن تھے شعر سنانے کی ھدایت فرمائی - ناسخ مرحوم شعر سنتے اور بہت محظوظ ھوتے اس تعارف کو ناسخ نے خاص طور پر یاد رکھا اور رسل و رسائل کی آمد و رفت برابر جاری رکھی اسی اثنا میں کسی فیل بان نے اپنے لڑکے کی سفارش شاہ اودھ کی بیگم سے کی اور بیگم کے فیض سے وہ فیض آباد کا ناظم مقرر ھوگیا ' یہہ بات حضرت ناسخ کو جو بادشاہ کے اُستاد تھے معلوم ھوئی آپ نے فوراً چار مصرع لکھہ کر تاریخ کہدی - ایک جماعت بر سر پر خاش تھی بھیجنہ وہ کاغذ بادشاہ بیگم کی خدمت تک پہنچادیا ' پھر کیا تھا آسمان

مصائب ٹوٹ پڑا ' زمین و آسمان کی فضا تنگ ہوگئی وہ قطعہ تاریخ یہہ تھا :—

بر اوج مسند شاہی نشست چوں ناظم زفیض حجلہ نشیناں ہودج عصمت
مورخش بسر فیل فکر رفت و گفت بگہر چوں سر آنکس بگو بری بری دہت دہت
سنہ ۱۲۴۲ ع

بیگم بیحد خفا ہوئی ' اور ناسخ کا سر طشت میں رکھوا کر مانگا ' ۔ بادشاہ نے اُستادی کا لحاظ کیا اور کہلا بھیجا کہ لکھنؤ چھوڑ دیں ' ۔ اب حضرت ناسخ نے ذہانت طبع کے بدولت لکھنؤ کو خیر باد کہا ' اور سیدھے الہ آباد دائرہ حضرت شاہ محمد اجمل میں تشریف لائے اثنائے سفر میں ایک شب کڑا میں قیام کیا تھا جو مشہور مقام ہے اور الہ آباد کے قرب میں واقع ہے ' قطعہ بالا کاتب سطور نے اولاً استادی حضرت مولانا حکیم مسیح الدین الملقب بحکیم بادشاہ علیہ الرحمہ کی زبانی سنا تھا اُس کے بعد گھر میں آکر ذکر کیا ' اُس وقت حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب کی زوجہ محترمہ حضرت بھو صاحبہ میری نانی بقید حیات تھیں اُن سے آکر ذکر کیا تو اُنہوں نے مفصل واقعہ بیان کیا ' نورتن بوآ نے خود حضرت ناسخ کی زبانی سنا تھا اُسنے بھی تصدیق کی نورتن بوآ وہ ماما تھیں جو حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب کی سرکار سے حضرت ناسخ مرحوم کے ناشتے اور کھانے کی ذمہ دار تھیں اور پہنچایا کرتی تھیں غرض کہ دائرہ میں حضرت شاہ ابو المعالی صاحب کی خدمت میں ناسخ مرحوم حاضر ہوے اور اُنہوں نے اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی اور دائرہ کے وسیع پھاٹک پر جو کوٹھا تھا اُس میں ٹھیرایا ۔ امام خاں خانساماں کے ماموں کے سپرد یہہ خدمت ہوئی کہ وہ ناسخ مرحوم کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہیں اور جملہ کار ہائے لائقہ انجام دیں ' غرض کہ ناسخ مرحوم کے لئے ہر طرح کی آسائش و آرام مہیا کیا گیا ناسخ مرحوم بہت لحیم شحیم آدمی تھے اور اُن کی خوراک بھی غیر معمولی تھی ' کھاروے کی لنگی باندھتے تھے اور اکثر اوقات ننگے بدن رہتے تھے ۔

گرسی کے شاکی تھے - تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے - مقدار خوراک اُن کی اب تک دائرہ میں ضرب المثل ہے- نو رتی ہوا صبح کو ناشتے میں ایک سیر کے پراٹھے ایک سیر قیمہ کبھی اتنی ہی مقدار گوشت کے کباب دس پانچ فیرنی کے پیالے ' انڈے وغیرہ مٹھائیاں مستزاد لے کر جاتیں شیخ ناشتہ فرماتے اور بہت ہی سادگی سے لنگی باندھ کر مکہ مدینہ میں جھاڑو دیتے - دوپہر ایک سیر کے نمکین چاول ' ایک سیر کے پراٹھے ایک سیر کا قورمہ ' چلہ قسم کے میٹھے ' ارھر کی دال یہ چیزیں دوپہر کے کھانے میں ضروری تھیں - حضرت شاہ علی جعفر صاحب اور شاہ غلام حیدر صاحب کے یہاں سے بھی کبھی کبھی چند قابیں کھانوں کی آیا کرتی تھیں - ان حریف قابوں کو بھی شیخ مرحوم لنگی باندھ کر شکست دیکر واپس فرماتے آپ کے ہمراہ چلہ تلامذہ بھی آئے تھے جن میں حضرت منیر قنوجی کا نام قابل ذکر ہے دائرہ میں شیخ مرحوم کی دیگر خاطر مدارات کے علاوہ مشاعرے بھی خصوصیت سے شروع ہوئے ' مقامی شعرا کے علاوہ باہر سے اور خاص کر لکھنو سے بھی اساتذہ فن بلائے جانے لگے - جو شعرا تشریف لاتے زاد راہ انکو دیاجاتا تھا حضرت شیخ ابوالمعالی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے حضرت شاہ غلام اعظم صاحب متخلص بافضل الہ آبادی سے باقاعدہ تلمذ شیخ مرحوم سے اختیار فرمایا کسی مشاعرے میں جس میں دیگر اساتذہ لکھنو بھی تھے کسی صاحب نے اپنی غزل میں لفظ " برقع " باندھا تھا جس میں " عین " گرتی تھی ' حضرت شاہ اعظم صاحب نے سنتے ہی اس کو نگاہ پر چڑھا لیا ' جب شمع آپکے سامنے آئی اور ہر طرف سے صداے تحسین و آفرین بلند ہو نے لگی جیسا کہ دستور ہے کہ دنیا امرا و مشاہیر کی خاطر داری میں مصروف رہتی ہے حضرت شاہ صاحب نے عرض کیا کہ اُستاد اجازت ہو تو ایک شعر سوانح زمین سے ہے ابھی ذہن نے ایجاد

کیا وہ بھی عرض کروں - ناسخ نے فرمایا کہ صاحبزادے آپ کا ذہن اس سے بھی ورائے الورا ہے صحت و سقم شاعری کے آپ ہی ذمہ دار ہیں تمام حاضرین نے کہا حضرت ضرور پڑھیں، آپ نے ارشاد فرمایا '

" ہیں " برقع سے نکالے کر وہ شوخ نازنیں

حسن کا دعویٰ کرے پھر خاک پتھر چاندنی

اِس شعر پر بڑی واہ واہ ہوئی ' اُس وقت حضرات لکھنؤ کو انتباہ ہوا کہ یہ چوٹ اس اُستاد پر تھی جس کے شعر میں " ہیں " برقع سے باہر تھی ایک حشر برپا ہوگیا ' تمام شعراء لکھنؤ کبیدہ ہوے کہ اے حضرت ناسخ آپ نے ہم لوگوں کی آبرو ایک صغیرالسن صاحبزادے سے خراب کرائی "

مشہور ہے اور بعض بزرگوں نے چشم دید واقعہ بھی بیان فرمائے ہیں کہ شاہ محمد ایک جی دائرہ کے پھاٹک کے کوٹھے پر رہتے ہیں وہ قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد افضل الہ آبادی علیہ الرحمہ کے مرید خاص ہیں ' چونکہ شیخ ناسخ مرحوم بھی اُسی کوٹھے پر رہتے تھے اِس لئے یہ قصہ بہت مشہور ہے کہ اُن سے اور شیخ سے بارہا کشتیاں ہوئی ہیں اور ہر شخص اس واقعہ کو اپنے اپنے الفاظ میں بہت دلچسپ کرکے بیان کرتا تھا —

ایک دن کا واقعہ ہے کہ غزل طرحی کی فکر میں شیخ مشغول تھے امام خاں خانساماں کے ماموں (نام اس وقت یاد نہیں آتا) پنکھا کھینچ رہے تھے اور بغور شیخ صاحب کو دیکھ رہے تھے - شیخ صاحب بھی فکر سخن میں مشغول اُنکو دیکھ رہے تھے ' دفعتاً یہ مسکرادئیے حضرت ناسخ نے ارشاد فرمایا کہ بھائی تم مسکرائے کیوں ' اس نے دست بستہ عرض کیا کہ آپ کو شعر کہنے میں اس قدر جانفشانی کرنی پڑتی ہے حالانکہ میں جاہل ناخواندہ ہوں مگر میں نے

بے تکلف اس طرح میں غزل کہہ لی ہے - شیخ نے ارشاد فرمایا بھلا کوئی شعر تو سنا اپنا برجستہ اس نے یہ مصرع پڑھا یا الٰہی شیخ جی کو تاقیامت شاد رکھہ - اس مصرع کو سنکر شیخ صاحب خوش تو ہوے مگر مصرع ثانی پر اس قدر بر ہم ہوے کہ جوتا لے کر ننگے بدن ننگے پیر صرف کھاروے کی لنگی باندھے ہوے اُس کے پیچھے دوڑتے ہوے دیوان خانہ سے ہوکر محلسرا کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب سے بآواز بلند شکایت کی کہ اب میری یہ عزت رہ گئی ہے کہ ایک لونڈا یوں گستاخانہ میری شان میں شعر پڑھتا ہے ' یہ یقیناً سید محمد جان قدسی کی شرارت ہے (یہ کاتب سطور کے منجھلے نانا تھے اور ' آتش مرحوم کے شاگرد تھے) حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب علیہ الرحمہ محلسراے سے بر آمد ہوے شیخ کی یہ ہئیت کذائی دیکھہ کر بے اختیار ہنس پڑے اور پوچھا کیا معاملہ ہے تو غصے میں حضرت ناسخ کو صرف مصرعہ ثانیہ ہی یاد رہ گیا تھا پڑھا - پائتانے اُلو بولے اور سرھانے " اندلیب " حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب علیہ الرحمہ نے سخت زجرو تو بیخ وباز پرس کی —

حضرت ناسخ مرحوم نے اپنے قیام " دائرہ " کے دوران میں مختلف تقریبات خاندانی ' مثلاً ولادت ' وفات ' شادی وغیرہ میں مختلف قصائد ' رباعیات ' قطعات تاریخی وغیرہ لکھے ہیں جو الحمداللہ کم و بیش اکثر محفوظ ہیں - افسوس ہے کہ اس وقت دماغ میں محفوظ نہیں ورنہ درج مضمون کرتا ' انشاللہ دوسری قسط میں یہ کمی پوری کی جائے گی اس لئے کہ خاندانی مواد تاریخی کی طرف بلا رجوع چارہ کار نہیں اور اس طور پر مولانا عبدالحق کے گرما گرم مگر نہکیں فقرات تقاضہ میں گوش زد ہونگے اور ان سے لطف اندوزی کا موقع حاصل ہوگا ' یہ کلام ناسخ کا جس کی طرف

میں نے اشارہ کیا ہے غیر مطبوع ہے اور شائع شدہ دیوان میں موجود نہیں ہے —

(۹) حضرت شاہ غلام اعظم المتخلص بافضل الہ آبادی

حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب علیہ الرحمہ کے بعد آپکے صاحبزادے حضرت شاہ غلام اعظم صاحب دائرہ حضرت شاہ محمد اجمل قدس سرہ کے سجادہ نشین ہوے ' آپ کی تعلیم ظاہری و باطنی پدر بزرگوار نے فرمائی جنکے فیض تربیت سے علوم ظاہری و باطنی میں مرتبہ کمال کو پہانچے اور امتیاز خاص حاصل فرمایا شعر و شاعری سے ذوق خاص رکھتے تھے ' بیحد ذہین اور طباع تھے فارسی کا کلام بھی آپ کا خوب ہوتا تھا مگر آپ کی شہرت ریختہ (اردو) میں زیادہ ہے - آپ حضرت ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید تھے ' آپ ہی کی خاطر ناسخ دائرہ میں اتنے عرصہ تک مقیم رہے انگریزوں نے آپ کے والد کی پنشن (وظیفہ) آپ کے نام بدستور جاری رکھی یعنی مبلغ پانچ سو روپیہ ماہوار - آپ بھی اہل علم و کمال کے بڑے قدرداں تھے اور فقرا' مساکین وطلبا کی دستگیری فرماتے اور سرپرستی کرتے تھے - آپ کے باورچی خانہ سے کثیر نفوس کی شب و روز پرورش ہوتی تھی - مشہور واقعہ ہے کہ تنور ہر وقت گرم رہتا تھا ' اب گرانی کا زمانہ آچلا تھا ' سابق زمانہ کی سی فارغ البالی و خوش حالی نہ تھی ' آمدنی محدود ہوگئی تھی اس لئے جائداد و غیرہ پربھی زوال آیا مگر جب تک آپ زندہ رہے روش آبائے کرام کو زندہ رکھا - آپ بیحد سخی اور فیاض واقع ہوئے تھے ' مسافرین اور اہل حاجت کی ایک کثیر جماعت روزانہ آپ کے دست کرم کی ممنون رہتی تھی، غربا کی لڑکیوں کی شادی کی بڑی حد تک کفالت آپ خود فرماتے تھے - ریختہ میں آپ کے چار دیوان ہیں فن شاعری میں ناسخ کے اسکول کو آپ نے بڑا فروغ دیا - قواعد اُردو میں بھی ایک

کتاب آپ نے تحریر فرمائی ہے جس کو ناسخ مرحوم نے بامعان نظر دیکھا تھا اور اس کے لکھنے کی فرمایش بھی کی تھی آپ کے دیوان کی بعض جلدیں میر محمد جان صدق کے خاندان میں ہیں ' بعض جلدیں علی گڈہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ کی زینت ہیں کچھہ جلدیں میر علی عماد صاحب نیسان کے خاندان میں ہیں جو منشی منیر صاحب کے تلمذ رشید تھے دیگر تصنیفات و غزلیات کا مجموعہ خاندان میں ہے ' ایک رسالہ منظوم " فقہ اعظم " ہے " جو نام حق " کی طرز پر اردو میں تحریر فرمایا ہے اس میں فقہ حنفی کے جملہ روز مرا کے ضروری مسائل درج فرمائے ہیں جس کو برادرم مولوی سید محمد اجمل مرحوم خلف اکبر حضرت شاہ محمد بشیر علیہ الرحمہ سابق سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل نے چھپوا کر شائع کرایا تھا' اس کی مقبولیت بہت ہوئی ۔ اس کے آخر میں اولاد کی اپنے لئے دعاء فرمائی تھی اور بڑے پر درد طریقہ پر' اللہ تعالی نے یہ دعاء مقبول فرمائی اور صاحبزادہ متولد ہوا' مگر مشیت ایزدی یہ تھی کہ یہ نعمت عطا کر کے چھین لی جائے' تقریباً چار سال کا ہو کر وہ لڑکا عین عید کے روز جان بحق تسلیم ہوا' اس کا مرثیہ تحریر فرمایا ہے اور بڑا ہی پردرد مرثیہ ہے اگر خدا نے فرصت دی تو اردو میں شائع ہونے کے لئے ارسال کرونگا ۔ فن شاعری میں آپکے تلامذہ کی بھی ایک کثیر جماعت ہے جن میں سے ممتاز اصحاب کی اسماء گرامی حسب ذیل ہیں حضرت سید محمد باقر المعروف بشاہ میاں جان المتخلص بشفق سکندر پوری (۱) حضرت شاہ محمد بشیر علیہ الرحمہ بشیر جو آپ کے پھو پھیرے بھائی حضرت مولانا شاہ علی کبیر صاحب کے صاحبزادہ تھے اور سالے بھی تھے اور اپ کے بعد آپ کے سجادہ نشین حسب وصیت ہوئے (۲)مولوی شاہ عبدالعلیم آسی علیہ الرحمہ سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور (۳) میر محمد جان صدق جونپوری

(۴) نواب ذوالفقار بہادر والی باندہ (۵) نواب آرکاٹ کے خاندان میں کوئی صاحبزادے تھے جن کا اسم گرامی اس وقت یاد نہیں (۶) منشی منیر قنوجی (جو اگرچہ اصلاً ناسخ کے شاگرد تھے مگر خود ناسخ نے چلتے وقت اُن کو شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے خدمت میں سپرد فرمایا تھا اور منشی منیر صاحب حضرت شاہ صاحب سے مستفید ہوے جسکا اُن کو اخیر دم تک اعتراف رہا) آپ کے وصال کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی زوجہ محترمہ نے آپکے خلفاء ' مریدیں ' تلامذہ اور اعزہ و احباب کے مجمع کثیر میں حضرت مولانا سیدی و سندی خالنالمحترم ظہورالدین احمد المعروف شاہ محمد بشیر علیہالرحمہ المتخلص بہ بشیر الہ‌آبادی کو آپ کی جگہ پر سجادہ نشین مقرر فرمایا ' —

(۷) حضرت شاہ محمد بشیر علیہالرحمہ المتوفی ۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۳۳۸ ھ

آپ حضرت مولانا شاہ سید علی کبیرالمعروف‌بہ شاہ میرن جان المتخلص بسید الہ آبادی صاحب خازن الشعرا و دیگر تصنیفات کثیرہ کے صاحبزادے تھے ' آپ کی تعلیم ظاہری ، باطنی اپنے پدر بزرگوار سے ہوئی تھی ' فن حدیث ' تفسیر وفقہ کی اجازت بھی اُنھی سے تھی ' حضرت شاہ غلام اعظم صاحب دیگر خاندانی اشغال و از کار کی اجازتیں تھیں اور اپنے والد کے مرید تھے فن طب آپ نے حکیم خلیل الدین خان لکھنؤی سے حاصل کیا تھا - اپنے والد کی علالت کے سلسلہ میں حضرت مفتی اسداللہ صاحب قاضی القضاۃ صدر عدالت آگرہ سے بھی فقہ میں تلمذ رہا فن شاعری میں آپ حضرت شاہ غلام اعظم صاحب کے شاگرد تھے , اور شعر بہت اچھے کہتے تھے ' صاحب دیوان ہیں حضرت شاہ غلام اعظم صاحب کے وصال کے بعد منشی منیر قنوجی سے بھی استفادہ فرمایا تھا ' آپ کے معاصرین الہ آباد میں میر اکبر حسین اکبر الہ‌آبادی شاہ آمین‌الدین

قیصر میر علی عباد نیستاں شاهزادہ میرزا قیصر بخت فروغ دهلوی ' حافظ ذکریا خاں دهلوی ' منشی غلام غوث میر منشی متخلص بہ بیخبر تھے ۔ اور ان سب سے بے حد گہرے مراسم تھے آپ کا خلق' فقر' تصوف' شاعری' جبروت الہ‌آباد میں شہرہ آفاق تھی ۔ آپ نے ریاضات و مجاهدات ها دہ کئے تھے اوراپنے وقت کے ولی کامل تھے ۔ حضرت شاہ غلام اعظم صاحب کے وصال کے بعد ' دائرہ حضرت شاہ محمد اجمل کے سجادہ نشین ہوے ' انگریزوں نے حضرت شاہ غلام اعظم صاحب کے وصال کے بعد اُن کا سیاسی وظیفہ مبلغ ۵۰۰ ماهوار بند کر دیا صرت اُن کی زوجہ محترمہ حمیدہ بانو بیگم علیہ الرحمہ (جو حضرت شاہ محمد بشیر علیہ الرحمہ کی بڑی بہن تھیں) کے نام سو روپیہ کا وظیفہ حین حیات مقرر کیا جو اُن کے انتقال تک جاری رہا '۔ اگرچہ انگریزوں نے معاش کا یہہ ذریعہ بھی مسدود کردیا تھا مگر حضرت شاہ محمد بشیر علیہ الرحمہ ایسے صابر و شاکر تھے کہ اُنہوں نے رزاق حقیقی پر تو کل اور قناعت کی جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ اُن کو خدانے مقبولیت عظیم عطا فرمائی اور آپ کے آستانے پر خلقت کا ایک ہجوم رهتا تھا جس کا سلسلہ صبح بعد نماز فجر سے جاری ہوتا تھا اور تقریباً نیم شب تک جاری رهتا تھا ' لوگ اپنے اغراض و مقاصد آکو بیان فرماتے تھے اور آپ کے دست حق پرست سے بیماروں کو شفا اور دیگر حاجتمندوں کی حاجت روائی حاصل ہوتی تھی ۔ آپ کے مریدین کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے ' آپ کی غیب سے امداد تھی اور آپ کے بلا طلب نذر و نیاز پیش کش ہوتی تھی جس کو آپ قبول فرماتے تھے یہہ رقوم اتنی ہوتی تھیں کہ وہ اُس کمی کو کہا حقہ پورا کر دیتی تھیں جو انگریزوں کے وظیفہ کے بند کرلینے سے ہوگئی تھی ' آپ کی شان استغنا صبر و شکر کی نظیر مشکل سے ملے گی آپ کے چار فرزند صاحب علم و فضل جواں

مرے مگر آپ کی زبان پر اُف تک نہ آیا ' آپ کا صبر و تحمل الٰہ آباد میں ضرب المثل تھا ' لڑکوں کے وصال کے سلسلہ میں آپ کا ایک شعر یاد آگیا جو درج ہے : —

چھوڑ کر تنہا مجھے ہر ایک نے لی اپنی راہ
دھوکے پیری میں دئیے ان نو نہالوں نے مجھے

خدمت خلق کا جو جذبہ آپ کے قلب میں ودیعت ہوا تھا اس کی نظیر نہیں ہے علالت میں بھی آپ باوجود ممانعت اطبا ہر وقت مصروف خدمت رہتے تھے اور مستعد رہتے تھے آپ کے فیض بربہت سے بہت سے قلوب منور و صاف ہوئے اور اکثر اصحاب کو رشتہ ہدایت میسر آیا - آپ کے مریدین زیادہ تر غازی پور ' بلیا ' شاہاباد وغیرہ میں آباد ہیں - آپ کے حلفا میں حسب ذیل اصحاب ممتاز ہیں —

برادر مکرم مولانا مولوی سید ابوالبقا صاحب سابق آنریری مجسٹریٹ سکندرپور ضلع بلیا - (۲) شاہ احسان اللہ صاحب غازی پوری سابق آنریری مجسٹریٹ وميونسپل کمشنر غازی پور (۳) مولوی حکیم نورالہدیٰ سلمہ قاضی پوری (۴) شاہ غلام حسین سلمہ سکندر پوری ' حافظ اطہر خاں ' حافظ رحیم داد خان صاحب وغیرہ خاکسار کاتب سطور کو ارادت و خلافت کا شرف آپ ہی کی ذات گرامی صفات سے ہے آپ کا طبقۂ علما و مشائخ میں بڑا احترام تھا آپ کے معاصرین علما و مشائخ آپ کا بڑا احترام کرتے تھے اور شیخ وقت سمجھتے تھے - آپ کے معتقدین میں صرف مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ ہنود کی بھی ایک کثیر تعداد تھی - نواب صدیق حسن خان صاحب نے آپ کو بار ہا بلوایا مگر ہمیشہ انکار فرمایا نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور جب الہ اباد میں دربار کی شرکت کی غرض سے آئے تھے تو حضرت ماموں صاحب علیہ الرحمہ (یعنی

بھڑکنے لگے اب تو زوروں سے شعلے　　دھڑا دھڑ لگے گھر کے شہتیر گرنے
تماشائی جتنے وہاں پر کھڑے تھے　　ہوئے گھر کے بچنے سے مایوس سارے

جو آتا وہاں ' یا وہاں سے گزرتا
ہر ایک بے گھروں پر تھا افسوس کرتا

کوئی کہتا اب اِن کا ہے کیا سہارا　　کہ اس آگ نے ان کو بے موت مارا
بھسم ہو گیا اِن کا دھن مال سارا　　یہ سن کر انہیں میں سے ایک یوں پکارا

نہیں فائدہ کرنے سے ہائے ہائے
مثل ہے " بچی جان اور لاکھوں پائے

غرض یو نہی ہر ایک تھا رائے دیتا　　کہ اتنے میں مجمع سے ایک شور اُٹھا
ہوئے ہوش بر جا تو ہیں دیکھتے کیا　　کہ چلاتی ہے اس طرح ایک دکھیا

تجھے میرے بچے میں لاؤں کہاں سے
ارے لاڈلے تجھ کو پاؤں کہاں سے

حقیقت سنو میری اُولاد والو　　خدا کے لئے داد کو میری پہنچو
اُسی کا میں ہوں واسطہ دیتی تم کو　　بچاؤ میرے لال کو جس طرح ہو

جہاں میں تھی بچہ بھی میرا وہیں ہے
کوئی اور میرا سہارا نہیں ہے "

یہ کہہ کر وہ لوگوں سے رو رو کے بولی　　" کنارے سے جو تیسری ہے وہ کھڑکی
وہی کو ٹھری ہے وہی ' لوگوں میری　　وہیں ہے بچھی بیچ میں ایک پلنگڑی

وہیں ' گود کا میری پالا وہیں ہے
میرے گھر کا لوگوں ! اُجالا وہیں ہے "

یہ سن کر ہر اک ہو گیا ہکا بکا　　ہر اک کو وہاں ہو گیا ایک سکتا
بچا تا کسی طرح دکھیا کا لڑکا　　نہ اتنوں میں یہ حوصلہ تھا کسی کا

کہ دانستہ جاں اپنی آفت میں ڈالے
بنے جس طرح اس کو جا کر بچالے

کسی کا یہ تھا قول اس کا مقدر　　لکھا ھی تھا قسمت میں ھو خاک جل کر
کسی کا یہ کہنا تھا "اے بندہ پرور　　نہیں زندگی اپنی ھم کو تو دو بھر
نہیں گھر تو یہ، موت کا ایک مکاں ھے
سنو بھائیو " جان ھے تو جہان ھے "

غرض جس کے جو منہ میں آتا وہ کہتا　　کہ اتنے میں پھر بھیڑ سے شور اُٹھا
سبھوں نے یہ دیکھا - وھاں ایک لڑکا　　یہ چلّاتا پہنچا - "میں آیا میں آیا"
کہا اس نے عورت سے " گھبرا نہ مادر
ابھی آیا میں تیرے بچے کو لے کر "

یہ کہہ کر نظر اس نے چاروں طرف کی　　دکھائی دی اُس کو پڑی ایک سیڑھی
اُٹھا کر وہ پاس اس نے کھڑکی کے رکھی　　نہ کی جان کی اس نے پروا ذرا بھی
لگی اس کی ھمت عجب طرح بڑھنے
لگا بے تحاشا وہ سیڑھی پہ چڑھنے

تماشائیوں نے جو یہ حال دیکھا　　کہ آمادہ ھے جان دینے پہ لڑکا
کہا سب نے حیرت سے " یہ بات ھے کیا　　کوئی رونے والا نہیں شاید اس کا
نہیں تو یہ کیوں موت کے منہ میں جاتا
یہ کیوں جان اس طرح اپنی گنواتا

ابھی تو نہیں ھے یہ پورا جواں بھی　　مسیں بھی نہیں ھیں ابھی اس کی بھیگی
ابھی سے ھے مرنے کی کیا اس کو جلدی　　کہ یہ عمر ھے کھانے اور کھیلنے کی
کہا اس سے سب نے " نہ کر یہ ستم تو
جوانی کا ماں باپ کو دے نہ غم تو "

بہادر بھی سلتا ہے ایسی کسی کی کہیں بات سے بوں وہ پھرتا ہے اپنی
وہ کہوں ڈرتا مرنے سے تھا کیا وہ لڑکی ؟ چڑھا وہ یہ کہتا کہ "چاہے ہو کچھ بھی"

" میں زندہ رہوں یا چلا جاؤں جاں سے
ملاحوں کا بچے کو تو اس کی ماں سے "

یہ کہتا ہوا پاس کھڑ کی کے پہنچا پھرانے کو منہ اس کا اک آیا او کا
جلے اس کے کوڑے ہوں وہ خود بھی جھلسا نہ ہمت میں اس کی مگر فرق آیا

کہا ہی کئے سب - " یہ ہوتا نہ ہم سے "
بڑا کوئی لڑکا جو کھڑ کی میں دم سے

دھوئیں سے وہاں پر تھا وہ گھپ اندھیرا نہ ایسا کوئی قید خانہ بھی ہوگا
نہ کو ہاتھ کو ہاتھ تک سوجھتا تھا بڑھا وہ مگر نام لے کر خدا کا

دعا کی مری آبرو آج رکھ لے
گنہ گار بندے کی تو لاج رکھ لے "

تڑپ کر دعائیں جو یوں اس نے مانگیں فرشتے فلک پر پکارے کہ " آمین "
ملک اس کی ہمت پہ کرتے تھے تحسین غرض وہ بڑھا دو قدم اور جو ہیں

پلنگڑی سے ٹھوکر لگی اور گرا وہ
مگر گرتے ہی بس ہوا اٹھ کھڑا وہ

پلنگڑی کو ہاتھوں سے اس نے ٹٹولا تو اتنے میں بچہ بھی وہ جاگ اٹھا
اٹھا کر گلے سے اسے بس لگا یا لئے وہ اسے پاس کھڑ کی کے پہنچا

یہاں اس سے مایوس سب ہو چکے تھے
اسے اپنی دانست میں کھو چکے تھے

تما شائیوں نے تعجب سے دیکھا بچا لا یا ڈکویا کے بچے کو لڑکا
تو بارے اب اُن کو بھی کچھ جوش آیا ہراک سمت اک شور تھا مرحبا کا

چڑھے کہتے سیڑھی پہ وہ لاڑ لاڑ
ہمیں دو اسے ' جان اپنی بچاؤ "

غرض اس نے بچہ تو لوگوں کو سونپا ازاں بعد خود آپ سیڑھی سے اُترا
مگر پوچھئے آپ حال اس کا کیا تھا ؟ جلے بال تھے سر کے اور جسم جھلسا

وہ حالت ' کہ خطرے میں تھی اس کی جاں بھی
وہ صورت ' جو دیکھے نہ پہچانے ماں بھی

ادھر ماں نے بچے کو زندہ جو پایا لگی کہنے وہ ہاتھ اُٹھا کر " خدایا
مجھے لال سے اپنے جس نے ملایا سلامت رہے اپنی ماں کا وہ جایا "

یہ بچے کو پھر اپنے لے کر پکاری
یہ ماں تیرے صدقے یہ ماں تیرے واری

غرض کچھ تھا ایسا بہادر وہ لڑکا کہ اب تک زمانے میں چرچا ہے جس کا
کیا کام ہی اس نے ہمت کا ایسا ہوئی جاں تک کی بھی اس کو نہ پروا

یہ ناظم تو اب ہاتھ اُٹھا کر دعا دے
کہ " ہم کو بھی ایسی ہی ہمت خدا دے "

—— (#•#) ——

مرزا غالب کی ایک تضمین

(صفدر مرزا پوری مرحوم نے مرزا غالب کے بچپن کی
ایک تضمین مجھے بھیجی تھی جو میرے کاغذوں میں
پڑی رہ گئی اور اب شائع کی جاتی ہے - اسی ضمن میں
انھوں نے ملا طاہر غنی کشمیری اور حضرت زاھد کی
تضمینیں بھی نقل کردی ہیں — اڈیٹر)

کسی تذکرے میں کسی نے ' مرزا غالب ' کے حالات میں لکھا ھے کہ ان کو بچپن میں پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا - اکبر آباد میں ان کی پتنگ بازی کا شہرہ تھا - اسی زمانے میں مرزا نے پتنگ کے تلازمے میں فارسی کے اس مشہور شعر پر

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ھر جا کہ خاطر خواہ اوست

بطور ترکیب بند چند شعر اردو میں لکھے تھے لیکن وہ ترکیب بند کسی کے ھاتھ نہ لگا نہ کسی نے نقل کیا محترمی مولانا حضرت ' زاھد ' سہارنپوری کے جد امجد مرحوم حاجی وزائر سید اکبر علی صاحب ' بلیغ ' ابو ظفر شاہ آخری تاجدار دھلی کے معتمد و وکیل تھے اور بادشاہ کے پنشن کا مقدمہ جو کمپنی سے لڑ رھا تھا اس میں اول سے آخر تک وکیل شاھی

کی حکومت سے اس زمانے میں برابر اکبر آباد میں عدالت العالیہ ہونے کی وجہ سے آتے جاتے رہتے تھے خود بھی اچھے شاعر اور ذی علم تھے - ان کی بیاض میں یہ ترکیب بند لکھا ہوا ملا - جو دلدادگان کلام غالب کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے - جسے ہمارے محترم بزرگ حضرت زاہد مدظلہ نے ہماری جدید تالیف " حسن خیال " کے لئے نقل فرما کر بھیجدیا ہے - ملاحظہ ہو -

ایک دن مثل پتنگ کاغذی　　لیکے دل سر رشتۂ آزادگی
خودبخود کچھ ہم سے کنیانے لگا　　اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل ہوائے دلبراں　　بسکہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار　　یہ نہیں ہیںگے کسو کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر　　کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی ان سے تیری سانٹھ　　لیکن آخر کو پڑیگی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے　　قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے　　بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھکو اڑادینگے کہیں　　مفت میں ناحق کٹادینگے کہیں
دل نے سنکر کانپ کر کھا پیچ و تاب　　غوطہ میں جاکر دیا کٹ کر جواب

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یہ تو مرزا غالب کی بچپن کی شاعری کا نمونہ تھا - ملا طاہر 'غنی' کشمیری نے بھی اس بیت کی تضمین کی ہے اور نہایت خوب کی ہے فرماتے ہیں -

ہندوی دیدم کہ مست عشق بود　　گفتمش زیں جستجویت چیست سود
در جوابم گفت آں زنار دار　　نیست در دستم عنان اختیار

رشتہ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جاکہ خاطر خواہ اوست

حضرت زاہد سہارنپوری نے بھی اس بیت کی تضمین فرمائی اس موقع پر ہم اُسے بھی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں :-

جب مدینے میں نہ پایا کچھ بھی چین گھر کو چھوڑا آئے مکے میں حسین

وہاں بھی پہنچے گھات میں اہل نفاق تب کیا قصد آپ نے سوے عراق

یہ خیال آیا کہ ہو کر قتل عام ہو نہ ضایع حرمت بیت الحرام

الغرض گزرے سفر میں پانچ ماہ بستیوں میں تھی نہ جنگل میں پناہ

یوں رہے کوہ و بیاباں میں رواں آج اس منزل پہ تو پھر کل وہاں

پوچھتا رستے میں زاہد جب کوئی ہے کدھر کا قصد اے سبط نبی

آپ فرماتے تھے جاتا ہوں ادھر حق تعالیٰ کی مشیت ہے جدھر

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہرجا کہ خاطرخواہ اوست

شاہ امین الدین وارثی

از

(جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری)

اس کا نصیب جس پہ کرم کی نظر ہوئی
جس کی طرف وہ ہوگئے دنیا ادھر ہوئی (بیخود)

اردو زبان کی مقبولیت سے پیشتر ہی ہندوستان کے ادب اور ملک اودھ کی پیاری زبان بھاشا یا بھاکھا پر تصوف کا اثر ہوگیا تھا۔ خود مسلمان شعرا نے بھاشا میں متعدد تصانیف چھوڑی ہیں اور اب تک بھاشا کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ امیر خسرو رحمۃاللہ علیہ اور ملک محمد جائیسی سے لیکر آج تک صدہا ایسے مسلمان شعرا کی سوانح عمریاں بہم پہونچائی جا سکتی ہیں جنہوں نے اپنے کلام سے بھاشا کو پروان چڑھایا۔ ملک اودھ میں تو بعض اضلاع ایسے ہیں جن میں بھاشا زبان کے شاعر اردو زبان کے شعرا سے کہیں زیادہ ہیں مثلاً ضلع سلطان پور اور بارہ بنکی وغیرہ۔ بارہ بنکی میں تو یعیی ایچولوی کی ہستی اس وقت بھی ایسی ہے جس کا مقابلہ بھاشا زبان میں شاید ہنود بھی نہ کر سکیں۔ خود راقم نے دیکھا ہے کہ مسلمان کسان جب دن بھر کی محنتوں سے تھک کر شام کو یکجا ہوتے ہیں تو یعیی ایچولوی کے ہندی نعتیہ نغمے گاتے ہیں۔ ان کے صمیم ہندی تلفظ اور غلط فارسی تلفظ سے جو دیہاتی سماں

چلدھہ جاتا ھے اس کا لطف سنانے ھی پر موقوف ھے مثلاً

آ سناویں تو ھے اب حال زلیخا کا ھم	اپنی نگری ماں تو یوسف کا بھرت رھیدم
تھیر سندر بھئے دھرتی پہ خدا تو سے کم

من بیدل بجمال تو عجب حیرانم	الله الله چه جمال است بدین بوالعجبی

برادران ہنود کا یہ فخر کہ اُردو زبان کی خدمت کرنے والوں میں ہنود نے مسلمانوں سے کم حصہ نہیں لیا بالکل حق بجانب ھے مگر ساتھہ ھی ساتھہ مسلمانوں کو اگر اس بات پر ناز ھو کہ بھاشا زبان کی خدمت کرنے میں ھم ہنود سے پیچھے نہیں رھے تو بالکل بجا اور درست ھے - اور ھمیں امید ھے کہ جس طرح اردو شعرائے ہنود کے کلام اور ان کے واقعات زندگی کی تحقیق و تلاش میں مسلمانوں * نے کوشش کی ھے اسی طرح ہندو بھائی بھی بھاشا زبان کے مسلمان شعرا کا کلام اور ان کے نام و نشان وغیرہ کی تحقیق و تلاش سے دلچسپی ظاھر کریں گے اور ان کی محنتوں کی داد دیں گے —

" ھنس جواھر بھاشا " اور " پدماوت " وغیرہ کتابوں سے دلچسپی رکھنے والوں پر ظاھر ھے کہ حضرت حاجی سید شاہ وارث علی رحمۃاللہ علیہ کو بھاشا زبان سے کس قدر دلچسپی تھی - آپ عموماً پدماوت پڑھا کرتے تھے اور اور آپ کے پڑھنے پر " ھندوں ' مسلمان ' پارسی ' یہود ' اور نصاری " غرض ھر ملت و مشرب کے اصحاب خواہ زبان سمجھتے ھوں یا نہ سمجھتے ھوں ایک وجدانی کیفیت میں ڈوبے ھوئے نظر آنے لگتے تھے - آپ ھی کے خلیفاؤں میں سے ایک معزز ھستی شاہ امین الدین احمد پوری قدس سرہٗ کی تھی جنھوں نے بالفاظ نواب احمد علیخاں خلف اکبر نواب صولت جنگ بہادر * -

---

* مثلاً جناب عشرت لکھنؤی -		* ملاحظہ ھو کتاب "پیم کہانی" دیباچہ —

" اپنے مرشد کے حسب الحکم سیاحی اختیار کرلی ھے ... اور تمام متبرک مقامات کی زیارت کا شرف حاصل کرلیا ھے " - ان متبرک مقامات میں بغداد شریف اور کربلائے معلی بھی ھیں - خود حضرت قبلہ سیف الدین سید ابراھیم القادری مدظلہ کے الفاظ ھیں —

" امین الدین ابن تہور رعای من الدرویش السالکین قدم بغداد قرار حضرت جدی قطب العارفین و رشد السالکین السید الشیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ " *—

شیخ امین الدین صاحب نے اپنے پیر کے تتبع پر بھاشا زبان میں طبع آزمائی کی اور جو کچھ لکھا خوب ھی لکھا - ان کے کلام میں " پدماوت " کا ساکیف اور " ھنس جواھر " کا سا بانکپن پایا جاتا ہے - اور لطف یہ ھے کہ آپ نے بھاشا زبان کی کہیں باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی - ابتدا میں اس سے کچھ دلچسپی ظاھر کی جو کچھ لکھا اپنے پیر کے فیض سے لکھا چنانچہ اپنی تصنیف کے حصہ غزلیات میں خود فرماتے ھیں —

اُمی ھوں میرے دل پہ فضل پیر کا — کرتا ھوں میں مقابلہ ھردم کبیر کا

آپکی جائے پیدائش احمد پور ضلع بارہ بنکی ھے - یہ نہیں معلوم کب پیدا ھوئے لیکن وفات کے وقت آپکی عمر اسی ۸۰ پچاسی ۸۵ سال سے کم نہ ھوگی - آپکی وفات سنہ ۱۹۲۷ ع میں ھوئی - آپکے والد ماجد شیخ تہور علی صاحب تمام عمر لکھنؤ میں رھے - نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے دربار میں اکثر

* یہ عبارت ایک مکتوب سے لی گئی جو مرحوم ' امین الدین رح ' کے کاغذات سے برآمد ھوا اور جس پر سجادہ نشین آستانۂ بغداد کی مہر کے ساتھ اور بھی دو مہریں موجود ھیں - راقم کے پاس یہ مکتوب محفوظ ھے —

مصاحبین انکے شاگرد تھے - کیونکہ انکا شمار علمائے لکھنؤ میں سے تھا - شاہ صاحب نے خود اپنے ایک شعر میں والد کی طرف اسطرح اشارہ کیا ہے —

تہور علی شیخ ابرار را   عابد زاہد سدہ کرتا را

شاہ صاحب کی ددھیال قصبہ امیٹھی میں تھی - خود لکھتے ہیں —

محمد عطا ہیں دادا ہمارے   شہر امیٹھی بسات
قاضی خدا کی پوتی بکھانی   بندگی میاں کی نات

لیکن بعد میں چونکہ آپ کے والد " احمد پور " اٹھ ہی کے شرفا میں شمار کئے جانے لگے تھے اس لئے " احمد پور " ہی ان کی جائے پیدائش ہے چنانچہ اس قصبہ کی تعریف انہوں نے اپنی ایک تصنیف " وارث پارن بیکنتھ پتھاون " میں اس طرح کی ہے —

" احمد پور " سو ہاون گانوں   بدھدا دین بسا رن ٹھانوں
" سورج پور " پرگنہ جا نان   سلہی "گھاٹ" تحصیل بکھانان
" بارہ بنکی " ضلع کہا وا   ملک " اودھ " " لکھنؤ " بتا وا

آپ کا ننہال قصبہ " سدھور " میں تھا - آپ نے دو شادیاں کیں تھیں - پہلی زوجہ " بسوان " ضلع " سیتا پور " کی تھیں اور دوسری قصبہ " سیدن پور " ضلع " بارہ بنکی " کی - آپ کا انتقال " ردولی " شریف میں ہوا - وہیں مدفون بھی ہوئے —

یہ نہیں معلوم کہ آپ نے حکم " سیروا فی الارض " کی تعمیل کس وقت سے شروع کی لیکن سفر میں آپ نے صرف اپنی شخصیت ہی کے بل بوتے پر معیشت نہیں کی بلکہ تجارت اور صنعت کے ذریعہ سے اخراجات سفر خود پورے کرتے رہے - میلاد شریف پڑھنے کا شوق آپ کو فطرتاً تھا - مولانا غلام امام شہید مرحوم سے آپ کو دادھالی قرابت تھی اس لئے یہ ذوق حقیقی سمجھنا چاہئیے -

آپ نے عرصہ تک بمبئی میں قیام کیا - وہاں سے عراق عرب اور عراق عجم کی سیر کی - رسالہ " کشف الا خبار " " بمبئی " سے آپ کو بہت دلچسپی تھی - شاید آپ کا صوفیانہ کلام اس رسالہ میں شائع ہوتا ہو لیکن ہمارے پاس کوئی اخبار موجود نہیں - سنہ ۱۹۰۳ ع میں آپ کا قیام بمبئی ہی میں تھا - اس کے بعد آپ حیدر آباد اور کلکتہ وغیرہ گئے - کلکتہ میں اس وقت حضرت ابو الکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کی ادارت میں ایک رسالہ موسومہ " لسان الصدق " نکلتا تھا - اِس رسالہ کا بھی آپ اکثر ذکر کرتے تھے - تجارت کے شوق میں آپ نے تمام دیار مشرق کی سیر کی - برما - آسام - ملایا - سماترا - جاوا وغیرہ میں عرصہ تک رہے - واپسی پر نیپال بھی گئے وہاں لال مرچ کی تجارت کی جس میں شائد آپ خسارے میں رہے —

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا - لیکن کچھ اپنی خاندانی علمیت اور شرافت کی وجہ سے اور کچھ اپنے پیر کی صحبت کی وجہ سے آپ لکھ پڑھ اچھی طرح لیتے تھے - اور یہی وجہ ہے کہ آپ بھاشا زبان کے ایک کامیاب شاعر ہوے ہیں —

سفر میں آپ کی سوشل حیثیت کا اندازہ اُمرا اور اکابر کے خطوط سے ہوتا ہے - کچھ دن آپ حیدر آباد دکن میں بھی رہے - مہاراجہ سر کشن پرشاد نواب دولت جنگ بہادر ' راجہ راے مرلی دھر اور دیگر اکابر تک آپ کو رسائی حاصل تھی - ضلع بارہ بنکی میں شیخ وہاج الدین صاحب سابق جوڈیشل سکریٹری ریاست بھوپال اور شیخ مسیح الدین صاحب بیرسٹر و سابق چیرمین میونسپل بورڈ علاوہ قرابت کے اُن سے عقیدت بھی رکھتے تھے —

بھاشا شاعری کی ابتدا آپ نے حاجی صاحب قدس سرہ کی حیات ہی

سے کی - آپ کی پہلی تصنیف مشتمل بر شجرۂ بزرگان دین موسومۂ " وارث پاون بیکنٹھہ پنتھاون " حافظ عبدالرزاق صاحب ساکن بارہ بنکی کی فرمائش سے طبع ہو چکی ہے - یہ تصنیف بالکل بھاشا زبان میں ہے - دوسری تصنیف یعنی " پیم کہانی " سنہ ۱۳۳۰ ھ میں نواب صولت جنگ کی فرمائش سے حیدر آباد میں طبع ہوئی - موخر الذکر نہایت جامع اور دلچسپ کتاب ہے - اس کے پڑھنے پر حافظ شیراز کی غزلوں کا لطف حاصل ہوتا ہے - " وارث پاؤن بیکنٹھہ پنتھاون " جو بزرگان دین کا ایک جامع منظوم شجرہ ہے نہایت دلچسپ ہے - اس پر تبصرہ لکھنا تو غیر ضروری معلوم ہوتا ہے - مگر چند اشعار ایسے لکھنا نامناسب نہ ہوگا جو اس کی خصوصیت کو ناظرین پر نمایاں کردیں -- مثلاً شروع میں اس طرح لکھا گیا ہے —

سمر سنور من من چت لائی الکھہ الکھہ لکھہ سیس نوائی
وہی آہی کوئی آہی نہ دوجا گھٹ گھٹ ہر پر گھٹ سب پوجا

نعت اس طرح شروع کی جاتی ہے —

پاپ ہرت سکھہ دیت اپارا ایسا نام محمد پیارا
سلام ہاتھہ نت دوت پٹھاوے کھیم کوسل سب بوجھہ سنکاوے

اور صحابہ کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے —

چار یو رتن محمد سا تھا پل پل دین بڑھاویں ہا تھا
ابو بکر ' صدیق رض ' سیانے دین لین گرگیان سمانے

عمر (رض) سنت خطاب بکھانے اس عمراؤ جگت سنت جانے

جن 'عثماں' سکل یہی لاوا لکوہ پر ان سب دیس پڑھاوا

علی(رض) علی(رض) سب دیس پکاری عرضی فرضی بات نہاری

ان کے بعد حسن بصری رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت شاہ وارث علی رحمتہ اللہ علیہ تک سب اولیائے کرام کے نام معہ تفصیل بھاشا میں نظم کئے ہیں - یہ کتاب بڑی تقطیع پر بہتر صفحات میں ہے - آخر کتاب میں اپنے احباب کا ذکر کرتے ہوئے احمد پور کے ایک اور مسلمان ہندی شاعر المتخلص بہ "سور جہلی" کا بھی ذکر کیا ہے - فرصت کے وقت سورجہلی پر بھی کچھہ لکھنے کی کوشش کی جائے گی —

آپ کی دوسری تصنیف موسومہ "پیم کہانی" ایک سو چوالیس صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جو بظاہر تو 'بھجن' 'ٹھمری' 'بسنت' 'ہولی اور ملار وغیرہ کا مجموعہ ہے اور اس طرح ماہرین موسیقی کے مطلب کی چیز ہے - لیکن جیسا کہ نواب احمد علیخان خلف الصدق نواب صولت جنگ بہادر نے لکھا ہے " سارا کلام عرفان میں ڈوبا ہوا ہے - اور خوبی یہ ہے کہ ہر ملت و مذہب کا آدمی اس سے لطف اٹھا سکتا ہے " - نیز یہ بھی نواب موصوف لکھتے ہیں کہ —

" نواب صولت جنگ بہادر کو ہمیشہ سے بزرگان دین سے محبت رہی - حضرت شاہ امین‌الدین کے کلام کو فراہم کرنے اور چھپوانے کے لئے جو مجھہ کو حکم دیا یہ صرف اس اقتضائے فطرت کی بنا پر نہیں بلکہ حضرت شاہ صاحب سے انہیں خاص طور پر عقیدت بھی ہے - الحمدللہ آج میری محنت کا نتیجہ نکلا - یہ کتاب حضرت

شاہ صاحب کی اجازت سے چھاپی گئی - پیم کہانی ' وارث جانی اس کا نام رکھا ہے " -

اس کتاب پر کسی طویل تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - صرف چند عام فہم بھجن اور دوہوں کی مثالیں پیش کرنا ہی کافی ہوگا - تاکہ یہ ثابت ہوجائے کہ زیادہ تر کلام معرفت میں ہے - چنانچہ کتاب کا پہلا شعر یہ ہے —

یہہ آچرج من دیکھی بھلانا　　اپنی صورت پہ آپ لبھانا

ذیل کا بھجن اکثر فقیروں کو گاتے ہوے سنا گیا ہے —

ہرسوں کون کہے موری باتا　　پیت کروں کہہ بھانتا
ماتھے واکے چندر براجے　　مکھہ پھولن کی باسا
ہرسون کون کہے موری با تا
سرون سنت بات برہن کی　　نین رہت مدہو ماتا
من موہن موہنی بھر باجے　　سبد سہا و ن آ سا
ہرسون کون کہے موری با تا
امین‌الدین وارث ہر راجی　　یہی ملن کی گھاتا
ہرسون کون کہے موری با تا

ان اشعار کی کیفیت کا اندازہ تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب کسی سادھو فقیر کو دسپنا بجاتے ہوے اور ان اشعار کو گاتے ہوے سنا جائے - ذرا ملاحظہ ہو عقیدۂ ہمہ اوست کو بھا شا میں کیا ہی پیارے انداز سے نبھا یا ہے —

سب مان ہو مہاراج　　من من مہیں من راج
چر تر آپار ساگن گیانی　　بھانت بھانت کرتار کاج
سب مان ہو مہاراج

دیو دیال دیا جگ وانی کر پا کرت کی لاج
امین‌الدین وارث گروانی بچھیا درب سماج
سب مان ہو مہاراج

ذیل کے نعتیہ ہندی نغمے تو کئی مرتبہ قوالوں سے بھی سنے گئے —

پر پر گھٹ بھے نام محمد رام بھئے بس رام محمد
چر تر چتر چتر البیلا آچرج سر سر نام محمد
نشت کنشت ڈوبے جل ساگر دام بھئے ہر نام محمد
روپ سروپ اُجیاگر جاگر پریم بست ہر کام محمد
چتے چتے پر لوک پٹھاوا جگئے جگئے بھیو نام محمد
امین‌الدین وارث رس بھاگن پایو سری سر نام محمد

رنگینی اور لطافت کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کو ظاہر کرنا با با تلسی داس کا خاص حصہ ہے مگر ایرانی تشبیہیں راماٗن میں بہت کم ہیں شاہ صاحب نے اکثر اشعار میں فارسی تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ ذرا حافظ شیراز کا یہ شعر پڑھئے —

ببوے نافۂ کاخر صبازان طرہ بکشاید
زتاب جعد مشکینش چہ خون افتادہ درد لہا

اس شعر کے بعد شاہ صاحب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں —

پھول کستری مرگ بدن مان وہ بورا جانے بن باس
بھنور لبھانا باس پھول پر من ہردم رہے واکے پاس

فقیروں کی ریاضت پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ مصنوعی مجذوب بننا ٹھیک نہیں بلکہ عقل و فراست کو ریاضت و عبادت میں دخل دینا

دینا شروع میں لازمی ہے —

گیان وہی جودھیان سنوارے   برن برن کایا دکھ مارے

اس کے بعد مراتب اعلیٰ تک رسائی حاصل ہونے کی اُمید بھی ہوسکتی ہے بمصداق —

جن چاہا تن پاؤرے ساد ہو   تدکا تن میں ملاؤرے ساد ہو
نین کہوں وہی صورت مورت   وہی سکل پھیلا ورے ساد ہو

نیز یہ کہ مکاشفہ کی کوئی خاص ہیئت و شکل نہیں :—

من کرتا کے گن پہچانو   برن برن بہر روپ بکھانو

میر صاحب (میر دہلوی) اپنی بھاشانہا اردو میں مسئلہ جبر پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :—

جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم عبث بدنام کیا

اس مفہوم پر شاہ صاحب کے یہ اشعار کیا ہی سہانے معلوم ہوتے ہیں :—

سکھ سنپت ہے جگ کر لیکھا   اون چاہا سوئی ہوت ہو
جو چاہو سکھ سنپے نا ہیں   کن پاو جیو کھوت ہو
جن چاہا سکھیال چڑھاوا   کرم لکھا سوئی ہوت ہو

بقول غالب ,, دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر" لیکن بہ حیثیت جزر ہونے کے ہم کُل پر حاوی نہیں ہو سکتے - جس طرح ہم جزو ہیں اسی طرح ہماری عقل بھی جزوی حیثیت رکھتی ہے - عقل کل تک اُس کو رسائی نہیں ہوسکتی یعنی محدود عقل اپنے حدود سے باہر نہیں جا سکتی یوں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے طرح طرح کی خیال آرائیاں کیا کرے رموز پنہاں پر ہم کو تمام وکمال آگاہی ہونا نا ممکن ہے - البتہ

صانع مطلق کی صناعیوں سے ہم کو دلچسپی ہوتی ہے جو دل اور روح پر اثر ڈالتی ہے مگر عقل اس سے بالکل بے بہرہ ہے - اسی خیال کو کسی قدر بانکپن کے ساتھ ذیل میں اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے :-

تم چترائی کوؤ جان نپائی کر چھل بل سلسار لبھائی
روپ روپ سروپ سلونا سکل سبھا فسدن کن کائی
متھرا ' چھانڈ برہا جگ بویو کوبر کل بندرا بن چھائی
انجن نین میں مکھہ مرھنی تاک بہاک مرجیون جائی
بول مہا راج گوسائیں صاحب درن دھر یو سر نائی
دکھہ برلن کا برن سناؤں جا نت بوید اکھائی

کیا ہی عام فہم خیال اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے گویا بالکل کسی اردو یا فارسی شعر کا ترجمہ ہے —

جنکی دور پیتم سنگ لاگی جگت چھانڈ بھئے بیراگی

بعض بعض بھجن تو ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا خود بابا تلسی داس نے کہے ہوں کیونکہ ان میں وہی واقعہ نگاری اور ویسی ہی تشبیہیں ہیں جو ہندی راماین میں دیکھی گئی ہیں مثلاً —

مم راج رکھو بلواری کر جورت سیام بہاری
تشنا کرودھ اُڑے درجن دھن سدا لیو دھائی مراری
مم لاج رکھو بنواری

دیکھو جل بورت اک ناری جل میں جلم اکھاری
اُمنگ امانگ آوت جل اوپر مورت سلونی پیاری
مم لاج رکھو بنواری

جل میں رہت جل انگ نہ بیاپا		ایسی چتر وہ ناری
باس سباس انگے انگ سوہت		دیکھہ رہت پھلواری
مم لاج رکھو بنواری

بھجن کے علاوہ تھمری اور ملہار وغیرہ پر الگ الگ خیال آرائی کی گئی ہے - مثلاً یہ تھمری —

کیسے دھروں من دھیر		بن رے ہرس رکھو بیر
بلکھہ بلکھہ جیرا رہ جاوت		سونی سیج ادھیکو ترپاوت
نندی بھورا انگوتھا دکھاوت		نین بہاوت نیر
کیسے دھروں من دھیر

ذیل کا ساون بھی ملاحظہ ہو:—

ساون بھری برکھا بھیو		ہری چھا یو ھردوار
آن بن سیجا ناگن بھیو		ڈر لاگے ادھی کار
'امین الدین' لکھہ وارت رہیو		جگ تارن اوتار

اسی طرح کھیال ، ملہار ، لاچاری اور بسنت وغیرہ بھی لکھے ہیں جن کی مثالیں طوالت کے خوف سے قلم انداز کی جاتی ہیں - البتہ " بسنت " میں ایک بات قابل ذکر ہے جس سے شاید اب ہمارے ہندوستانی بھائی بالکل ناواقف ہوتے جاتے ہیں - وہ یہ کہ قدیم زمانہ میں جب تک مختلف رنگوں کی تحقیق نہ ہوئی تھی اس وقت تک قُرطم کے پھول یعنی " کُسم " کا مرتبہ بسنت کے موقع پر وہی تھا جو ' ہولی ' میں عبیر گلال اور بیاہ شادی کے موقع پر " حنا " اور " رنگ حنا " کا ہے -- غرض کُسم کی اس مخصوص اہمیت پر اس طرح اشارہ کیا جاتا ہے —

کہوں دیکھوں پران ہمارے		میں تو تہارھی بسنت سنوارے

کل کابن چن کڑوا بنایوں مکنا کسم رنگ تارے
چھڑیان گلاب لئے اولاسی نیر چرن پر دھارے
پھول ھجار بھرے تھارن مان پت کی راہ نہارے
"امین الدین" وارث رنگ ساتی سندر شیام دلارے

جو نغمے ھولی پر لکھے گئے ھیں نہایت ھی دلچسپ ھیں اور بہت زیادہ تعداد میں ھیں اس لئے یہاں بطور مثال چند اشعار ھی کافی سمجھتے اور ایرانی شاعر قاآنی کے حسن محاکات اور حسن صورت کو مد نظر رکھتے ہوے ان کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے -- شاعر نے اشعار کے ذریعہ سے کیا ھی دلچسپ سماں باندھا ھے -- اور ساتھہ ھی ساتھہ ھولی کا بانکپن بھی خوب نبھایا ھے مثلاً —

کنھیا! موری چولیا لے گیو چور
جھم جھم جھانجھہ مجیرا بولین تِنکا تِنکا پور
مردنگ ڈھول دف بائین باجین بین ستار طنبور
کنھیا! موری چولیا لے گیو چور
باج رھے کانون سرنگی ھرسو نیم دھن سور
کتھک رادھکا سکھی ابھرا رام جنی گت تور
کنھیا! موری چولیا لے گیو چور

غرض ان اشعار سے ھولی کا پورا پورا سماں کھینچ دیا ھے -- ان مثالوں کے بعد ھم "پیم کہانی" پر کچھہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتے -- البتہ آخری نظم بعنوان "جلوس مبارک بادی" کے چند اشعار اس لئے لکھہ دینا مناسب معلوم ھوتا ھے کہ وہ اشعار در اصل شہر یار دکن کی علم نوازیوں کا اعتراف ھیں - چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ھیں —

رنگ لایاری رنگیلا رنگ لایاری   باس پھول پھول پایاری
دواو دواو ہاتھن بھر موتی   نو نو رتن لٹایاری
شاہنشاہا عثمان علی خان   جگ لکھوں روپ لجایاری
لاکھوں لاکھہ دوکان لکھیری   کرور کرورن دایاری
دے اقبال و او گن و نتاراتا   سکھہ سنپت کل مایاری

قصیدہ کے آخر میں یہ دعائیہ مقطع لکھا ہے :-

امین‌الدین کرتا سُن وارث   رہے شاہ دکن پردایاری

مرحوم نے ایک ضخیم مسودہ غیر مطبوعہ چھوڑا ہے - کچھہ تکڑے پرچے بھی ہیں جن پر بھجن اور دوھے لکھے ہیں کچھہ غیر مطبوعہ کلام چھوٹی بیاضوں میں ہے - یہ سب راقم کے پاس محفوظ ہے - اور علم‌نواز ہستیوں کی قدردانی کا منتظر ہے - چونکہ راقم کو مرحوم سے اکثر بھاشا زبان میں درس لینے کا شرف حاصل ہوا ہے اور کبھی کبھی ہندی نغموں پر اصلاح بھی لی ہے اس لئے اپنا فرض مذہبی جان کر ان کے تمام ذخیرہ کو اپنے پاس جان سے زیادہ عزیز سمجھہ کر رکھہ چھوڑا ہے کہ شاید کبھی فیض وارث سے طبع ہو جائے - ان غیر مطبوعہ نوشتوں میں چند قصائد بھی ہیں - جو مرحوم نے مہاراجہ سرکشن پرشاد ' نواب صولت جنگ بہادر اور نواب احمد علی‌خان والی رامپور کی مدح میں لکھے تھے - یہ خود مرحوم نے اپنے ہاتھہ سے لکھے ہیں اور مسودہ کی صورت میں محفوظ ہیں ایک بیاض میں کچھہ نعتیہ کلام بھی ہے آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ مرحوم نے کبھی کبھی اردو زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے - چند غزلیں " پیم کہانی " میں

طبع ہو چکی ہیں لیکن اردو کلام بھاشا کی طرح استادانہ نہیں -
' شہباز ' مرحوم نے پیم کہانی پر قطع تاریخ لکھا ہے - وہ یہ ہے —

سر کو اڑا کے دشمن کے یہ مصرعہ کہہ

پیم کہانی وارث جانی شان جمال

سنہ ۱۳۳۰ ھ

قدیم اردو

حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان

از

ادیٹر

قدیم اردو (یعنی دکھنی) کا نشو و نما دکن میں ہوا - چونکہ یہ زبان اہل علم کی نظروں میں کبھی مقبول نہیں ہوئی تھی ، لوگ بھول بھال گئے کسی نے توجہ نہ کی اور بہت سا قدیم کلام ضائع ہو گیا - اب جو کچھ ملا ہے وہ محض اتفاق ہے ورنہ کسی نے اس کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں کیا تھا - خود وہ لوگ جن کے بزرگوں کا یہ کلام ہے اس سے نا واقف اور ان کی زبان سے نا بلد ہیں - انہیں بھولے ہوے شعرا میں سے ہم حیدرآباد کے ایک شاعر خاندان کا ذکر کرتے ہیں - سال بھر سے زیادہ مدت ہوئی کہ یہ کتابیں جن کا ذکر اس مضمون میں ہے ہمیں نواب عنایت جنگ بہادر کی عنایت سے مطالعہ کے لئے دستیاب ہوئیں جس کے لئے ہم عالم دوست نواب صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں —

ملا عشرتی

ان کا نام سید محمد تھا ، سادات حسینی سے تھے - ان کے والد ہندوستان

میں آے اور دکن میں رہ گئے - پہلے ان کا تعلق عادل شاہی حکومت سے تھا' بعد میں حیدر آباد پہنچے اور اگرچہ درویش منش تھے لیکن بادشاہ کے ہاں عزت و وقار تھا اور منصب و خدمت سے ممتاز تھے عشرتی نے فارسی پد مارت بھی لکھی ہے جس کا ماخذ ملک محمد جائسی کی مشہور کتاب ہے - اس کے دیباچے میں مصنف نے عالمگیر کی مدح لکھی ہے او خاتمے پر حیدر آباد کے چار محل کا استعارہ کیا ہے - اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس زمانے میں گزرے ہیں جب کہ حیدرآباد پر اورنگزیب کا قبضہ تھا اور صوبہ دار نگراں کار تھے - اس کتاب کے مادۂ تاریخ سے بھی جسے عشرتی نے کتاب کے خاتمے پر نظم کیا ہے اس کے زمانے کا پتا لگتا ہے - وہ شعر یہ ہے -

بہار افروز دل شد چوں گلاش "گلِ ختمی" است تاریخ تمامش

(گلِ ختمی) سے سنہ ۱۱۰۰ھ نکلتا ہے —

عشرتی کے پوتے احسان نے (جس کا ذکر آگے آئے گا) اپنی کتاب (قصۂ حاتم طائی) کے ابتدا میں اپنے خاندان کا کچھہ ذکر کیا ہے - وہ اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں —

برکت کا باعث بزرگوں کا نام ہے روشن کہ اس کار کچھہ کا تمام

کروں نام سید محمد کا یاد سیادت کے گھر کا ہے ذات الوداد

علی ولی کا خلف الحق پسر حسینی تھا سید و عالی گہر

جہاں میں تھا گرچہ تاہل کے سات منش پاک آزاد عالی صفات

نہ دنیا کے کاموں سے کچھہ سول تھا نہ کچھہ حرص کا دل کے گھر دخل تھا

دکن کے تھا مرجع کے پاس اس وقار کہ منشی و ناظم تھا شہرہ دیار

معزز بہ جاگیر عز و وقار تھا ممتاز از درگہ شہریار

نظم اس کی خاطر صدف کا گہر ہے یک موج بحر فکر کا نثر

تصانیف نظم و نثر فارسی   بہوت اس سے ہے عقل کی آرسی
ہے دکھنی میں دیپک پتنگ چت لگن   دو قصے کہ بس ہیں و عالی سخن
تخلص ہے مشہور اس عشرتی   معارک سخن کا تھا خود نصرتی

دکھنی میں ان کی دو کتابیں ہیں جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے ' ایک دیپک پتنگ اور دوسری چت لگن - چت لگن میری نظر سے نہیں گزری لیکن دیپک پتنگ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عشرتی ایک پختہ شاعر تھا - کلام میں حسن و ذوق پایا جاتا ہے - زبان صاف اور فصیح لکھتا ہے جس میں سے شاعری کا رنگ جھلکتا ہے - قصہ عام قدیم قصوں کی طرح حسن و عشق کا ہے جس کی کہانی میں کوئی خاص بات نہیں - البتہ اس کی شاعری ضرور قابل داد ہے اب میں اس کی شاعری کا رنگ دکھانا چاہتا ہوں —

ابتدا میں حمد ہے ' اس کے بعد نعت و منقبت ' پھر اپنی تعلی ' دکھنی میں لکھنے کا عذر ' عشق کی کارستانیاں و غیرہ لکھ کر اصل قصہ شروع ہوتا ہے —

حمد

الہی تو نور دیا زمیں ہور زماں   دیپایا سورج جوت سوں آسماں
فلک کو سنکایا * تو گردش کی چال   سیہ نس † پہ لایا ‡ چندر کا ہلال
زمیں گھی کا منڈوا سنواری تمام   انگوراں کے جھونکے § ستارے تمام
فلک کی کیا تو نچ $ کرسی بلند   توں بھی کی چتر سال ¶ نا نقشبند
سکل دل ہیں تجھ حکم کے کاردار   متی کی پتی تو چتریا # نگار

---

* سکھایا   † رات   ‡ لگایا   § خوشے $ تو ہی
¶ نگار خانہ   # نقش کیا

توں پالی پو کھینچیا عجب یک رقم کہ مانی کے لقشاں پو توڑیا قلم
پریشاں ورق دل گرفتار کوں شرازہ بند یا زلف کے تار کوں
توں ہی میں دیا پھول کوں رنگ و بو دیا بلبلاں کوں انجو * آبرو
غسل خانہ عاشق کی انکھیاں کا جم کیا توں حسن کی سورج تے گرم
چمن کے عروساں دیپا یا سو تونچ سرو قد کوں جلوہ سکایا سو تونچ

نعت

محمد نبی فخر کونین کا چھتر گھن † کے سر جس کے نعلین کا
صدف اس کے موتی کا ہے جسم و جاں عرض اس کے جوہر کا کون ہور مکاں
ولیاں کا کعبہ نبیاں کا امام کیا جس پو حق نے نبوت تمام
وو رحمت اہے خاص اللہ کا شرہ اس کا ہادی ہے گمراہ کا
اسی سرنچ بد سور درشن ہوا علم ہور عمل اُسی تے روشن ہوا
ظہور اس تے ہے فیض رحمان کا وہ ہی ترجما بھید قرآن کا

... ...

دنیا دین کا وو رچ کعبہ سہی حسن کی صورت کہ ہے معنا وہی

... ...

ہے دس بد سپورن دھر نہار تونچ اکم ‡ بھید پرگھت کر نہار تونچ

منقبت

ود جگ کا ہے سلطان علی ولی سکل مومناں کا ہے قبلہ علی
نبوت سمد § نور اس کا صدت ہے نرمل گہر تس میں شاہ نجف
ازل کے دریا کی صدت میں مقیم تھی ہم سنگ یک بوند دریتیم
جو اس بوند سوں جس مبارک گھڑی رتی جوت طالب کے چک ¶ میں پڑی

* آنسو † آسمان ‡ اتھاہ نا قابل فہم § سمندر ¶ آنکھ

تب اس ہری پستی ادک ذات سوں   تجلی بھری طور کی جوت سوں

وجہ تسمیۂ کتاب

جے کچھ اک دل جب پرلا بچھاڑ   زباں جگ کے کانان میں و آگ پائی
پرہ کے جر بوندان لکھا بے درنگ   ر'دو' نام اس کا سو دیپک پتنگ

تعلی اور دکنی میں لکھنے کا عذر

جن جن شعرا نے دکھنی میں نظمیں لکھیں ہیں انھوں نے اس زبان میں لکھنے کی معذرت بھی کی - اگر چہ اس زمانے میں دکھنی نظم کا عام چرچا تھا تو بھی فارسی کے مقابلے میں اس کی قدر نہ تھی ۔

غواص اگر دیکھتا آج کوں   موتی کے نمن جل میں تب لاج سوں
سچی جوب کی دھر صدف اپ سنبھار   دعا کے گہر مجھ پو کرتا نثار
نہ نکلیں جنم بھر بدخشاں سوں   جے گوھر نپجتے* ہیں مجھ کھاں سوں
ایکت† ہور میں اس فن میں اس دھات سوں   کہ ہے چھانوں اپروپ مجھ ذات سوں
حقارت سوں مت دیکھ اس خط کوں   نہ بجھا‡ دیکھ جوتی رتن پاک کوں

... ...

شہا تجھ تے منگتا ہوں انصاف میں   نہ منصف دسیا مجکوں بج باج کہیں¶
کہ کس گت سوں باندیا ہوں بدتا نری   دیکھی تو منجے کو چ نسبت نہوں
ہریک شعر کا ہر کسی فام ادن   سو دکنی کلا کچ سرا کام نئیں
اگر فارسی کی تو امرت پلا نوں   سعر کر کو کوزے میں سمدر کوں پانوں
پتر کے اوپر ناچتی ہے قلم   عجب نیں ہے پسلے جو اس کا قدم
ہے نو سکھ دکھنی سال کے دھانو ہ گی   اول سوں بھاری ہے ٹک پانوں کی
توں اس کی خطا پر نہ ہر ایک تھار   یو کا زی†† کوں کر روک** تیوں باو دار

---

* پیدا ہوتے ہیں   † تنہا   ‡ غور سے دیکھ   ¶ کہیں
†† تنکا   ** روکھ ، درخت

ایک دوسری جگہ پھر دکنی میں لکھنے کا ذکر کیا ھے

ھندی ھو عراں کا ھے دل آرسی   دکھن میں دکھاؤں اگن فارسی
کروں ساز یوں عاشقاں کا فراق   اچھے راگ دکھنی ھور نغما عراق
یو تحفا حسن عشق کا سائی * سوں   سو بھیجوں دکن تے خراسان کوں
کہانی کے پڑھے ستی اپ سنبھار   دیپک اور پتنگ کا کروں سوز بھار

آگے چل کر ایک بار پھر تعلی کر لی ھے اور خوب لکھا ھے —

پتر پر گلچیں † زیر تھالیا ھوں میں   بوہ مس میں سورج کر تھالیاں ھوں میں
سرا کلک کاغذ پر اڑتے پران   اگا یا دو جبریل کے شہپر ان
بچن لے یہ اس پر کا آواز ھے   درود اس پو بھیجے سرشہباز ھے
ولے عیب جوریاں کے ھت سوں بچن   پتر کاچ پھلے ھیں سب پیر میں
رکھے اس پو انگلاں کسے کیا مجال   سلد پتر سی ‡ نہ چکٹی میں زنگی کے بال

...   .

ھما سانج قلم کا لیا جیب پونچ   ستیا ھے سو کھے ھات پر کرھ چونچ
ولے مغز معنی ھے اس سہر § میں   بچن سوں ستھیا ھے شکر شہر میں

...   .

سٹیا ھوں جو دمیں $ میں قلم کا تراش   الک خاک بیزاں نمی کر تلاش
کوں ڈھنڈ ‖ بزباں میں کوچ ** کچ پایا گیا   اپس کی دکاں کا سو ما یا کیا
بچن کا رتی ھے جو سمجھ کان میں   سو چو کھیا طبیعت کی میزاں میں

...   .

---

* لشکر   † سونا   ‡ چٹکی میں زنگی کے بال نہیں آسکیں گے
§ سر $ زمیں   ‖ ڈھونڈا   ** کچھ کچھ

قلم سرخ خوش رنگ پیارا دسے　　مشفق * کا یو دانا ہی چارا دسے

اسی میں حیدرآباد کے چوہتے کی طرف استعارتاً اشارہ کیا ہے —

کہ معشوق الفاظ کے سہام رنگ　　رہتے ہیں سب اس بھیں منے ایک سنگ

ہر یک چار کوشہ ورق بے مثال　　دسے حیدرآباد کی چار محال

اس مثنوی میں صنائع بدائع سے بھی خوب کام لیا ہے - تشبیہوں، استعاروں اور لفظی رعایتوں کی کمی نہیں - جنہیں دیکھ کر گلزار نسیم یاد آجاتی ہے نمونے کے طور پر چند مثالیں لکھی جاتی ہیں —

کہ گھائل دل اس رن میں مشہور ہے　　انیاں سر پو کھاوے سو سب سور ہے

ہوا سوں جو سبزے پو بوند آپڑے　　ہرے پاچ † پر جیوں کہ موتی جڑے

گل شبو کھل کر ہوا شب چراغ　　دھویں سوں کیا نس کا خوشبو دماغ

پنکھی تان گاتے تھے خوش سر اُٹھا　　درختاں کے پاتاں سوں باجے بجا

ملے جا چندر سور یک برج میں　　ملے لعل یاقوت یک درج میں

جو سعد ین تھی سات امرت بھری　　مشاطہ ہو جلوہ دیتی مشتری

دعا منگلے ہاتاں اُچایا چنار　　کلی گل کی آسیں کتو ‡ اب سنبھار

مشاطہ جو جلوے کوں تلنے لگی　　وو باوے § سوں جوں پھول ڈلنے لگی

ملائم پاچ کا کھیں نے تانیا اکھنڈ　　چمک لا ستاریاں سٹی چار کھنڈ

---

* مشک　　† کانچ　　‡ کہتی　　§ ہوا —

چڑیا تجہ نین جام کا سر خمار   سہنے مہر گزک لہو کی بلداں انار
تو رنج مجہ تے نا کھینچ اگرکنج باے   اکیلا چ اچہ توں جو نا رنج پاے
نہ کہوک مہا آ ملو لگی تجھے   سدا سیرتی میں اچھو لگی تجھے
حیا تے کیا * سیتا کوں رام پھل   جہاں سر کو سو بیر + تج آس بل

بعض جگہ فارسی محاوروں کے لفظی ترجمے کردئے ہیں - مثلاً دنبال لینا (دنبال گرفتن)

جو ہو تیج دنبال لی رو اہوول   کہیا تب وہ راذوین نے رانی سے کھول

گرم و سرد زمانہ کا ترجمہ دیکھئے

دیکھی آزما جگ کا تہنڈ تتا

یا اسپ صبا رفتار کا ترجمہ " پون پگ گھوڑا " کیا ہے —

ایک جگہ " دال میں کالا " کا محاورہ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ محاورہ اس وقت بھی رائج تھا

کہ دستا ہے کالا سو کچھ دال میں   جو ہے دُبا ہوں ‡ نار اپن حال میں

بعض بعض شعر بہت صاف نکل گئے ہیں - مثلاً

ہر ایک دل میں تس عشق تے راز ہے   ایکن دل منے سوز ایکن ساز ہے

یقیں ہے پیو بن جیا جائے نا   پیا باج امرت پیا جائے نا

یہہ شعر سلطان قلی قطب شاہ کے شعر سے کس قدر ملتا جلتا ہے

پیا باج پیالا پیا جائے نا   پیا باج یکتل جیا جائے نا

ہر باب کے ابتدا میں اکثر یا تو راوی کی طرف سے قصے کا بیان شروع

---

* کہا   + بار   ‡ گھبرائی ہوئی

ہوتا ہے یا کسی قدرتی منظر کے بیان سے آغاز کیا جاتا ہے۔ مثلاً

صبحدم چلی باؤ کر نو بہار　　کھلے پھول بن بن ہوئے لالہ زار
چلیا صید گہ سیر کرتا وو راج　　ہوا یوں کہ یک پنت سیانے دو کاج

یا

کھنہار قصہ ہلدی یک پر یک　　شمع اور پتنگ کے درد کا شریک

سید احمد ہنر

سید احمد تخلص ہنر ملا مشرقی کے فرزند ہیں۔ ان کی تصنیف سے دو کتابیں ہیں ایک نیہ درپن اور دوسری اوتار بن۔ ان کے بھتیجے علی نے اپنی کتاب "گلشن احسان" میں جہاں اپنے خاندان کا ذکر کیا ہے اور جس کے کچھ اشعار اوپر نقل ہوچکے ہیں، وہاں ہنر کا بھی ذکر یوں کرتا ہے —

سپوت اس پدر * کا تھا بس نامدار　　سو تھا سید احمد فضائل مدار
بہ جاگیر و ہم با خطاب گزیں　　مخاطب تھا با احترام متیں
قدم بر قدم بل پدر سوں زیادہ　　تصانیف اس سوں بھی ہے بہت یاد

... ...

... ...

کہ ہے نیہ درپن و اوتار بن　　دو قصے ہیں دکھنی ہنر دو سخن
سخن کے ہنر کا تھا صاحب اثر　　تخلص و عالی منش کا ہنر
جہاں میں رہا اُن ستی یادگار　　سراسر جہان گرچہ ہے بے مدار

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنر بھی صاحب جاہ و منصب تھا۔ اس کی مثنوی نیہ درپن میرے مطالعہ میں آئی ہے۔ قصہ اسی قسم کا ہے جیسے

---

* یعنی مشرقی کا

ہمارے ہاں کے پرانے قصے ہوتے ہیں - راج پتی اودھ کا راجا تھا - اس کے کوئی بیٹا نہ تھا - رات دن اسی فکر میں گھلا جاتا تھا - ایک فقیر کی دعا سے بیٹا پیدا ہوا ، نام اس کا کام‌روپ رکھا بڑا ہوا تو خواب میں شہر سنگلدیپ دیکھا - راجا وہاں کا چھتر پتی اور بیٹی کا نام کاملتا - یہیں سے عشق کی چنگاری اٹھی اور قصے کی ساری روئیداد اسی میں ختم ہوگئی - یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے - چنانچہ سبب تالیف کے تحت میں وہ خود اس کا ذکر کرتا ہے —

بہت سے یار دوست جمع تھے اور طرح طرح کی نکتہ سنجیاں اور گل فشانیاں کر رہے تھے

تھا اس مجمع میں ایک شخص نادر سخن کے رمز کا تھا خوب ماہر
سخن کے بحر کا تھا آشنا خوب انھا بھی آشنائی بیچ مرغوب
ایکر آیا کتاب یک آپنے سات سراسر اُس منے تھی عشق کی بات
عبارت نثر اس کی فارسی تھی پرت سنھر سدھن کی آرسی تھی

اور کہا کہ تم سے کوئی دکھنی میں اس کا ترجمہ کرے - سب نے میرے طرف اشارہ کیا کہ اس سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا - غرض سب نے مجھے مجبور کیا اور میرے دل میں بھی ایسا جوش پیدا ہوا کہ میں نے اسے نظم کر ڈالا

یو قصے کو کیا میں ترجماں خوب لگیا ہر ایک کی خاطر میں مرغوب

یہ قصہ ہنر نے ابن نشاطی کے پھولبن کے جواب میں لکھا ہے - چنانچہ کتاب کے خاتمے کے اشعار میں لکھتا ہے —

بنایا پھول بن ابن نشاطی متھی باس اس کی سب کے تیں خوش آتی
جواب اس کا جو یو ہے نہہ درپن ہے سچ وہ عشق کی انکھیاں کا انجن

اسے اُس تے اگر نا پاے بہتر	برابر تو یقیں جانے نہ کمتر

اس کتاب کے لکھتے وقت ابن نشاطی کا خیال پیش نظر رہا ہے چنانچہ دیباچہ میں بھی کتاب کا نام بتاتے وقت پھولبن کا ذکر کیا ہے

لکھیا میں مختصر کر یو حکایت	جو تھی اتی * کچھہ دراز اس کی روایت
اگر کر اس منے فن شاعری کا	ہنر اس میں دکھاتا ماہری کا
تو ہوتی بہوت یعنی یو حکایت	پڑھنہارے کوں بھی اس تے ملالت
مجھے ابن نشاطی کا سخن خوب	لگیا دل میں بہت محبوب و مرغوب
کتاب اس کی جو ہے نام اس کا پھلبن	نزاکت کی ہے در گلبن کا گلشن
رو گلشن رکھیا وو ناؤں پھلبن	رکھیا میں ناؤں اس کا نیہ درپن

غوث الاعظم کی سلطنت میں پھر اس خیال کا اعادہ کیا ہے —

یہ کتاب سنہ ۱۱۴۳ ھ میں تمام ہوئی - خاتمے پر شاعر نے خود سنہ بتا دیا ہے —

ہوا تیار جس دیساں † میں پھول بن	مصنف تس لکھیا ہجرت کے یوں سن
سن ہجری لے آیا جب یو رکھہ بار	اگیارا سو کوں کم تھے بیس پر چار
سنڈیا سج نیہ درپن لے یو جھلکار	اگیا رہ سو پو تھے چالیس پر چار
محبت کی جو ہے عارس ‡ سلگھن	اوسے ہے رونما یو نیہ درپن
ہوا جب کامل اوس کا نظم ہر حال	زمانے نے کیا سج بہوت خوش حال
کہیا تاریخ یوں رخ ملہج رخی کا	یو نو تحفہ مبارک لے‡‡ ہنر کا

آخری مصرع سے پوری تاریخ نکلتی ہے —

شاعر نے ابن نشاطی سے مقابلے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کا دعویٰ کچھہ بیجا نہیں ہے ۔ اس کی مثنوی کسی طرح ابن نشاطی کی پھولبن سے

---

* بہت	† دنوں	‡ عروس	‡‡ بہت

کم نہیں ھے - روانی اور فصاحت کے ساتھ حسن تخیل بھی موجود ھے - ابن نشاطی کو تقدم کی فضیلت حاصل ھے لیکن شاعر کی حیثیت سے ھنر اس سے کم نہیں ھے - اس کے بھتیجے علی نے سچ کہا ھے " قدم بر قدم بل پدر لے زیادہ " - اور پھولبن کے بعد فیہ درپن کو پڑھ کر ھمیں بھی ھنر کا ھم نوا ہونا پڑتا ھے —

اُسے اُس تے اگر نا پاے بہتر
برابر تو یقیں جانے نہ کمتر

اب میں اس مثنوی سے بعض مقامات نقل کرتاھوں ' ان سے اس کی شاعری کا خاصا اندازہ ھوجاے گا —

حمد

الہی یا الہی یا الہی — تجھے ساجے حکمت کی بادشاهی
تکبر اور منم ھے تجھہ سزاوار — کہ نہیں کوئی دوسرا تج سار کرتار
دکھانے جب منگے قدرت کا تو بل — کرے بھیں کھن پوکھن کو بھیں کرے تل
نمونہ تج سخاوت کا ھے کر کر — کرے بھاں کوں سورج ھر روز پر زر
روپا چلنے کا چندر ھر رین کال — ستے بھیں پر سدا جیوں دودھ بھر تھال
جہنم تجھہ غضب کا یاد کر کر — لرزتا ھے سدا سورج گگن پر
گرم بارا ترے کر قہر کا یاد — جوخ میں ھے فلک جیسا گرد باد
جو بھید یا بس تیری ھیبت کا اُس انگ — ھر یا ھے تن فلک کا پاچ کا رنگ
تری صنعت کرا نقاش اپروپ — چتار یا باغ میں کے نقش مرغوب
رنگ آموزی کیا صفحۂ چمن کا — کہ جیسا کام ھو نازک قلم کا
لکھیا یوں موج کی بھنکراج جل پر — کہ جیوں درپن اُپر نکلے ھیں جوھر
دکھایا سنبلاں کوں گل سوں مل کر — کہ جیوں لیپا ددھواں انگار اوپر

کلیاں آدھی کھلیاں ہر پھول بن کے — ادھر* ہیں مسکتے† میں جیوں سجن‡ کے
چمن رنگین پھولاں سوں یو سہاے — چکن کی سوزنی جیوں چن بچھاے

آخری شعر میں تشبیہ خوب ہے —

نعت

ادک میں نعت حضرت مصطفیٰ کی — محمد سرور دیں مجتبیٰ کی
سہاے سیس§ پر اُس تاج اولاک — تخت سو لا مکاں کرسی ہے افلاک
کرن کی ہات لے سولے کوں خوبی — کرے تج در کی سورج خاکروبی
ہوکر فراش تجہ مندھر کے اندر — بچھاوے چاندنی چندنے کی چادر

منقبت حضرت علی

خدا کا فضل جب ہوتا ہے رہبر — تو ہوتا خشک گلشن عقل کا تر
مکدر صاف ہوتا دل کا درپن — غبار اُٹھ، خوف کا ہوتا ہے روشن

... ...

محمد لفظا علی معنی ہے کامل — محمد شہر علی ہے باب حاصل
نہیں اخت جگر احمد سوں نیارا — ہے جوڑا فاطمہ کا حق کا پیارا
کرے ہر روز سورج آسماں سوں — کہ دیوے بوسہ تس کے آستاں کوں

مدح حضرت عبدالقادر جیلانی

عجیب بات ہے کہ اصحاب رسول اللہ کی منقبت تو نہیں مگر غوث الاعظم کی مدح موجود ہے

محی الدین ہے د و غوث الاعظم — سورج جس نور انگے ذرے سوں ہے کم
جگت کے ہیں جتے صاحب ولایت — شرف رکھتی ہے جن سبتی کرامت

---

* ہونٹ   † مسکراہٹ   ‡ معشوق   § سر

نرنجن کے وہ سب عاشق کو آے * معنی الدین معشوقی کوں پاے

... ...

یہ تحفے کوں سوجھ کر میں سزاوار لے آیا نذر شاہنشہ کے دربار

بنایا ابن نشاطی وو سخنور کتابا یک قطب شہ کے ناؤں اوپر

ہنر نے یاد رکھ اس نظم کا ڈھانو بنایا ہے نامہ ایسے قطب کے ناؤں

سوان سوں قطب ولے جس در اوپر کھڑے چاکراں سیتی ہیں کمتر

ایک اعتراض کا جواب

رکھیں گے کوئی مجھ پر بول گیانی کہ ہے اس بیچ ہندو کی کہانی

مسلماں کوں کہنا ہندو کی کانی نہیں کس باب اگتی ہے سہانی

میرا مطلب ہے کرنا عشق کا بیان کفر ہور دین سوں ہے عشق آزاد

خلاصہ ہے جے کچھ سو عشق ہے عشق ہے عشاقاں کنے † سو عشق ہے عشق

مسلماں ہووے کوئی یا ہووے کافر ہے بہتر وو کرے جو عشق ظاہر

شکر ہے حق کا جب تے میں ہوا ہوں سدا جیو عشق کے میانے دیا ہوں

کرم حق کا کیا جب دستگیری ہوئی تب آرزو مجھ دل کی پوری

یو قصے کوں کیا مہلت سے آخر کیا مرتی گپت ‡ سہدر کے ظاہر

فراق کی کیفیت

خدا کے ناؤں یک نس خواب میں آ تو جان رہتی سو وو جاگے کوں بتلا

اگر ہووے گھر کے پردے سات اندر سورج کی جوت تیوں باہر کروں سر

فرشتے کے نمی § ہو اس سیتی پار ملوں آکر تجے اے دل کے دلدار

---

* کھلاے † نزدیک ‡ پوشیدہ § مانند

اگر ہووے تجہ رہنے کا ہوس تلے گور   ہووا * کر نیر کا دوچک † سوں ‡ سرور
زمیں کوں نرم کر پلکاں ستی چیر   دہسوں پا تال کے بہتول جوں نیر

باغ کا بیان (خوب لکھا ہے)

اتہے کچ جہاڑ مل کر تال سوں تاں   پلے تہیں جیوں ہرے ریشم کرا جال
پلکاں بیٹہے سو مل دستے اتہے یوں   تہ اس جالے منے منپڑے § اٹہیں جیوں $
گل لالے پو شبنم آ ے پر ہوس   مگر کیا حق نے قدرت کا مہوس
رکہیا پارے نے تہیں انگار اوپر   کرن اکسیر ہور اکسیر سوں زر
دسیں مد برگ کے تختے ہر یکتار   ہوا ہے اس عمل کا سچ یو بہنکار
ہر یالی ہلوں ... یوں لہلہائے   ہریا جیوں تا فتا ون کر بچھائے
لگا لگ لگ یوں لہاراں ¶ سوں نوی یوں   دہ کا ریگر ... ا نو کرا جیوں
دسے نیر اس اُوپر بہتا سو اس دہات   کہ جیوں بسہاں کرے روپے کے سلکات
اگے سو پہول ہر ایک جہاڑاں کے ڈالاں   دسیں جیوں دان میں دانے کے ہاتاں
نرمل جل کے دسیں چشمے ہر یکتار   نین ہرنیاں کے نرمل ہور صفا دار
دسے لالے کا سایہ جل میں ہر تہار   کہ جیوں لالے دیں پانی بیچ انگار

رات

دیہا جب سور کا مغرب منے جہاز **   رین کا بادباں کہل کر ہوا واز ††
رین سوں کوں ہوا ظلمت کا سمور   ہوا چاند اس سمد میں ساہتی نور
ستارے کوں اُپر دستے اتہے یوں   ہیں اُس مچھلی کے کہولے ‡‡ نیر پر جیوں

---

* جہاڑ و دیکر ، صاف کر کے   † آنکوہ   ‡ تالاب   § پھلسے
$ جمع بعلی جی کی جمع   ¶ لہروں   ** جہاز   †† کشادہ
‡‡ فلس —

لڑائی کا بیاں

دلیراں نے صفاں آراستہ کر دئے تھے مردمی کی داد یک سر
پڑے ہر تی اُپر واراں ستی غار ابدل پانی کے نکلا لہو کا انگار
لگا چھاتی سے چھاتی ہو کو کلجوڑ ستی سر ہور سینا ہور ہات پگ توڑ
کرے گرزاں کی ایسی دھات سوں مار پڑے تھے دھرت * کوں پاتال لگ غار
و ہاں پڑے ہو اس میں پامال پڑے جیوں میں † بہیں اُپراں ‡ بے حال
کریا یوں پھوڑ ہر یک ہاتھ کا تیر کہ چوریا ہات ہر ایکس کا زہ گیر
دھنک جب کھینچتا ہر ایک کماں دار چلا کہتا زہ ہاز اس کوں ہر بار
دسے یوں پاکھراں سوں ہستی § کا ڈھل کہ جیسا ابر بھر بادل دیا چل
اڈئے زخموں کا عکس اس میں رکت $ سوں دکھایا جیوں شفق یا دل ملنے موں

آم کا درخت

اتھا اس گلبدن رہنے کری تہار اچھا آنب کا جہاڑ ایک پھلدار
ہریا جیوں پاچ کا گنبد مکال تس اوپر زر کی قندیلاں پکے پھل
تلے بارے سوں جب دستہ تھا اس دھات ¶ کہ حالت بیچ ہے زاہد ہلا ہات
ہرے پاتاں کے سبز اس گل میں پھرں ** پھلاں سو کہربا کی ہس میں سمرن

بعض بعض تشبیہیں خوب لکھی ہیں مثلاً

وہ نازک پگ ہوے لگ کر جھرالے †† کہ جیسے پاؤں لگ کر پھول پھالے

یا

چلے ہر ایک اپنی بات لیکر نہ دیکھے دیر بھتے ناد ‡‡ پھر کر

---

* زمیں † مچھلی ‡ اوپر § ہاتھی $ خون
¶ طرم ** پھرتی †† خراش ‡‡ مانند مثل

یعنی ہر ایک اپنے اپنے رستہ چلا گیا اور بہتے پانی کی طرح کسی نے پھر کے نہ دیکھا —

کتاب کے ہر باب کے شروع میں بطور عنواں کے ایک شعر بالالتزام آتا ہے اور عنوانوں کے یہ تمام شعر ایک ہی بحر میں اور ایک ہی قافئے کے ہیں اگر ان سب کو جمع کرلیا جاے تو قصے کا خلاصہ نکل آتا ہے - کتاب کا ابتدائی شعر یہ ہے —

ثنا ہے حق تعالیٰ کا و و ہے سب علم کا گیانی
یکانگ ہے دور ترکن ہے دو جا نہیں کوئی اسے ثانی

ولی

یہ سید احمد منور کے بھتیجے اور سید محمد عشرتی کے پوتے ہیں احسان تخلص ہے لیکن ولی بھی تخلص کے طور پر جابجا لکھا ہے - اس نے قصہ حاتم طائی کو نظم کیا ہے - یہ مثنوی ضخیم ہے - قصۂ حاتم طائی کے منظوم ترجمے کئی ہیں - ان میں سبحان کا زیادہ مشہور ہے - فائق نے بھی نظم کیا ہے لیکن اس کی زبان دکھنی نہیں ہے - دیباچے میں اپنے دادا اور چچا کا حال لکھا ہے جسے میں پہلے نقل کر چکا ہوں شاعری میں اس کا رتبہ دادا اور چچا سے کم ہے - مثنوی اوسط درجے کی ہے کوی خاص بات نہیں ہے - وجہ تالیف میں خود ہی لکھا ہے کہ فارسی کا ترجمہ ہے - کتاب کا نام اور سنہ تالیف بھی خود ہی لکھہ دیا ہے —

گلستاں ہو احساں کا ہے کر تمام رکھا گلشن احساں میں اس کا نام
ہوا گلشن احساں جو بار ور تمامی کا لایا جو تازہ ثمر
بندھا آب سال اس کو یوں باغباں یہ تحفہ علی کا اچھے دوستاں

آخری مصرع سے سنہ ۱۱۶۹ ھ نکلتا ہے —

ابتدا حمد سے اس طرح کی ہے —

کرے کیا کوئی اوس کی حمد و سپاس کہ ہے ذات یکتا وہی بے قیاس
ہوا تھا جو اوس کو تماشے کا ذوق سو ایک آن میں اون کیا تحت و فوق
چمکنے لگے نور تو شمس و قمر ستارے جدا ہر ‌ئی جلوہ گر
بنے عرش و کرسی و لوح و قلم دلک شوئیا وس کے سجدے میں خم
ملائک جدا ہو گئے جا بجا یک ایک کو دہ رتا افتدای
لگے مشورہ کرنے غلمان و حور کہ دوزخ بہشت اور وحش و طیور

خاتمہ

ہے شکر الہی ہزاروں ہزار جو دیوے ہے امید کے رکھہ کو بار
علی کہہ تجھے اتنی قدرت کہاں میں شکر حق کا کرے توں بیاں
سو لکھہ میں شکستہ کتی بات کوں برابر یا ہوں حکایات کوں
ردیف اور نہیں قافیہ سے خبر نہ کچھہ شعر کے فن میں ہوں معتبر
متاع اپنی گر میں سمجھتا انوپ چترک بیندپتا اوس کوخوش تھ نپ تھو اپ
و لیکن یہ گوہر نہ معنی سوا صدف سے میرے دل کے باہر ہوا
بصارت ہو جس کو نو انصاف سے چونے پرت کو گوہر صاف سے
پڑے جس نظر میں یہ قصہ سندر دعا سے میرا نام لے لب اوپر
خدا یا مرے دین و دنیا کے کام تو کر ختم بالخیر جو ہیں تمام
بحق محمد و آل عظیم کنہ بخش میرا غفورالرحیم
ہے ساقی شراب اب جو کچھہ نیں خیال جہاں ہے کدورت سراسر ملال
کروں میں نہ دوناں کی منت کشی ہو کوثر کے ساقی کا میں ملتی

ہر باب کا عنوان ایک شعر ہے اور عنوانوں کے تمام شعر ایک ہی

بحر اور قافیے میں ہیں۔ مثلاً

یہ ہیگا التجا بندے کا درگہہ میں اپس خالق کی زاری سوں
شعر ایسے کہیں مطالب کے کریں شعریں نور دے کر

آخری باب کے عنوان کا شعر یہ ہے —

بجا لا تا شکر حق کا اپس خالق کی درگہہ میں
ہوا یو فضل کے بادل سوں گلشن تازہ تر بہتر

ہر باب کے آخر میں دو شعر ساقی نامے کے ہیں جیسے —

دے ساقی مجھے مے کہ تا خوبرو لگے خوب جب اگ رہے روبرو
بغیر مے نہ خوش آے دلبر کسے بجز دلربا مے نہ خوشتر دسے

اور ہر باب کی ابتدا صبح یا شام وغیرہ کے منظر سے ہوتی ہے مگر صرف ایک یا دو شعر ہوتے ہیں جیسے —

ستاروں کے تجار کو شب مرید صبح ہوتے ہوتے کیا جیوں شہید

یا

صبح کہ مسافر نکل شرق کا چلا غرب کو جلد ہو برق سا
